

زکوٰۃ کے اہم اور جدید مسائل

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور

ناشر

الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور



نام کتاب : زکوۃ کے اہم اور جدید مسائل

مؤلف : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

صفحات : ۳۱۳

تاریخ طباعت : شوال المکرم ۱۴۴۲ھ - جون ۲۰۲۱ء

ناشر : الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

موبائل نمبر : 05080062333 / 08050062000 / 080-25364530

ای۔میل : Email:Jimu1404@gmail.com, Website: Jimu.edu.in

الفہرس

بحث ہفتم
زکات کیسے اور کتنی نکالنی ہے؟





مُقَدِّمَہ

الحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِيْنَ، وَالصَّلاةُ والسَّلامُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ الصّادِقِ الأمِيْنِ، و عَلٰى آلِهٖ وَ صَحْبِهٖ أجْمَعِيْنَ وَعَلٰى مَنْ تَبِعَهُمْ بِإحْسَانٍ فِيْ كُلِّ زَمَانٍ وَ مَكَانٍ إلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ : أمّا بعد :

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اپنے پیغمبروں کے ذریعے اس پر اپنے احکام وفرامین نازل فرمائے، ان احکام وفرامین میں سے بعض کا تعلق عقائد وایمانیات سے ہے، تو بعض کا اعمال وعبادات سے ہے، بعض معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، تو بعض اخلاقی اقدار سے متعلق ہیں، ان میں وہ بھی ہیں، جو تجارت اور معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، تو کچھ وہ بھی ہیں، جو سیاست مدنیہ اور ملکی قوانین سے وابستہ ہیں۔ اور ان تمام قسم کے احکامات وفرامین میں انسان کی خیر وبھلائی پوشیدہ اور اس کی صلاح وفلاح مضمر ہے۔

عبادات میں بنیادی طور پر: صلاۃ، زکات، صوم و حج داخل ہیں اور ان کو اسلامی احکامات میں انتہائی اہمیت وتفوق حاصل ہے اور اسی لیے ان کے مسائل اور جزوی تفصیلات بھی دوسری انواع کے مقابلے میں زیادہ واضح اور کثرت کے ساتھ بیان کیے

گئے ہیں؛ کیوں کہ عبادات کا معاملہ دوسرے ابواب کی بہ نسبت زیادہ اہم اور بڑا نازک ہوتا ہے۔

اور اسی کے پیش نظر حضرات علما وفقہا نے بھی اپنی کتابوں میں ان چار ابواب پر بڑی تفصیل و وضاحت سے روشنی ڈالی ہے اور ان کی جزئیات میں سے ایک ایک بات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ نیز اسی اہمیت کے پیش نظر ہر دور میں ان عبادات کی جانب امت کو توجہ دلانے اور ان کی نزاکتوں سے واقف کرانے کی خاطر علماء امت نے چھوٹی بڑی کتابوں اور مختلف انداز کے رسائل لکھے ہیں۔

نماز کے بعد ان عبادات میں سے سب سے اہم عبادت ''زکات'' کی ہے اور قرآن کریم میں بیاسی جگہ نماز کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے اور اس عبادت میں جہاں حق اللہ کا پہلو موجود ہے، وہیں حق العباد کا پہلو بھی واضح ہے کہ غرباء و مساکین، حاجت مندوں اور محتاجوں کی حاجت براری، ان کی خدمت اور ان کے ساتھ مواسات و ہمدردی بھی اس میں مضمر ہے۔

اس اہم ترین عبادت کے مسائل واحکام بھی اہم ترین ہیں؛ لہذا اس پر بھی علماء کرام مختلف انداز اور متعدد اسلوب میں ہر دور میں بحث کرتے آئے ہیں، تا کہ امت برابر ان کی جانب متوجہ رہے اور کہیں ان سے غفلت و لا پرواہی کا شکار نہ ہو جائے، بالخصوص اس لحاظ سے کہ حالات میں روز روز تغیرات ہوتے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے مختلف قسم کے نئے نئے سوالات لوگوں کے سامنے اٹھتے رہتے ہیں اور علماء کو دعوت فکر دیتے ہیں، اس پر علماء کا کام کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

زیر نظر رسالہ بھی انہی احوال وظروف کا مرہون منت ہے، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اس کارخانے کو مختلف قسم کے تغیرات وتبدلات سے احاطہ کر رکھا ہے اور یہاں یہ سلسلہ برابر جاری وساری ہے اور اس کے نتیجے میں نئے نئے مسائل بھی

پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ تغیرات اگر چہ ہر دور میں ہوتے چلے آئے ہیں؛ لیکن موجودہ دور اس حوالے سے سب سے زیادہ ممتاز نظر آتا ہے؛ اس لیے اس دور میں نئے مسائل اور جدید ابحاث کا سلسلہ بھی ایک غیر مختتم سلسلہ معلوم ہوتا ہے۔

اس صورت حال نے جہاں بہت سے دینی شعبوں میں نئے نئے سوالات پیدا کر دئے ہیں، وہیں زکات کے باب میں بھی بہت سے جدید مسائل کو جنم دیا ہے، جس کی وجہ سے موجودہ دور کے فقہاء وعلماء کو ان مسائل سے متعلق غور وخوض اور ایک محدود درجے کے اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے؛ کیوں کہ جیسا کہ کہا گیا ہے: "النصوص معدودة والحوادث ممدودة" (نصوص تو گنے چنے ہیں اور پیش آنے والے مسائل بے شمار ہیں)(۱)

چناں چہ بہت سے حضرات علماء وفقہاء نے ان مسائل کے بارے میں قرآن و سنت اور اجماع و قیاس کے پیمانوں کو سامنے رکھ کر ان نئے مسائل کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کو اپنی ابحاث اور کتابوں میں جمع کیا ہے۔

احقر نے اس کتاب "زکات کے اہم اور جدید مسائل" میں زکات سے متعلق اہم اور ضروری مسائل کے ساتھ کوشش کی ہے کہ نئے احوال وظروف کی وجہ سے پیدا ہو جانے والے جدید مسائل کو بھی اس میں دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے اور اس کے لیے میں نے قدیم فقہاء کے کلام کے ساتھ معاصر فقہاء کی ابحاث سے بھی بھرپور استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے؛ لہٰذا ان کو بغور وخوض پڑھنے، ان کے دلائل پر نظر کرنے، پھر ان کے نتائج بحث کو سمیٹنے اور ان کی تلخیص کرنے کی بھرپور جد وجہد کی ہے، نیز جہاں ان میں اختلاف دیکھا، تو دو صورتوں کو اختیار کیا ہے: ایک اس پہلو کو جو احوط ہو یا اس کو جو اوسع ہو، جہاں احتیاطی پہلو مناسب تھا وہاں احوط کو اختیار کیا ہے اور جہاں دیکھا کہ لوگوں پر تنگی ہو رہی ہے، تو اوسع کو لے لیا ہے۔

---

(۱) المبسوط :۱۶/۱۲۰، المحیط البرهاني: ۸/۲۰۱، درر الحكام شرح مجلة الأحكام: ۴/۵۲۶

قدیم مسائل میں تو اسی کی کوشش رہی ہے کہ فقہائے حنفیہ کے مسلک کے مطابق مسائل بیان کیے جائیں، اس وجہ سے نہیں کہ میں اس میں کوئی تعصب برتنا چاہتا ہوں؛ بل کہ اس وجہ سے کہ برصغیر ہند و پاک کا جم غفیر اسی مسلک کا حامل ہے اور وہ اسی کو معلوم کرنا چاہتا ہے؛ تا کہ اپنے مسلک پر اطمینان سے عمل کر سکے۔ پھر میں دوسرے مسالک بیان کرتا تو بات لمبی ہو جاتی اور کتاب کا حجم بھی کافی بڑھ جاتا، جس کی فی الحال گنجائش معلوم نہیں ہوئی۔ باقی رہے دیگر ائمہ کے مسالک تو ہم ان کو بھی اسی طرح قابل احترام و لائق تعظیم سمجھتے ہیں جیسے مسلک احناف کو، کیوں کہ تمام مسالک و مذاہب ائمہ اپنے اپنے لحاظ سے قرآن و سنت کے دلائل سے مدلل اور اجماع و قیاس کی روشنی سے مؤید ہیں۔

ہاں! جو جدید مسائل و ابحاث ہیں، ان میں بھی حتی الامکان اسی کو پیش نظر رکھا ہے کہ علمائے حنفیہ کے اصول سے باہر نہ ہوا جائے؛ لیکن بعض جگہ ضرورت کی وجہ سے اس میں توسع کو پیش نظر رکھا گیا ہے؛ تا کہ امت کسی تنگی میں مبتلا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ جدید مسائل میں معاصرین کی آراء مختلف ہو سکتی ہیں، اس وجہ سے اگر دلائل کی بنیاد پر اختلاف رائے سامنے آئے، تو اس میں وسعت قلبی سے کام لینا چاہیے، نہ کہ تنگ دلی سے اور پھر اس سے اختلاف بھی کیا جائے، تو سنجیدہ اختلاف دلائل کے ساتھ کرنا چاہیے، احقر نے اسی اصول و طریق کو اس کتاب میں ملحوظ خاطر رکھا ہے اور بعض جگہ کسی رائے سے اختلاف کیا ہے، تو ادب و احترام اور اعتدال و توسط کا دامن کہیں چھوٹنے نہیں دیا ہے۔

اسی طرح اس رسالے کے جدید موضوعات و ابحاث کے بارے میں ہو سکتا ہے کہ دیگر علماء کو احقر کی کسی رائے سے اختلاف ہو؛ لہذا ایسے حضرات سے میری گزارش ہے کہ وہ ضرور دلائل کے ساتھ متنبہ فرما دیں؛ تا کہ غور کیا جا سکے اور ضرورت پر اصلاح بھی کی جا سکے۔

مُقَدِّمَہ

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں شکریہ ادا نہ کروں میرے ان محسنین کا جنھوں نے اس کتاب کے نوک و پلک سنوارنے میں میرا بھرپور تعاون کیا اور اس کی تصحیح و نظرِ ثانی میں اور حوالوں کی تحقیق میں اور حدیثی و فقہی نصوص کی اصل کتابوں سے مراجعت میں دل جمعی و بشاشت کے ساتھ اپنا خاصا وقت صرف کیا اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ قارئین کے روبرو پیش کی جا سکے، میری مراد اس سے ہمارے جامعہ مسیح العلوم کے مؤقر اساتذہ مولانا محمد نور اللہ صاحب قاسمی، مولانا مفتی آفتاب عالم صاحب ندوی، مولانا مفتی مرشد صاحب قاسمی اور مولانا سید خالد صاحب قاسمی –حَفِظَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی– ہیں۔ اللہ تعالی سے میں بصدق دل التجا کرتا ہوں کہ ان سب کو اپنے شایانِ شان جزا عطا فرمائے۔

اسی طرح عزیز گرامی مولانا مامون رشید صاحب بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے حسب سابق میری دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب کی بھی کمپوزنگ اور اس کی سیٹنگ و تزئین کاری میں پوری دل چسپی دکھائی اور اس کو نہایت عمدہ طریقے سے مرتب کر کے لائق اشاعت بنایا۔ اللہ تعالی ان کو بھی جزائے خیر سے نوازے۔

اخیر میں اللہ کریم سے بہ تضرع دعا کرتا ہوں کہ وہ اس رسالے کو اپنی جناب میں شرفِ قبولیت سے نوازیں اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت اور لوگوں کے لیے مشعل راہ بنائیں۔ آمین یارب العالمین۔

۵/ ذی الحجہ/ ۱۴۴۱ھ
۲۷/ جولائی/ ۲۰۲۰ء
بروز پیر

فقط
محمد شعیب اللہ خان
(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

بحث اول

زکات کی فرضیت، اہمیت، فوائد و برکات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بحث اول
زکات کی فرضیت، اہمیت، فوائد و برکات

اس کتاب میں ہمیں چند قسم کے مسائل کی ضرورت ہوگی، جن پر بحث کی جائے گی:

۱ - ایک تو یہ کہ زکات کن لوگوں پر فرض ہے؟
۲ - دوسرے یہ کہ زکات کن کن مالوں میں فرض ہے؟
۳ - تیسرے یہ کہ زکات کا نصاب کیا ہے؟
۴ - چوتھے یہ کہ زکات کے فرض ہونے کی شرطیں کیا ہیں؟
۵ - پانچویں یہ کہ زکات میں کتنا مال نکالنا پڑتا ہے؟
۶ - چھٹے یہ کہ زکات کن لوگوں کو دی جاسکتی ہے اور کن لوگوں کو زکات نہیں دی جاسکتی؟

زکات کے مسائل میں یہ چند پہلو ہیں، جن پر اس کتاب میں بحث کی جائے گی اور ہر بحث میں جدید قسم کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی جائے گی؛ لیکن مسائل زکات پر گفتگو سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اختصار سے زکات کی فرضیت و اہمیت اور اس کی مشروعیت کی حکمت و مصلحت اور اس کے فوائد و برکات پر روشنی ڈال دی جائے۔

زکات کی فرضیت واہمیت

زکات اسلام کا ایک بنیادی اور اساسی رکن اور اہم ترین فریضہ ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں اکثر مواقع پر نماز کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں اس کی فرضیت کا اعلان بار بار کیا گیا ہے، جیسے فرمایا ہے:

﴿اَقِيمُوا الصَّلاةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ﴾ (البَقَرَة: ۴۳)

(نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو)

اور قرآن کریم ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زکات کا یہ فریضہ صرف اسلام میں ہی نہیں؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں کی شریعتوں میں رہا ہے اور ان سب کو بھی اور ان کی امتوں کو بھی اس کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے متعدد انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ

﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِيْنَ﴾ (الأنبياء: ۷۳)

(یعنی ہم نے ان انبیاء پر وحی کی تھی کہ وہ نیک کام کیا کریں، نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں اور یہ لوگ ہمارے عبادت گزار بندے تھے۔)

اور حضرت عیسیٰ۔ علیہ السلام۔ کے تذکرے میں خود انہی کی زبانی یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں کہ

﴿وَأَوْصَانِيْ بِالصَّلاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا﴾

(مريم: ۳۱)

(مجھے اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکات کا حکم دیا جب تک کہ میں زندہ رہوں۔)

اور حضرت اسماعیل - علیہ السلام - کے تذکرے میں آیا ہے کہ

﴿وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ﴾
(مريم:٥٥)

(وہ اپنے اہل خانہ کو نماز کا اور زکات کا حکم دیتے تھے اور اپنے رب کے نزدیک وہ پسندیدہ تھے۔)

اسی طرح بنی اسرائیل سے لیے گئے میثاق کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ان سے ایک عہد یہ بھی لیا گیا تھا کہ

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ﴾ (البقرة:٨٣)

(اور نماز کو قائم کریں اور زکات دیا کریں۔)

معلوم ہوا کہ نماز کی طرح زکات کا حکم بھی پہلے انبیاء کی شریعتوں میں مشروع رہا ہے۔ یہ خود ایک بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ کے نزدیک زکات کس قدر اہم ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر - رضی اللہ عنہما - سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم - نے فرمایا کہ

«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ : شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ ، وَإِقامِ الصَّلاةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ ، وَ الْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ .»

(یعنی دین اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اول توحید ورسالت کی گواہی دینا، دوسرے نماز قائم کرنا، تیسرے زکات دینا، چوتھے حج کرنا، اور پانچویں رمضان کے روزے رکھنا۔)(١)

(١) البخاري:الإيمان/باب دعاؤكم إيمانكم ، ح:٨، مسلم : الإيمان/ باب بيان أركان الإسلام ، ح :١٦

نیز حضرت عبداللہ بن عباس –رضی اللہ عنہ– سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول –صلی اللہ علیہ وسلم– نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی وحاکم بنا کر بھیجا اور ان سے فرمایا کہ یمن والوں کو پہلے اس بات کی دعوت دو کہ وہ اللہ کی وحدانیت اور میری رسالت کی گواہی دیں، اگر وہ اس کو مان لیں، تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر پانچ نمازیں ہر دن اور رات میں فرض کی ہیں، اور اگر وہ اس کو بھی مان لیں، تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے مالوں میں زکات فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء میں تقسیم کی جائے گی۔"(۱)

زکات نہ دینے والوں پر وعید

جب زکات کا حکم اس قدر تاکیدی ہے، تو زکات کی ادئیگی میں کوتاہی کرنا ایک بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے اور زکات کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے والوں کے خلاف سخت وعیدیں آئی ہیں۔

قرآن پاک میں سورہ توبہ میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾ (التوبۃ ۳۴–۳۵)

(جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور پھر اس میں سے اللہ کے راستے میں کچھ خرچ نہیں کرتے، انھیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے، جو اس دن ہوگا، جب ان کے مالوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور پھر ان کی پیشانیوں کو اور ان کے پہلوؤں کو اور پشتوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ مال جس کو تم جمع کرتے تھے، اب اس کا مزا چکھو۔)

---

(۱) البخاري : الزكاة/ باب وجوب الزكاة ، ح :۱۳۹۵. مسلم: الإيمان/ باب الدعاء إلى الشهادتين ، ح :۱۹

ایک حدیث میں اس آیت کی تفسیر یہ بیان کی گئی ہے کہ نبی کریم -ﷺ- نے ارشادفرمایا کہ

''جو شخص سونے اور چاندی کا مالک ہو،مگر وہ اس کا حق (زکات) ادا نہ کرے،تو قیامت کے دن اس کے لیے آگ کی تختیاں بنائی جائیں گی (یعنی وہ سونے اور چاندی کی تختیاں دوزخ میں گرم ہوکر آگ کی تختیاں بن جائیں گی) ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر ان تختیوں سے اس کے پہلوکو، پیشانی کو اور پیٹھ کو داغا جائے گا، پھر جب یہ تختیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی،تو پھر ان کو گرم کیا جائے گا اور پھر اس کو داغ دیا جائے گا اور یہ سب کچھ اس دن ہوگا، جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔پھر لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا، تو کوئی جنت کی طرف اور کوئی جہنم کی طرف جائے گا۔''(۱)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ-ﷺ- نے ارشادفرمایا کہ

''جس شخص کو اللہ تعالی نے مال دیا اور اس نے اس کی زکات نہ دی،تو قیامت کے دن اس کا مال ایک گنجے سانپ کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے گا، جس کی آنکھوں پر دوسیاہ، کالے نقطے ہوں گے، پھر وہ سانپ اس کے گلے میں بطور طوق ڈال دیا جائے گا اور وہ سانپ اس کی دونوں باچھیں پکڑ کر کہے گا کہ میں ہی تیرا مال ہوں، میں ہی تیرا مال ہوں، میں ہی تیرا خزانہ ہوں۔''(۲)

مشروعیت زکات کی حکمت ومصلحت

زکات کی مشروعیت میں بہت سے مصالح وحکم پوشیدہ ہیں،بعض ذاتی وانفرادی ہیں اور بعض اجتماعی وملکی ہیں۔

(۱) مسلم :الزكاة/ باب إثم مانع الزكاة ، ح :۹۸۷

(۲) البخاري: الزكاة /باب إثم مانع الزكاة ، ح:۱۴۰۳

ذاتی وانفرادی مصلحت

جہاں تک ذاتی وانفرادی مصلحت ہے، وہ انسان کے اندر کے جذبۂ حرص وطمع کی اصلاح ہے اوراس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خطرناک روحانی بیماری جس کو بخل وکنجوسی کہا جاتا ہے، اس کا ازالہ ہے۔

مشروعیت زکات کی اس مصلحت کی جانب قرآن کریم کی اس آیت میں واضح اشارہ پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

﴿ خُذۡ مِنۡ أَمۡوَٰلِهِمۡ صَدَقَةٗ تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٞ لَّهُمۡۗ ﴾ (التوبۃ:۱۰۳)

(اے نبی -ﷺ- آپ لوگوں کے مالوں میں سے زکات وصول کریں، جو ان کو پاکیزگی وصفائی دیتا ہے اور آپ ان کے لیے دعا کریں، آپ کی دعا ان کے لیے باعث سکون ہوتی ہے۔)

یہاں آیت کریمہ میں دو لفظ آئے ہیں: ایک تطہیر اور دوسرا تزکیہ، تطہیر یہ ہے کہ صدقے وزکات سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور انسان ان سے پاک ہوجاتا ہے اور تزکیہ یہ ہے کہ انسان کی اصلاح ہوتی ہے؛ لہذا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے صدقہ وصول کریں؛ تاکہ ان کے گناہ معاف ہوں اور ان کی اصلاح ہو۔

یہی تفسیر حضرت سیدنا عبد اللہ بن عباس -رضی اللہ عنہما- سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ

"تطهرهم من الذنوب وتزكيهم : تصلحهم"[1]

اس میں جو تزکیہ کا ذکر ہے، اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ انسان کے اندر کی روحانی بیماریاں جیسے مال کی حرص وہوس اور دنیا کی محبت ولالچ جن کے نتیجے میں انسان میں خود غرضی، قساوت قلبی، اور دیگر ہزاروں بیماریاں جنم لیتی ہیں، وہ صدقے وزکات

(۱) زاد المسیر: ۴۹۶/۳

سے پاک وصاف ہوتی ہیں اور انسان کا دل ان سے خالی ہوجاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ﷺ۔نے اس مصلحت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ

"اعلم أن عمدةَ ما رُوْعِيَ في الزكاة مصلحتان : مصلحةٌ ترجع إلى تهذيب النفس ، وهي :أنها أحْضِرَت الشُّحُ ، والشُّحُ أقبحُ الأخلاق ، ضارٌ بها في المعاد ، ومن كان شحيحاً ؛ فإنه إذا مات بقي قلبُه متعلقاً بالمال ، وعُذِّب بذلک ، ومن تَمَرَّن بالزكاة و أزال الشُّحَّ من نفسه كان ذلک نافعاً له. "(۱)

(جان لیں کہ زکات میں جن مصالح کو ملحوظ رکھا گیا ہے، ان میں دو اہم ہیں: ایک وہ مصلحت ہے، جس کا تعلق تہذیب نفس سے ہے، اور وہ یہ ہے کہ نفس میں حرص تو ہوتی ہی ہے، اور یہ بدترین اخلاق میں سے ہے، جو نفس کے لیے آخرت میں نقصان دہ ہے۔ جو شخص حریص ہوتا ہے، وہ جب مرتا ہے، تو اس کا نفس مال میں ہی اٹکا ہوا ہوتا ہے، اور وہ اسی کے ذریعے عذاب دیا جاتا ہے اور جو زکات دینے کا عادی ہوتا ہے اور اپنے نفس سے حرص کو دور کر لیتا ہے، تو یہ اس کے لیے نفع بخش ہوتا ہے۔)

اجتماعی وملکی مصلحت

زکات میں دوسری مصلحت وہ ہے، جس کا ملک اور معاشرے سے تعلق ہے اور وہ یہ کہ سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں اپنی حکمت بالغہ سے مالی لحاظ سے تفاوت وفرق رکھا ہوا ہے، سب یکساں درجے کے نہیں ہیں۔ کوئی امیر ہے تو کوئی غریب ہے، کوئی خوش حال ہے، تو کوئی تنگ دست ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ تقسیم عجیب اور بڑی گہری حکمت

(۱) حجة الله البالغة :۲/ ٦٠

پر مبنی ہے،جس کی جانب قرآن کی ایک آیت میں اشارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

﴿وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ﴾ (الأنعام: ۱۶۵)

(یعنی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں بلند درجے دیے،تاکہ تم کو اس چیز سے آزمائے جو تم کو دیا ہے۔)

ظاہر ہے کہ اگر تمام لوگ مالدار و کروڑ پتی ہوتے اور کوئی غریب نہ ہوتا تو دنیا کا یہ نظام چل نہیں سکتا تھا؛ کیوں کہ کوئی کسی کا محتاج نہ ہوتا،تو ایک دوسرے کے کام کون کرتے؟ اب ایسا ہے کہ ایک جانب مال دار کو اپنے کاموں کے لیے غریب کی ضرورت ہے اور دوسری طرف غریب کو اپنے معاش کے لیے مال دار کی ضرورت ہے،اس طرح یہ دنیا کے اس کارخانے کا نظام چل رہا ہے۔

اگر ہم اسلامی نظام کا جائزہ لیں،تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مال و دولت انسانی حاجات وضروریات اور اس کے درپیش مسائل میں اس کا ساتھ دیں اور وہ کسی ایک جگہ سمٹ کر نہ رہ جائیں یا چند ہاتھوں میں محدود و محصور نہ ہو جائیں۔لہذا اسلام نے دولت و مال کے بنیادی طور پر دو مستحق قرار دیے ہیں۔

ایک وہ جو مال و دولت کی پیداوار میں شریک ہوتے ہیں اور اپنی محنت اور تجربے سے اس کو کماتے ہیں،جیسے کوئی تجارت کرتا ہے اور کوئی صنعت وحرفت اور کسی پیشے سے کمائی کرتا ہے اور کوئی ملازمت اور سروِس کرتا ہے،یہ لوگ اپنی محنت کے ذریعے مال و دولت کی پیداوار میں شریک لوگ ہیں؛لہذا اسلام ان لوگوں کو مال و دولت کا اولین مستحق قرار دیتا ہے۔

دوسرے وہ لوگ جو مال و دولت کی پیداوار میں شریک نہیں ہیں؛مگر پھر بھی اللہ

تعالیٰ نے ہمارے مالوں میں سے ان کو ایک حصے کا مستحق قرار دیا ہے، کیوں؟

اس لیے کہ ایسے لوگ ایک تو وہ ہیں، جو اپنے اندر مال کمانے کی قابلیت وصلاحیت ہی نہیں رکھتے، جیسے معذور ومجبور، بیمار، اندھے، لنگڑے، لولے، وغیرہ۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو مال کمانے کی قابلیت تو رکھتے ہیں، مگر انکے لیے حالات ناساز گار ہیں، جس کی وجہ سے یا تو ان کے پاس کمائی کا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہوتا، یا ان کی کمائی کے ذرائع محدود ہوتے ہیں، جس کی بنا پر وہ معاشی تنگی کا شکار رہتے ہیں اور اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورتوں اور حاجتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

لہذا حکم دیا گیا کہ معاشرے میں موجود غربا وفقرا، یتامی ومساکین، ضرورت مند و حاجت مند افراد کو اپنے مالوں میں سے دیا کرو؛ تاکہ یہ اللہ کا مال انسانیت کے کام آئے اور سمٹ کر ایک جگہ نہ رہ جائے اور معاشرے کے تمام افراد باعزت اور شریفانہ زندگی گزار سکیں اور معاشرہ میں ایک دوسرے سے ہمدردی وغم خواری، رحم دلی وفراخ دلی کے جذبات ابھریں اور نیکی ونیک نفسی کی فضا عام ہو جائے۔

اس سلسلے میں آیات بہت سی ہیں، یہاں اختصار پیش نظر ہونے کی وجہ سے صرف دو آیات کی جانب اشارہ کرتا ہوں۔

ایک جگہ مالِ غنیمت کے سلسلے میں فرمایا گیا کہ

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر: ۷)

(جو مال اللہ تعالیٰ دوسری بستی والوں سے رسول کو بطور فی دلوائے، وہ اللہ کا ہے اور رسول کا اور آپ کے رشتہ داروں کا اور یتامیٰ کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا ہے؛ تاکہ وہ مال تمہارے مال داروں ہی کے قبضے میں ذاتی دولت بن کر نہ رہے۔)

یہ آیت اگر چہ کہ مالِ غنیمت سے متعلق ہے، تاہم اس میں اشارہ ہے کہ مال کا ایک جگہ سمٹ کر صرف مالداروں کے قبضے میں رہ جانا اللہ کو منظور نہیں۔

ایک جگہ مال کی تقسیم میں فرق مراتب کا ذکر کرتے ہوئے حکم دیا گیا کہ چوں کہ یہ فرق رکھا گیا ہے؛ لہٰذا تم دوسرے حق داروں کا حق دیا کرو، چناں چہ فرماتے ہیں:

﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ذٰلِکَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الروم: ۳۷-۳۸)

(کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی جس کا رزق چاہتے ہیں کشادہ کر دیتے ہیں اور جس کا چاہتے ہیں تنگ کر دیتے ہیں، اس میں اہل ایمان کے لیے نشانیاں ہیں؛ لہٰذا تو قرابت دار اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دیا کر اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ - نے اس حکمت کی جانب ان الفاظ میں رہبری کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ

”و مصلحةٌ تَرْجِعُ إلی المَدِیْنَة ، وهي : أنّهَا تجمعُ لا محالةَ الضعفاءَ وذوي الحاجة ، وتلک الحوادث تَغْدُو علی قوم وتَرُوْحُ علی آخَرِین ، فلو لَمْ تَکُن السُّنّة بينهم مواساةَ الفقراء وأهل الحاجات لَهَکُوْا ومَاتُوْا جُوعاً.“(۱)

(دوسری مصلحت وہ ہے، جس کا تعلق ملک سے ہے، کیوں کہ ملک ضعیف و حاجت مند لوگوں پر بھی مشتمل ہوتا ہے اور وہ حوادث صبح ایک قوم پر وارد ہوتے ہیں تو شام کسی اور پر نازل ہوتے ہیں، پس اگر فقیروں اور

(۱) حجة الله البالغة :۲/۶۱

حاجت مندوں کے ساتھ ہمدردی کا کوئی طریقہ نہ ہو، تو وہ لوگ ہلاک ہو جائیں اور بھوک کے مارے مر جائیں۔)

یہ ہے وہ اجتماعی حکمت و مصلحت، جس کی وجہ سے اسلام میں زکات وصدقات کا نظام مقرر و مشروع کیا گیا ہے۔

زکات وصدقات کے فوائد و برکات

زکات وصدقات میں بہت سے فوائد و برکات ہیں، یہاں مختصر طور پر اس پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ فوائد سے مراد دنیوی منافع ہیں اور برکات سے مراد روحانی و دینی منافع ہیں۔

زکات وصدقے کی روحانی برکتیں

(۱) قرب الٰہی کا حصول

سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ صدقہ وخیرات کرنے والا کو اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

« اَلسَّخِيُّ قَرِيْبٌ مِنَ اللّٰهِ ، قَرِيْبٌ مِنَ الْجَنَّةِ ، قَرِيْبٌ مِنَ النَّاسِ ، بَعِيْدٌ مِنَ النَّارِ. »

(سخی آدمی اللہ کے قریب ہے، جنت کے قریب ہے اور لوگوں کے قریب ہے اور دوزخ سے دور ہے۔)(۱)

(۲) دوزخ سے نجات

دوسری فضیلت اس کی یہ ہے کہ اس سے دوزخ سے نجات ملتی ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

(۱) ترمذي: أبواب البر والصلة/باب ماجاء في السخاء، ح:۱۹۶۱، طبراني في الأوسط:۲۳۶۳، شعب الإيمان:۱۰۳۵۲

« اِتَّقُوْا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ .»
(کہ خود کو دوزخ سے بچاؤ، اگر چہ کہ ایک کھجور ہی خیرات کر کے کیوں نہ ہو۔)(۱)

(۳) بے شمار اجر وثواب

زکات وصدقے کی ایک فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بڑھاتے ہیں اور ایک معمولی چیز بھی عظیم بنا کر قیامت میں دی جاتی ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ (البقرة:۲۶۱)

(ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، ایسی ہے جیسے ایک دانہ جو (زمین میں بویا گیا تو وہ) سات بالیاں اگا لاتا ہے اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوتے ہیں، (اس طرح ایک دانے سے سات سو دانے پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالی صدقے کے ایک دانے کا بدلہ سات سو تک عطا کرتے ہیں) اور اللہ چاہیں، تو اس سے بھی زیادہ دے سکتے ہیں اور اللہ بڑے سننے والے جاننے والے ہیں)

بخاری کی ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ –رضی اللہ عنہ– سے مروی ہے کہ رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے فرمایا کہ

''جو شخص اپنی پاک وحلال کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتے ہیں اور اس کو پالتے ہیں جیسے تم میں سے

---

(۱) البخاري : الزكاة/باب الصدقة قبل الرد ، ح :۱۴۱۳، أحمد :۲۵۱۰۱

کوئی اپنے گھوڑے کے بچے کو پالتا ہے، یہاں تک کہ وہ کھجور ایک پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔(۱)

(۴) گناہوں کی مغفرت

زکات وصدقات کا ایک روحانی فائدہ یہ ہے کہ اس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ –رضی اللہ عنہ– سے ایک لمبی روایت آئی ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے حضرت کعب بن عجرہ –رضی اللہ عنہ– سے فرمایا کہ

« اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ . »

(صدقہ گناہ کو بجھا دیتا ہے، اس طرح جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔)(۲)

(۵) روحانی بیماریوں سے دل کی صفائی

ایک فضیلت زکات دینے کی یہ ہے کہ روحانی امراض سے صفائی حاصل ہوتی ہے، اور دل کے اندر سے دنیا کی محبت کی ناپاکی اور دیگر روحانی امراض کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔

چناں چہ قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ . ﴾ (التوبۃ:۱۰۳)

(اے نبی –صلی اللہ علیہ وسلم– آپ لوگوں کے مالوں میں سے زکات وصول کریں، جو ان کو پاکیزگی وصفائی دیتا ہے اور آپ ان کے لیے دعا کریں۔)

(۶) فرشتوں کی دعا کا استحقاق

ایک فضیلت زکات وصدقہ دینے کی یہ ہے کہ زکات دینے والا اللہ کے فرشتوں کی دعاء کا مستحق ہو جاتا ہے۔

---

(۱) البخاري : الزكاة / باب الصدقة من كسب طيب ، ح:۱۴۱۰، الترمذي : الزكاة / باب ماجاء في فضل الصدقة ، ح :٦٦٧

(۲) الترمذي: الإيمان/باب ماجاء في حرمة الصلاة ، ح:۲۸۰۳،مسند أحمد :۱۴۴۴۱

چناں چہ بخاری اور مسلم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ -ﷺ- نے فرمایا کہ

« مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيْهِ إِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلاَنِ : فَيَقُوْلُ : أَحَدُهُمَا : اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا ، وَ يَقُوْلُ الْآخَرُ : اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكاً تَلَفًا. »

(روزانہ صبح کے وقت دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں، ان میں سے ایک فرشتہ سخاوت کرنے والے کے لیے دعاء کرتا ہے کہ یا اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدلہ عطا فرما اور دوسرا فرشتہ بخیل کے لیے بددعاء کرتا ہے کہ یا اللہ! بخیل کا مال تلف فرما یعنی اس کے مال میں نقصان پیدا فرما)۔(۱)

زکات وصدقے کے دنیوی فوائد

زکات وصدقات کے دنیوی فوائد بھی بے شمار ہیں، یہاں ہم ان میں سے چند اہم چیزیں ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

(۱) غیبی امداد ونصرت

زکات وصدقات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کاروبار اور دنیوی مسائل میں غیبی امداد فرماتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ -رضی اللہ عنہ- نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ -ﷺ- نے فرمایا کہ ایک شخص ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ اس نے بادل کے اندر سے ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغ کو سیراب کردے۔ اتنے میں وہ بادل چلا اور ایک پتھریلی زمین پر برس گیا اور وہاں ایک نالی تھی، اس میں وہ پانی جمع ہوگیا اور وہ نالہ میں پانی چلنے لگا، یہ شخص اس پانی کے پیچھے

(۱) البخاري : الزكاة/ باب قول الله تعالىٰ : فأما من أعطىٰ واتقى، ح : ۱۴۴۲. مسلم : الزكاة / باب في المنفق والممسك ، ح :۱۰۱۰

پیچھے چلا کہ دیکھوں کہ کہاں جاتا ہے؟ اس نے دیکھا کہ ایک شخص اپنے باغ میں کھڑے پھاوڑے سے پانی کو ادھر ادھر پھیلا رہا ہے۔ اس آدمی نے اس کا نام پوچھا، اس نے اپنا نام وہی بتایا جو بادل میں اس نے سنا تھا۔ پھر باغ والے نے اس سے پوچھا کہ میرا نام کیوں پوچھتے ہو؟ اس نے بتایا کہ میں نے بادل میں سے ایک آواز سنی کہ تمہارا نام لے کر کہا کہ اس کے باغ کو سیراب کردے، اس لیے میں نے پوچھا۔ اس نے اس سے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں، جس سے یہ برکت آپ کو مل رہی ہے؟ اس نے کہا کہ جب تم نے یہ پوچھا ہے تو سنو کہ میں اس کی پیداوار کو دیکھتا ہوں اور ایک تہائی حصہ صدقہ دے دیتا ہوں اور ایک تہائی سے اپنا اور اپنے بچوں کا گزر بسر کرتا ہوں اور ایک تہائی اسی باغ میں لگا دیتا ہوں۔(۱)

(۲) مال کا تحفظ اور امراض سے شفاء

زکات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مال کو چوروں اور ڈاکوؤں سے اور دیگر حوادث سے محفوظ رکھتے ہیں اور امراض سے شفاء ملتی ہے۔

چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ـ ﷺ ـ نے فرمایا کہ

« حَصِّنُوْا أَمْوَالَكُمْ بِالزَّكَاةِ ، وَدَاوُوْا مَرْضَاكُمْ بِالصَّدَقَةِ »

(زکات کے ذریعے اپنے مالوں کی حفاظت کرلو اور صدقہ سے اپنے مریضوں کو دوا کرو۔)(۲)

(۳) آفات اور بلاؤں اور بری موت سے تحفظ

ایک فضیلت یہ ہے کہ صدقہ سے آفات اور بلائیں ٹلتی ہیں اور حادثات اور بری موت سے حفاظت ہوتی ہے۔

---

(۱) مسلم : الزهد والرقائق / باب الصدقة على المساكين ، ح :۲۹۸۴، أحمد :۷۹۴۱۔

(۲) المقاصد الحسنة :۳۰۹، كشف الخفاء:۱/۳۱۵، ضعيفٌ ؛ ولكن له شواهد

چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

«بَادِرُوْا بِالصَّدَقَةِ ؛ فَإِنَّ الْبَلاءَ لا يَتخَطَّاهَا .»

(صدقہ کرنے میں جلدی کرو؛ کیوں کہ صدقہ کرنے سے بلاء اور مصیبت اس سے آگے نہیں بڑھتی۔)(۱)

ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ

« اَلْمَعْرُوْفُ إِلَى النَّاسِ يَقِي مَصَارِعَ السُّوْءِ وَالْآفَاتِ وَالْهَلَكَاتِ. »

(یعنی لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا بری موت سے اور آفات و ہلاکتوں سے بچاتا ہے۔)(۲)

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

« اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الربِّ و تَدفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ »

(صدقہ اللہ رب العزت کے غضب کو ٹھنڈا کرتا اور بری موت کو دفع کرتا ہے۔)(۳)

انتہائی عجلت میں زکات وصدقات کے برکات وفوائد جو سامنے آئے، ان کو یہاں درج کیا گیا ہے، ویسے زکات وصدقات کی برکات وفوائد بے شمار ہیں۔



(۱) مشكاة : باب الإنفاق و كراهية الإمساك ، ١٦٧

(۲) مستدرک: ۴۲۹

(۳) الترمذي : الزكاة / باب ماجاء في فضل الصدقة ، ح :٦٦٩، ابن حبان: ۳۳۰۹

بحث دوم

زکات کن لوگوں پر فرض ہے؟

بحث دوم
زکات کن لوگوں پر فرض ہے؟

اب ہم اس کتاب کے اصل مقصد کی طرف آتے ہیں اور مسائل زکات کی بحث شروع کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، یہاں زکات کے مسائل مختلف پہلوؤں سے زیر بحث لائے جائیں گے، جن کی تفصیل ہم نے شروع میں لکھ دی ہے۔

یہاں پہلی بحث یہ ہے کہ زکات کن لوگوں پر فرض ہے؟ ظاہر ہے کہ تمام لوگوں پر زکات فرض نہیں ہے، کیوں کہ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو زکات دینے کی اہلیت نہیں رکھتے، لہذا اسلام نے ہمیں یہ بتادیا ہے کہ کن کن لوگوں پر زکات عائد ہوتی ہے اور کن لوگوں پر عائد نہیں ہوتی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ زکات ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو عقل مند ہو، بالغ ہو اور نصاب کے برابر مال کا مالک ہو۔

ہدایہ میں ہے کہ

" الزكاة واجبةٌ على الحر العاقل البالغ المسلم ، إذا ملك نصاباً ملكاً تاماً ، وحال عليه الحول. "(۱)

" المختار للفتوى " میں لکھا ہے کہ

(۱) الهداية : ۱۶۱/۲

" وَلا تَجِبُ إلَّا على الحُرِّ المُسْلِم العَاقِل البَالِغ ، إذا مَلَكَ نِصَاباً خَالِياً عَنِ الدَّين ، فَاضِلاً عَنْ حَوَائِجِه الأصلية مِلكاً تامًّا في طرفي الحَوْل. "(۱)

لہذا معلوم ہوا کہ زکات مسلمان پر ہے، کافر پر نہیں؛ کیوں کہ وہ تو دین وشریعت ہی کو نہیں مانتا، تو اس پر زکات کے فرض ہونے کی بحث وسوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ فقہاء نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ کفار مخاطب بالفروع ہیں یا نہیں؟ جہاں تک دنیوی احکام ہیں، ان میں کفار کا مخاطب بالفروع نہ ہونا متفق علیہ ہے، لہذا ان سے نماز، روزہ وغیرہ احکام کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور اخروی احکام میں حنفیہ کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وہ مخاطب نہیں ہیں اور امام شافعی کے نزدیک وہ مخاطب ہیں۔(۲)

دوسرے یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ عقل سے محروم ہیں اور پاگل ہیں ان پر زکات نہیں ہے؛ کیوں کہ جب وہ عقل ہی نہیں رکھتے، تو احکام شریعت کے وہ مخاطب ہی نہیں ہیں، لہذا وہ احکام شرع کے مکلّف نہیں ہوتے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ - ﷺ - نے فرمایا کہ

«رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلاثٍ: عَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ ، وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتَّى يَحْتَلِمَ ، وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتَّى يَعْقِلَ .»

(تین قسم کے لوگوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے: ایک سوئے ہوئے سے، یہاں تک کہ وہ جاگ جائے اور دوسرے بچے سے، یہاں تک کہ وہ بالغ ہوجائے اور تیسرے مجنون سے یہاں تک کہ وہ عقل مند ہوجائے۔)(۳)

(۱) الاختيار لتعليل المختار:۱/۹۹

(۲) بدائع الصنائع:۲/۳۷۷

(۳) أحمد :۲۴۶۹۴، أبو داود : كتاب الحدود / بابٌ في الغلام يصيب الحد، ح :۴۴۰۳، ابن ماجة : كتاب الطلاق/ باب طلاق المعتوه والصغير، ح : ۲۰۴۱

اور اسی طرح حنفیہ کے نزدیک نابالغ بچے پر بھی زکات نہیں؛ حتی کہ اگر اس کے پاس مال موجود بھی ہو، تو اس مال میں سے زکات واجب نہ ہوگی، جس طرح اور عبادات بھی اس پر لازم نہیں ہیں۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود -رضی اللہ عنہ- اور حضرت عبداللہ بن عباس -رضی اللہ عنہ- سے یہی مروی ہے کہ نابالغ پر زکات نہیں ہے۔

امام محمد نے "کتاب الآثار" میں روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود -رضی اللہ عنہ- نے فرمایا کہ

" ليس في مال اليتيم زكاة "(۲)

اور امام دارقطنی نے سنن میں حضرت عبداللہ بن عباس -رضی اللہ عنہ- سے روایت کیا کہ انھوں نے فرمایا کہ

"لا يَجبُ على مال الصَّغيرِ زكاةٌ ؛ حتى تجِبَ عليهِ الصلاةُ". (۳)

اسی طرح فقیر جو نصاب کے برابر مال کا مالک نہ ہو، اس پر زکات فرض نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ خود ضرورت مند ہے، تو وہ بے چارہ دوسروں کو کیا دے گا۔

لیکن یہاں یاد رہے کہ بے ہوش آدمی کے پاس نصاب کے برابر مال ہو، تو اس پر زکات واجب ہے، کیوں کہ یہ بیماری ہے، بے عقلی نہیں ہے۔



---

(۱) بدائع الصنائع :۳۷۸/۲، الهداية :۱۶۳/۲
(۲) كتاب الآثار :۳۶
(۳) سنن الدارقطني:۱۹۸۱

بحث سوم
اموال زکات



بحث سوم
اموال زکات

کون سے مال پر زکات فرض ہے؟

دوسری بحث یہ ہے کہ زکات کن کن مالوں پر فرض ہے؟ یہاں سمجھ لیجیے کہ زکات تین قسم کے مالوں پر فرض ہوتی ہے، جس کے پاس ان تین قسم کے مالوں میں سے کوئی بھی مال ہو، اس پر زکات فرض ہے۔

(۱) سونا، چاندی، خواہ وہ سکے کی شکل میں ہوں، یا زیور کی شکل میں ہوں۔ اور روپیہ پیسہ بھی انہی میں داخل ہے، خواہ وہ دھات کے ہوں، یا کاغذ کے ہوں، یا اور کسی چیز کے، جن کو کسی بھی ملک میں قانونی حیثیت سے مال مانا گیا ہو۔

(۲) مال تجارت، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

(۳) جانور ومویشی: اونٹ، گائے، بیل، بکری وغیرہ۔

ان تمام قسم کے مالوں پر اسلام میں زکات عائد ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اگر زمین کی پیداوار کو بھی ملا لیا جائے، تو یہ کل چار قسمیں ہو جاتی ہیں، جیسے کھیت سے اناج و غلہ پیدا ہوتا ہے اور باغات سے پھل نکلتے ہیں، ان سب کی بھی زکات ہے؛ مگر ان کی زکات کو عشر کہا جاتا ہے، اس لیے یہاں اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

"بدائع الصنائع" میں ہے کہ

" أموالُ الزَّكاةِ أنواعٌ ثلاثةٌ ، أحدها : الأثمانُ المُطلقةُ وهي الذَّهَبُ والفِضَّةُ ، والثاني : أموالُ التجارةِ وهي العُرُوضُ المُعَدَّةُ للتجارة ، والثالثُ: السَّوَائِم."(۱)

روپیہ پیسہ اور کاغذی نوٹ ثمن عرفی ہیں اور ان پر بھی زکات ہے

یہاں یاد رہے کہ روپیہ پیسہ بھی چونکہ قانونی طور پر بھی اور عرفاً بھی ثمن ہے، لہذا وہ بھی سونے چاندی کی طرح ثمن ہی میں داخل ہے اور اس پر بھی زکات عائد ہوگی۔ اور اسی طرح یہ کاغذی نوٹ بھی یہی حکم رکھتے ہیں؛ کیوں کہ ان کو بھی قانونی ثمن ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔

علامہ شامی نے "رد المحتار" میں علامہ شرنبلالی سے نقل کیا ہے کہ

"الفلوسُ إنْ كانتْ أثْمَاناً رائجةً أو سِلعاً للتجارة تَجِبُ الزكاةُ في قيمتها ، وإلَّا فَلا ."(۲)

کاغذی نوٹوں کے سلسلے میں موجودہ دور کے فقہاء میں سے اکثریت کی رائے یہی ہے کہ وہ بھی مال نامی کی طرح مال ہے اور اس پر زکات عائد ہوتی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنے مقالے "أحكام الأوراق المالية والعملات" میں تفصیل کے ساتھ کلام کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ کاغذی نوٹ بھی رائج الوقت فلوس کے حکم میں ہیں، پھر آپ نے صراحت سے لکھا کہ

" تجب الزكاة على الأوراق النقدية بالإجماع،

---

(۱) بدائع الصنائع: ۲/۴۰۵

(۲) شامي:۳/۲۳۱، كتاب الزكاة/ باب زكاة المال

وليس على قول من يقول بوجوب الزكاة على الدين فقط ؛ وإنما هي في حكم الفلوس النافقة ، والفلوس النافقة في حكم الزكاة كعروض التجارة ، تجب عليها الزكاة إذا بلغت قيمتها نصاب الفضة. "[1]

(کاغذی نقدی پر بالاجماع زکات واجب ہوتی ہے اور صرف ان لوگوں کے قول پر نہیں جو دین پر زکات کو واجب کہتے ہیں، بل کہ اس واسطے کہ یہ کاغذی نقدی رائج شدہ فلوس کے حکم میں ہے اور رائج شدہ فلوس زکات کے حکم میں مال تجارت کی طرح ہیں، جن پر زکات واجب ہوجاتی ہے، جب کہ اس کی قیمت چاندی کے نصاب کو پہنچ جائے۔)

نیز شیخ علامہ وھبہ زحیلی نے لکھا ہے کہ چوں کہ کاغذی نوٹوں کا نظام و رواج پہلی عالمی جنگ کے بعد وجود میں آیا، اس لیے قدیم فقہاء نے اس پر کوئی بحث نہیں کی اور موجودہ دور کے فقہاء نے کاغذی نوٹوں پر زکات کے بارے میں بحث کی ہے اور حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ تینوں کے نقطۂ نظر کے مطابق ان پر وجوب زکات کا حکم لگایا ہے، البتہ معاصر حنابلہ نے ان کو قرض مان کر قبضہ ہونے سے پہلے زکات کا حکم نہیں لگایا ہے۔

پھر وہ جمہور کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

" والحقُّ وُجُوبُ الزَّكاة فيها ؛ لأنَّها أصبحتْ هي أثمان الأشياء ، وامتنع التعامل بالذهب ولم تسمح أي دولةٍ بأخذ الرصيد المقابل لأي فئةٍ من أوراق التعامل ، ولا يصحُّ قياسُ هذه النُّقُود على الدَّيْن ؛ لأن هذا الدَّيْن لا ينتفعُ به صَاحبُه وهو الدائن ، ولم يُوجِب الفُقَهاءُ زكاتَه إلاّ بعدَ قبضه

(۱) أحكام أوراق النقود والعملات ، مندرجة مجلة الفقه الإسلامي :۳/۳/۱۶۹۸

لاحتمال عدم القبض ، أمّا هذه النقودُ فينتفع بها حاملُها فِعْلاً كما ينتفع بالذهب الذي اعتبر ثَمَناً للأشياءِ وهو يَحُوزُها فعلاً ، فلا يصحُّ القولُ بوجود اختلافٍ في زكاة هذه النُّقُود.

والقولُ بعدم الزكاة فيها لا شكَّ بأنَّه اجتهاد خطأ ؛ لأنّه يُؤدِّي في النتيجة البينة ألَّا زَكاةَ على أخْطَر وأهَمِّ نوعٍ من أمْوَال الزَّكاة." (۱)

سونا، چاندی کسی بھی شکل میں ہو، اس پر زکات ہے

سونا اور چاندی کسی بھی شکل میں ہو، اس پر زکات عائد ہوتی ہے، خواہ وہ سکوں کی شکل میں ہوں، یا بسکیٹ کی شکل میں ہوں، یا زیور کی شکل میں ہوں۔ اسی طرح اگر تلوار، قرآن کریم، عصا یا کسی اور چیز پر سونے یا چاندی کا کام ہو، تو اس کو بھی زکات کے حساب میں لیا جائے گا۔

امام سرخسی مبسوط میں لکھتے ہیں کہ

"وما كان من الدراهم والدنانير والذهب والفضة ، تبراً مَكْسُوراً ، أو حَلْياً مَصُوْغاً ، أو حلية سَيْفٍ ، أو منطقةٍ ، أو غير ذلک ففي جميعه الزكاةُ إذا بلغ الذهبُ عشرينَ مِثْقالاً أو من الفضة مائتي درهمٍ ، نوَى به التجارةَ أو لم ينو ". (۲)

فتاوی التاتارخانیہ میں ہے کہ

" الزكاةُ واجبةٌ في الذهب والفضة مضروبةً كانت أو

(۱) موسوعة الفقه الإسلامي والقضايا المعاصرة :۲/۲۸۱

(۲) المبسوط :۲/۱۹۱

غير مضروبة. وفي الخانية : مَصُوغاً كان أو غيرَ مَصُوغ ، حلياً كان للرجال أو للنساء عندنا ، نوى التجارة أم لا ، إذا بلغت الفضةُ مائتي درهم والذهبُ عشرين مثقالاً". (۱)

بدائع الصنائع میں چاندی کا نصاب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

" لا يُعْتَبَرُ في هذه النصاب صفةٌ زائدةٌ على كونه فضةً، فتجبُ الزكاةُ فيها سواء كانت دراهمَ مَضْرُوبة أو نُقْرةً أو تِبْراً أو حلياً مَصُوْغاً أو حِلية سيفٍ ، أو مِنْطقةٍ أو لِجَامٍ أو سَرْجٍ ، أو الكواكبَ في المَصَاحِف و الأوَانِي ، وغيرِها ". (۲)

پھر اسی طرح سونے کا نصاب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

" لا يُعْتَبَرُ في نصاب الذهب أيضاً صفةٌ زائدةٌ على كونه ذَهَباً، فتجبُ الزَّكاةُ في المضروب، والتبر، و المصوغ والحلي ". (۳)

سونے و چاندی کے زیورات پر زکات

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سونے یا چاندی کے زیورات پر بھی زکات ہے، خواہ وہ استعمال میں آتے ہوں یا استعمال میں نہ آتے ہوں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پہنے جانے والے زیوروں پر زکات نہیں ہے، مگر یاد رہے کہ اکثر علماء کا مسلک یہ ہے کہ ان زیورات پر بھی زکات فرض ہے، جو پہنے جاتے ہوں اور استعمال میں آتے ہوں۔

(۱) التاتارخانية :۳/۱۵۴-۱۵۵
(۲) بدائع الصنائع:۲/۴۰۶، فصل في بيان صفة النصاب
(۳) بدائع :۲/۴۱۰، فصل في صفة نصاب الذهب

کیوں کہ سنن ابی داود میں ایک حدیث ہے کہ ایک عورت رسول اللہ –ﷺ– کی خدمت میں آئی اور اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی اور بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے کنگن تھے۔ آپ –ﷺ– نے اس سے پوچھا کہ کیا تو اس زیور کی زکات دیتی ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تجھے یہ پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بدلے تجھ کو جہنم کے کنگن پہنائیں؟ یہ سن کر اس نے وہ کنگن خیرات کر دیے۔ (۱)

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ –رضی اللہ عنہا– سے روایت ہے کہ خود انھوں نے ہاتھوں میں چاندی کے چھلے پہنے ہوئے تھے، آپ –ﷺ– نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ زیور میں نے آپ کے لیے زینت اختیار کرنے کے لیے بنوائے ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ: "أ تؤدّين زكاتهنّ؟" (کیا تم اس کی زکات دیتی ہو؟) حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپ –ﷺ– نے ان کو فرمایا کہ: " هو حسبُكِ من النار" کہ یہ تمہارے جہنم میں جانے کے لیے کافی ہے۔ (۲)

الغرض اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو اپنے زیورات کی زکات دینا ضروری ہے، اگر وہ اس کو پہنتی ہوں، تب بھی دینا ہے جیسا کہ ان احادیث سے معلوم ہوا۔

بچیوں کے لیے رکھے ہوئے زیور کی زکات کون دے؟

بعض لوگ بچیوں کے لیے زیور بنا کر رکھتے ہیں، اس خیال سے کہ ان کی شادی میں کام آئے گا، یا کسی اور موقعے پر کام آئے گا، اس کی زکات کون دیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بچیوں کے لیے جو زیور خرید کر یا بنا کر رکھا ہے، اس میں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس زیور کا مالک فی الحال کون ہے؟ اگر ماں باپ نے اس زیور کو اپنی بچیوں کے حوالے کر دیا ہے اور ان کو اس کا مالک بنا دیا ہے، تو اب اس زیور کی مالک بچیاں ہو گئیں،

---

(۱) أبو داود: كتاب الزكاة /باب الكنز، ما هو؟ ح :۱۵۶۳

(۲) أبو داود : أيضاً، ح :۱۵۶۵

اور اگر ماں باپ نے اس زیور کا مالک بچیوں کو نہیں بنایا ہے، تو ماں یا باپ جنھوں نے اس زیور کو خریدا یا بنایا ہے، وہی اس کے مالک ہیں؛ لہذا جو مالک ہوں گے، ان پر زکات آئے گی۔ لہذا اگر بچیوں کو اس کا مالک بنا دیا گیا ہو اور وہ بالغ ہو چکی ہوں، تو اس زیور کی زکات خود ان پر عائد ہوگی اور اگر ابھی بالغ نہیں ہوئی ہیں، تو ان پر اس کی زکات نہیں آئے گی۔ اور اگر ان بچیوں کو اس کا مالک نہیں بنایا ہے، تو خود ماں یا باپ پر اس کی زکات واجب ہوگی۔

دوسری دھات ملے ہوئے سونے چاندی کی زکات

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سونے اور چاندی کے زیورات عام طور پر کسی نہ کسی دھات کے ملانے سے تیار کیے جاتے ہیں، خالص سونا اور چاندی سے زیورات یا دراہم و دینار تیار نہیں ہوتے، جیسا کہ صاحب ہدایہ امام مرغینانی لکھتے ہیں کہ:

" لأن الدراهم لا تخلو عن قليل غش ؛ لأنها لا تنطبع إلا به ".(۱)

تو سونے اور چاندی کے زیورات میں جو دوسری دھات: تانبا، یا پیتل وغیرہ کی ملاوٹ ہوتی ہے، تو ان کو الگ کر کے زکات کا حساب کیا جائے گا، یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری دھاتوں کی ملاوٹ کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک یہ کہ سونے کے ساتھ دوسری دھات جیسے تانبا، یا پیتل کو ملا کر گلا دیا اور پھر دونوں کے مجموعے سے جو ایک ہو گیا ہے، زیور بنا دیا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سونا اپنی جگہ ہے اور اس کے ساتھ دوسری دھات کو بغیر گلائے جوڑ دیا گیا ہو یا اس طرح چسپاں کر دیا گیا ہو کہ اگر چاہیں، تو اس کو چھڑایا جا سکے۔

اگر پہلی صورت ہے اور عموماً ایسا ہی ہوتا ہے، تو اس کا حکم فقہاء نے لکھا ہے کہ اس میں

(۱) الهداية : باب زكاة المال، ۱۹۰/۲

یہ دیکھا جائے گا کہ سونا، یا چاندی غالب وزیادہ ہے، یا دوسری دھات غالب ہے؟

اگر سونا یا چاندی غالب ہے، تو اس کو سونا یا چاندی ہی سمجھا جائے گا اور اس کی زکات دینی ہوگی اور زکات بھی اس پورے مجموعے کی دینی ہوگی۔ یعنی اگر وہ زیور سوگرام کا ہے، تو سوگرام کی زکات دینی ہوگی، ایسا نہیں کہ اس میں سے دھات کا وزن کم کر کے زکات دیں؛ بل کہ پورے کی زکات دینی ہوگی۔

اور اگر دوسری دھات غالب ہے، تو یہ سامان کے حکم میں ہوگا؛ لہذا اگر تجارت کی نیت سے ہو اور نصاب کے برابر ہو، تو اس میں زکات عائد ہوگی، ورنہ نہیں۔

ہدایہ میں ہے کہ

" وإن كان الغالبُ على الورق الفضة ، فهو في حكم الفضة، وإذا كان الغالب عليها الغش فهو في حكم العروض ، يعتبر أن تبلغ قيمته نصاباً " .(۱)

الدر المختار میں ہے کہ

" وغالبُ الفضة والذهب فضةٌ و ذهبٌ، وما غلب غشه منهما كالعروض، ويُشْتَرَطُ فيه النية إلاّ إذا يخلص منه ما يبلغ نصاباً أو أقل."(۲)

یہاں ایک اور صورت یہ ہوسکتی ہے کہ سونے یا چاندی کے ساتھ دوسری دھات برابر برابر ہو، تو اس کی زکات کے واجب ہونے یا نہ ہونے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ ایک قول وجوب کا ہے اور دوسرا عدم وجوب کا ہے۔ علامہ عینی نے ابونصر کی شرح قدوری کے حوالے سے وجوب کو احوط لکھا ہے۔(۳)

(۱) الهداية : باب زكاة المال، ۱۹۰/۲

(۲) الدر المختار مع رد المحتار:۲۳۰/۳، باب زكاة المال

(۳) البناية:۴۳۸/۳

اور الدر المختار میں ہے کہ

" واختلف في المساوي والمختار لزومها احتياطاً ". (۱)

اور اگر دوسری صورت ہے کہ سونے کے ساتھ دوسری دھات کو جوڑ دیا گیا ہے، مثلا سونے کی چین میں ایک ''ڈالر'' تانبے کا لگا دیا ہے یا سونے یا چاندی کے ساتھ کسی اور دھات کو چسپاں کر دیا گیا ہے جس کو چھڑایا جا سکتا ہو، تو اس صورت میں صرف سونے یا چاندی کی زکاۃ دینی ہوگی، جب کہ وہ نصاب کے برابر ہو اور دوسری دھات کی نہیں، الا یہ کہ اس میں تجارت کی نیت ہو، تو پھر اس دوسری دھات کی بھی زکات آئے گی، بشرطے کہ وہ نصاب کے برابر ہو۔

بدائع الصنائع میں ہے کہ

"وإن كانتْ تُخَلَّصُ من النُّحَاس ، ولا تحترقُ ويبقىَ النُّحَاسُ على حَالِه أيضاً ؛ فإنه يُعْتَبَرُ فيه كلُّ واحدٍ منهما على حاله ، ولا يُجعَلُ أحدُهما تبعاً للآخر، كأنهما منفصلان ممتازان أحدهما عن صاحبه؛ لأنّه إذا أمكن تخليصُ أحدهما من صاحبه على وجهٍ يبقى كُلُّ واحدٍ منهما بعد الذُّوب والسَّبْک ، لم يكن أحدُهما مستهلكاً. "(۲)

ہدایہ میں ہے کہ

" إلاّ إذا كان تخلص منها فضة تبلغ نصاباً ، لأنه لايُعتَبَرُ في عين الفضة القيمةُ ولا نيةُ التجارة "(۳)

---

(۱) الدر المختار مع الشامي:۲۳۱/۳

(۲) بدائع الصنائع : كتاب البيوع/ فصلٌ في شرائط جريان الربا ، ۹۰/۷

(۳) الهداية :۱۹۰/۲

علامہ بدالدین العینی " البناية شرح الهداية " میں اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

" قوله: وإذا كان الغالبُ عليها الغَشّ فهي فى حكم العروض : يُرِيْدُ به إذا كانت الفضة لا تُخَلَّص بِالنَّار ، وإن كان شيءٌ يخلص منها لا يكون حُكمُهَا حكمَ العروض ، بل يُجْمَعُ ما فيها من الفضة و يُضَمُّه إلى ما عنده من ذَهَبٍ ، أو فِضّةٍ أو مالِ تجارةٍ و يُزَكّى الكُلَّ ". (۱)

اس سلسلے میں حضرت حکیم الامت تھانوی کا ایک فتویٰ تفصیلی طور پر موجود ہے، یہاں ہم اس کو نقل کرتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ

"ذہب (سونے) وفضہ (چاندی) کے ساتھ غیر ذہب وفضہ کے مخلوط ہونے کی دوصورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ دونوں متمیز ہوں اور گلا کر ملائی نہ گئی ہوں۔ اس میں تو مجموعہ کا حکم ایک نہ ہوگا۔ ذہب وفضہ کی مقدار میں ذہب وفضہ کے احکام جاری ہوں گے اور غیر ذہب وفضہ میں اس کے احکام جاری ہوں گے۔ مثلاً بیع صرف وزکات میں صرف مقدار ذہب وفضہ معتبر ہوگی ، مجموعہ میں نہ ہوگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک دوسرے سے متمیز نہ ہوں اور گلا کر دونوں کو ایک کر دیا گیا ہو۔ اس میں فقہاء نے کہا ہے کہ غالب کا اعتبار ہے۔ یعنی اگر غالب ذہب وفضہ ہو، تو مجموعہ کو سب احکام میں ذہب وفضہ کہا جائے گا اور اگر غالب دوسری چیز ہے تو مجموعہ کو دوسری چیز کے حکم میں کہیں گے۔ اس میں جس قدر ذہب و فضہ ہے، اس میں بھی احکام ذہب وفضہ کے جاری نہ ہوں گے۔ نہ اس

(۱) البناية:۳/۴۳۸

پر زکات ہوگی، نہ احکامِ بیع صَرف اس میں معتبر ہوں گے''۔(۱)

جواہرات اور قیمتی پتھروں کی زکات

ہیرے اور جواہرات اور قیمتی پتھروں میں زکات کے بارے میں یہ طے ہے کہ جو اپنے استعمال کے لیے ہوں، ان میں زکات نہیں، خواہ وہ کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں، حتی کہ ان کی قیمت لاکھوں تک بھی پہنچ جائے اور اگر بیچنے کے لیے ہوں، تو ان میں مال تجارت کی حیثیت سے زکات عائد ہوگی۔

امام حصکفی نے الدر المختار میں لکھا ہے کہ

"لا زكاةَ في اللآلي والجَوَاهر وإن سَاوَتْ ألفاً اتفاقاً إلّا أن تكونَ للتجارة ."(۲)

اور درر الحکام میں ہے کہ

"لازكاةَ في اللآلي والجَوَاهر كاللعلّ والياقوت و الزمرد و أمثالها إلا أن تكون للتجارة ."(۳)

علامہ نووی شافعی نے جمہور علماء کا اس سلسلے میں مذہب نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"لا زكاةَ فيما سوى الذَّهَبِ والفِضَّةِ من الجواهر كالياقوت، والفيروزج، واللؤلؤ، والمرجان، والزمرد ، و الزبرجد، والحديد، والصُفر، وسائر النحاس، والزجاج ، و إن حَسُنَتْ صنعتُها و كَثُرَتْ قيمتُها. ولا زكاةَ أيضاً في المِسْكِ و

---

(۱) امداد الفتاوی، مطبوعہ کراچی: ۲/۳۷-۳۸

(۲) الدر المختار: ۳/۱۹۴

(۳) درر الحکام: ۱/۱۷۵

العَنبَر . قال الشَّافعي في المختصر : ولا في حِليَةِ بَحْرٍ . قال أصحابُنَا : معناه كُلُّ مَا يُستَخرَجُ منهُ فلا زكاةَ فيه ، ولا خلافَ في شيءٍ من هذا عندنا ، وبه قالَ جَمَاهِيرُ العُلَمَاء من السَّلَف وغيرهم". (۱)

شیخ وھبہ الزحیلی " الفقه الإسلامي و أدلته" میں لکھتے ہیں کہ

"ولا زكاةَ بالاتفاق على سائر الجواهر واللآلئ و نحوها كالياقوت والزبرجد والفيروزج والمرجان ؛ لِعَدَم وُرُوْدِ ما يُوجِبُها في الشرع ولأنَّهَا مُعَدَّةٌ للاستعمال إلّا أنْ تكونَ للتجارة". (۲)

مگر یہاں ایک سوال یہ ہے کہ بعض لوگ انکم ٹیکس سے اور دیگر سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لیے نقد روپیوں، یا سونے چاندی کے بجائے ہیرے اور جواہرات اور قیمتی پتھروں کی صورت میں اپنے سرمایہ کو محفوظ کرتے ہیں، جو بظاہر تو تجارت کی نیت سے نہیں ہوتے، اس پر زکات کا کیا حکم ہے؟

احقر کی رائے میں اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں زکات واجب ہونا چاہیے، ایک تو اس وجہ سے کہ اس طرح ہیرے و جواہرات کو محفوظ کرنے والے کا آخر کار یہی مقصد ہوتا ہے کہ ان کو بیچ کر ان سے نفع اٹھایا جائے؛ لہذا یہ از قبیل سامان تجارت ہوں گے، الا یہ کہ کسی کا مقصد ایسا نہ ہو جو ایسی صورت میں نادر ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ یہ اربوں، کھربوں کے مالک لوگ اپنے مال کو اس طرح محفوظ کرنے کی یہ صورت اختیار کر کے فقراء و مسکین کا حق مارنے کی کوشش کرتے ہیں، لہذا اس لحاظ سے بھی اس قسم کے جواہرات و قیمتی پتھروں میں زکات لازم ہونی چاہیے جو بطور کنز محفوظ کیے جاتے ہیں۔

(۱) المجموع: ۵/۴۸۹، باب زكاة الذهب والفضة
(۲) الفقه الإسلامي وأدلته: ۲/۷۳۷

اس نقطۂ نظر کی تائید فقہائے شوافع کے اس جزیئے سے ہوتی ہے کہ زیورات کو اگر استعمال کے لیے نہیں؛ بل کہ محض کنز و ادخار کے طور پر جمع کیا، تو اس پر زکات واجب ہوگی؛ حالاں کہ ان کے نزدیک استعمالی سونے و چاندی کے زیورات پر زکات نہیں ہے۔

امام نووی – رحمہ اللہ – نے لکھا ہے:

" قَالَ أَصْحَابُنا: لَوْ اتَّخَذَ حلياً ولم يَقْصِدْ به استعمالاً مُحَرّماً ولا مَكْرُوهاً ولا مُباحاً؛ بل قَصَدَ كنزَه واقتناؤه فالمذهبُ الصحيحُ وُجُوبُ الزَّكاة فيه، وبه قَطَعَ الجُمْهور." (۱)

نیز فقہا حنابلہ جو استعمالی زیورات پر زکات کو واجب نہیں کہتے، وہ بھی یہ لکھتے ہیں:

" ولا تَسْقُطُ الزكاةُ عمَّنْ اتَّخَذَ حلياً فَارّاً منها."

(کہ جو زیورات اس لیے بناتا ہے کہ زکات سے راہ فرار اختیار کرے، اس سے زکاۃ ساقط نہ ہوگی۔)(۲)

معاصر علماء میں سے علامہ یوسف القرضاوی نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ

"اور مناسب ہے کہ یہی حکم موتیوں، یاقوت، الماس اور تمام نفیس پتھروں اور قیمتی جواہر کا ہو کہ ان میں سے جو بطور زینت یا زیور استعمال کیے جائیں اور جو حد اسراف میں داخل نہ ہوں، ان پر زکات نہیں ہوگی، اور جو کھلم کھلا عادت کے طور پر استعمال ہونے والی مقدار سے زائد ہوں، تو وہ اسراف اور حرام ہے اور اس کو زکات سے چھوٹ دینا درست نہ ہوگا، اسی طرح جو کنز کے طور پر رکھے گئے ہوں، ان پر بھی زکات عائد ہوگی، اس

(۱) المجموع :۵/۵۱۹. روضة الطالبين:۲/۱۲۲

(۲) دیکھو: كشف القناع:۲/۶۴. المغني لابن قدامة :۴/۲۲۲

لیے کہ یہ صورت مال پر عائد ہونے والے حق معلوم سے بچنے کی ایک صورت بن جائے گی اور نیت ہی اس سلسلے میں فیصل ہے اور اس نیت پر حد معتاد سے تجاوز دلالت کر رہا ہے۔[1]

پلاٹینم (Platinum) اور سفید سونے پر زکات

پلاٹینم ایک سفید قسم کی نہایت ہی قیمتی دھات ہے اور سونے سے بھی قیمتی مانی جاتی ہے۔ اور سفید سونا دراصل وہ زرد سونا ہی ہے؛ مگر اس میں کچھ چیزوں کی ملاوٹ سے اس کو سفید بنا دیا جاتا ہے۔ اور اس کا اطلاق دو قسم کے سونے پر ہوتا ہے: ایک اس سونے پر جس میں پلاٹینم ایک خاص تناسب کے ساتھ ملا کر اسے تیار کیا گیا ہو، اور دوسرے اس سونے پر جس پر پلاڈیم نامی کیمیکل کی پالش کر کے اس کو سفید بنایا گیا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ پلاٹینم اور سفید سونے پر زکات آئے گی، یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پلاٹینم اگر محض اپنے استعمال کے لیے ہو، تو اس پر زکات نہیں ہے؛ کیوں کہ دھات کتنی بھی قیمتی ہو، اس پر زکات عائد نہیں ہوتی، جیسے قیمتی پتھروں اور جواہرات پر بھی زکات نہیں ہے۔

ہاں! اگر وہ تجارت کے لیے ہو، تو جیسا کہ معلوم ہے کہ تجارت کے ہر مال پر زکات ہے؛ لہذا اس صورت میں اس پر بھی زکات عائد ہوگی۔

رہا سفید سونا تو جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ پلاٹینم دھات کے ملانے سے تیار ہوتا ہے، یا کیمیکل پلاڈیم کی پالش سے بنتا ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ محض پالش کی وجہ سے اس کے سونے میں کوئی فرق نہیں آتا؛ لہذا اگر محض پلاڈیم کی پولش ہوئی ہے، تو اس سفید سونے میں حسب قواعد زکات واجب ہے، خواہ وہ تجارت کے لیے ہو، یا استعمال کے لیے ہو۔

---

(۱) فقہ الزکاۃ: ۳۱۰/۱

اور اگر اس میں دوسری دھات کی ملاوٹ سے تیار کیا گیا ہو، تو اس کا حکم وہ ہے، جو ہم نے اوپر دوسری دھات سے مخلوط سونے چاندی کا بیان کیا تھا کہ جو غالب ہو، اس کا حکم اس پر لگے گا۔

روپے پیسے پاس ہوں یا کہیں رکھے ہوں، سب پر زکات ہے

یہ بات اوپر گزر گئی کہ روپئے پیسے پر بھی زکات ہے، یہ روپیہ، پیسہ اگر اپنے پاس جیب میں ہو یا کسی تجوری میں رکھا ہو، یا کسی بینک میں رکھا ہو، یا کسی کے پاس امانت رکھا ہو، سب کے اوپر زکات لازم ہوگی۔

بعض وقت آدمی اپنا مال کسی کے پاس امانت رکھتا ہے، یا بینک میں رکھتا ہے، یا کسی جگہ محفوظ کر دیتا ہے، مگر اس سے زکات کے مسئلے پر کوئی فرق نہیں پڑتا، ہر صورت میں زکات دینی ہوگی۔

کرنٹ اکاؤنٹ، فکسڈ اکاؤنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ کی رقم پر زکات

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ، فکسڈ اکاؤنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ میں رکھی گئی رقومات پر زکات کا کیا حکم ہے؟ اس کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان کھاتوں میں رکھی جانے والی رقومات کی حیثیت کیا ہے؟

اکثر لوگ جانتے ہیں کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں جو رقم رکھی جاتی ہے، اس کو بینک سے نکالنے کے لیے کوئی مدت مقرر ہوتی ہے، نہ کوئی مقدار مقرر ہوتی ہے؛ بل کہ اس کا مالک اپنی رقم کو جب چاہے اور جتنی چاہے اپنے اکاؤنٹ سے نکال سکتا ہے، اور سیونگ اکاؤنٹ میں بھی کوئی مقررہ مدت نہیں ہوتی، مگر یہاں ایک پابندی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی رقم جتنی چاہے، نہیں نکال سکتا؛ بل کہ اس کے لیے ایک حد مقرر ہوتی ہے کہ وہ ایک دن میں بس اتنی حد تک رقم نکال سکتا ہے، اور فکس ڈپازٹ میں ایک معینہ مدت تک کے لیے

رقم رکھی جاتی ہے اور اس مدت سے پہلے اس کو نکالنے کا اختیار نہیں ہوتا۔

اب سمجھنا یہ ہے کہ ان کھاتوں میں رکھی جانے والی رقم کی حیثیت شرعاً کیا ہے؟ اس سلسلے میں معاصر علماء کی دو رائیں ہیں:

(۱) اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ عام بینکوں میں ان تینوں قسم کے اکاؤنٹ میں رکھی جانے والی رقومات قرض کے درجے میں ہیں، گویا کہ ان رقومات کو رکھنے والے لوگوں نے بینک کو قرض دیا ہے اور یہ رقومات بینک کے ذمہ واجب الاداء ہیں۔

(۲) بعض علماء کے نزدیک بینک میں رکھی رقم امانت ہوتی ہے، کیوں کہ اس کو امانت کے طور پر ہی رکھا جاتا ہے اور عرف میں بھی اس کو امانت کہا جاتا ہے۔

لیکن پہلا قول ہی صحیح ہے اور اکثر علماء کا اختیار کردہ ہے اور خود اہل قانون بھی اس کو قرض ہی مانتے ہیں؛ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ تینوں قسم کے اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقومات قرض ہیں۔ اور اس پر امانت کا لفظ جو استعمال کیا جاتا ہے، وہ حقیقی معنیٰ میں نہیں، بلکہ مجازاً کہہ دیا جاتا ہے۔

دکتور احمد علی السالوس نے اپنی کتاب " حُکْمُ وَدَائِعِ البُنُوْک " میں قانون کے ماہرین سے یہی قول نقل کیا ہے۔ اور اخیر میں بطور خلاصہ لکھا ہے کہ

"بعد هذا كله نَقُولُ: إنّ ودائع البُنوك تُعْتَبَرُ قَرْضاً في نَظَر الشَّرع والقَانُون، والاتفاقُ هُنا بين الشرع والقانون من حيث الحُكْم على الودائع بأنَّهَا قَرْضٌ. " (۱)

اسی طرح شیخ عثمان شبیر نے "المعاملات المالية المعاصرة" میں لکھا ہے کہ:

"الوَدَائعُ النَّقْدِيّة بأنواعِها الثّلاثة كَيَّفَهَا أكثرُ القانونيين بأنَّهَا قَرْضٌ . وأمّا إطلاقُ وديعةٍ عليها فهو ليسَ على الحَقِيقَةِ؛

(۱) حکم ودائع البنوک: ۸۷

لأنّ البنک لا یأخُذُها کأمَانَةٍ یَحْتَفِظُ بِعَیْنِهَا لِتَرُدَّ إلی أصحَابِها و إنّمَا یستهلکها في أعْمالِه و یَلْتَزِمُ بِرَدِّ المثل ".(۱)

اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے اور سیر حاصل گفتگو حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی دامت برکاتھم نے اپنے ''فقہی مقالات'' میں کر دی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ بینکوں میں رکھی جانے والی رقومات کی حیثیت قرض کی ہے۔(۲)

لیکن یاد رہے کہ یہ حکم عام بینکوں کی رقومات کا ہے، رہی اسلامی بینکوں کی رقومات تو اس کا حکم اس سے کچھ الگ اور مختلف ہے، وہ یہ کہ کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم تو اسلامی بینکوں میں بھی قرض ہی ہوتی ہے؛ لیکن اسلامی بینک فکس ڈپازٹ اور سیونگ اکاؤنٹ میں جو رقم لیتے ہیں، وہ چوں کہ مضاربت یا مشارکت کی بنیاد پر لی جاتی ہے، اس لیے اس کا حکم عقد مضاربت کے رأس المال کا ہوگا، جیسا کہ شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب نے اپنے مقالات میں ثابت کیا ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اکثر علماء کے نزدیک بینکوں میں رکھی ہوئی رقومات قرض کے حکم میں ہیں اور بعض کے نزدیک امانت کے حکم میں ہیں، تو ان پر زکات فرض ہے اور ہر سال فرض ہے، بشرطے کہ وہ رقم نصاب کے برابر ہو۔ اگر اس کو امانت مانا جائے، تب تو بالکل واضح ہے اور اگر قرض ہے، تب بھی ان پر زکات ہے، کیوں کہ قرض کی رقم پر بھی زکات عائد ہوتی ہے، کیوں کہ قرض فقہاء کی اصطلاح میں دین قوی ہے اور دین قوی پر ہر سال زکات آتی ہے۔ ہاں! اس میں اتنی گنجائش ہے کہ فوری نہ دے؛ بل کہ جب مدت پوری ہونے پر بینک سے وصول کر لے، تب ادا کرے، مگر گذشتہ تمام سالوں کی زکات بھی ادا کرنی ہوگی؛ کیوں کہ یہ دین قوی ہے اور اس کا یہی حکم ہے۔

---

(۱) المعاملات المالیة المعاصرة:۲۶۵

(۲) دیکھو: فقہی مقالات:۳/۱۵-۲۰

انتباہ: بینک میں رکھی گئی رقم کی حیثیت چونکہ قرض کی ہے، اس لیے اس پر جو نفع دیا جاتا ہے، وہ حقیقت میں ربا یعنی سود ہے، جس کا لینا حرام ہے، اس لیے تمام علماء متفق ہیں کہ ان رقومات پر ملنے والا نفع شرعی لحاظ سے سود ہے اور قطعی حرام ہے۔

سیونگ سرٹیفکیٹ (N.S.C) کی زکات

حکومت کی جانب سے جو سیونگ سرٹیفکیٹ (N.S.C) جاری ہوتے ہیں اور لوگ اس کو اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ اس سے ان کے ٹیکس معاف ہوتے ہیں، تو اس میں لگی ہوئی رقم بھی قرض ہے، لہذا اگر وہ رقم نصاب کے برابر ہو، تو اس پر بھی سال گزرنے پر زکات واجب ہوجائے گی، لیکن ادائیگی میں اتنی گنجائش ہے کہ یہ رقم واپس حاصل ہوجانے کے بعد ادا کی جائے، جیسا اس پر بحث آگے آئے گی۔

حج یا شادی یا مکان بنانے کے لیے جمع کی گئی رقم پر زکات

یہیں پر ایک مسئلہ یہ سمجھ لیں کہ اگر کسی نے حج کے لیے رقم جمع کی تھی، ابھی حج کو گیا نہیں تھا کہ اس کی زکات کا سال پورا ہوگیا اور وہ رقم نصاب کے برابر ہو، تو اس رقم پر بھی زکات آئے گی، خواہ یہ حج کی رقم خود اپنے پاس جمع رکھا ہو یا اپنے کسی ساتھی یا گروپ لیڈر کے پاس جمع کر رکھا ہو، ہر صورت میں اس پر زکات آئے گی۔

اسی طرح اگر گھر بنانے کے لیے رقم جمع کی تھی اور ابھی وہ رقم گھر بنانے میں استعمال نہیں ہوئی تھی کہ زکات کا وقت آگیا اور وہ نصاب کی مقدار کے برابر ہو، تو اس رقم پر بھی زکات واجب ہوجائے گی۔ اسی طرح بچی کی شادی کے لیے رقم جمع کی تھی اور وہ نصاب کے برابر ہو، تو اس پر بھی سال گزرنے پر زکات واجب ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ آئندہ کی ضرورت کے لیے جمع کی گئی رقم پر زکات نہیں ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس رقم پر بھی سال بہ سال زکات لازم ہوگی۔

یہاں اس مسئلے میں فقہاء کے کلام میں کچھ تعارض جیسا لگتا ہے؛ اس لیے ہم نے اس کی وضاحت ''حاجت اصلیہ' کی بحث کے تحت تفصیل سے کردی ہے، جو آگے آرہی ہے۔

انشورنس میں لگائی گئی رقم پر زکات کا حکم

اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ جو رقم انشورنس کمپنی میں لگا رکھی ہے، اس پر زکات کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انشورنس میں جس رقم کا واپس ملنا یقینی ہوتا ہے، جیسے لائف انشورنس کے لیے جمع کی گئی رقم، تو چوں کہ یہ رقم واپس مل جاتی ہے؛ لہذا اس پر زکات فرض ہوگی، اور ہر سال جتنی بھی رقم جمع ہوئی ہے، اس کا حساب کر کے زکات دینا چاہیے؛ کیوں کہ یہ جمع شدہ رقم قرض کی رقم کی طرح ہے اور قرض کی رقم پر زکات واجب ہوتی ہے، جب کہ اس کا وصول ہونا یقینی ہو، جیسا کہ آگے یہ مسئلہ مستقل طور پر عرض کیا جائے گا۔ البتہ فوری طور پر اس کی زکات دینا لازم نہیں ہے، بل کہ جب وہ رقم واپس مل جائے، تو واپس ملنے کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی بھی زکات دینی ہوگی۔

اور انشورنس کی جس رقم کا واپس ملنا یقینی نہیں ہوتا، جیسے مکان، دکان، کار یا صحت کے انشورنس کی رقم کا حال ہے، تو اس پر زکات واجب نہ ہوگی اور اگر بعد میں وہ رقم مل جائے، تو ملنے کے بعد سال گزرنے پر اس پر زکات آئے گی، یا اپنے پاس پہلے سے نصاب کے برابر دوسرا مال موجود ہے، تو اس کے ساتھ اس کی زکات واجب ہوگی؛ کیوں کہ یہ رقم دینِ ضعیف کے حکم میں ہے اور دینِ ضعیف پر گذشتہ سالوں کی زکات واجب نہیں ہوتی۔ (الأول مبني على الدين القوي، والثاني على الضعيف)



بحث چہارم

مال تجارت کیا ہوتا ہے؟

بحث چھارم
مال تجارت کیا ہوتا ہے؟

اوپر جو زکوت کے اموال میں مال تجارت کا ذکر آیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی چیز آدمی نے اس نیت سے خریدی ہو کہ اس کو آگے فروخت کروں گا، تو وہ مال تجارت ہے۔

ہر مالِ تجارت پر زکات ہے

مال تجارت کوئی بھی ہو، اس پر زکات فرض ہے، مثلاً اگر کسی نے کوئی زمین کا پلاٹ خریدا، یا دکان یا مکان خریدا، یا کوئی سامان، اناج، غلہ یا پھل، ترکاریاں خریدا، یا کپڑا یا فرنیچر، یا کار، یا اسکوٹر خریدی، یا اور کچھ خریدا اور اس میں یہ نیت ہے کہ مجھے اس کو بیچنا ہے، تو وہ سب مال تجارت ہے اور سال گزرنے پر اس کی زکات دینا فرض ہو جائے گا۔

حضرت سمرہ بن جندب -رضی اللہ عنہ- سے حدیث مروی ہے کہ

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِيْ نُعِدُّ لِلْبَيْعِ .»(١)

(رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم ان تمام چیزوں میں زکات نکالیں جو ہم تجارت کے لیے رکھتے ہوں)

---

(١) أبوداود: كتاب الزكاة/باب العروض إذا كانت للتجارة، ح: ١٥٦٢. المعجم الكبير للطبراني: ٧/٣٠٤، ح: ٧٠٢٩ـ سنن البيهقي: ٧٥٩٧

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ

" الزَّكاةُ واجبةٌ في عُرُوْضِ التِّجارة كائنةً ما كانتْ إذا بَلَغَتْ قيمتُها نِصَاباً مِنَ الوَرِق أو الذَّهَب." (۱)

"الجوهرة النيرة" میں ہے کہ

"الزَّكاةُ واجبةٌ في عُرُوْضِ التِّجارة كائنةً ما كانت ، أي سَوَاء كانتْ من جِنْس ما تَجِبُ فيه الزكاةُ كالسَوَائم أو من غيره كالثِّيَاب والحَمِير ". (۲)

"فتاوى التاتارخانيه" میں ہے کہ

" ثم اتّفَقَ أصحابُنَا أنّ مَنْ مَلَكَ ما سِوَى الدَّرَاهِم والدَّنَانِير من الأموال بالشِّرَاء ، ونَوَى التجارةَ حالةَ الشِّرَاء أنه تَعْمَلُ نيتُه ويَصِيرُ المُشْتَرىٰ للتِّجَارِة. " (۳)

اوراگر خریدتے وقت یہ نیت تھی کہ ان چیزوں کواپنے ذاتی استعمال میں لاؤں گا، یا اپنے بچوں کے لیے استعمال میں لاؤں گا، تو وہ مال تجارت نہیں۔ جیسے مکان اپنے ذاتی استعمال کے لیے خریدا، یا کار اپنے استعمال کے لیے خریدا، تو اس پر زکات نہیں ہے۔

ہدایہ میں ہے کہ

"وليس في دُور السُّكْنىٰ وثِيَابِ البَدَن ، وأَثَاثِ المَنْزِل ودَوَابّ الرُّكُوب ، وعَبِيْدِ الخِدْمَة ، وسَلاحِ الاستعمال زَكَاةٌ ؛ لأَنَّهَا مَشْغُولَةٌ بالحَاجَة الأَصْلِية ، وليستْ بِنَامِيةٍ أيضاً ، وعلى هذا كُتُب العِلْم لأهلها وآلات المُحْتَرِفِيْن ؛ لِمَا قُلْنَا. "(۴)

(۱) الهداية: ۱۹۱/۲

(۲) الجوهرة النيرة :۳۰۴/۱، باب زكاة العروض

(۳) التاتارخانية: ۱۶۷/۳

(۴) الهداية : ۱۶۶/۲

سامان پیک کرنے کی تھیلیوں، عطر کی شیشیوں، جانور باندھنے کی رسیوں میں زکات

اس ضمن میں ایک مسئلہ اور بھی سمجھ لینا چاہیے کہ سامان پیک کرنے کی تھیلیوں اور عطر کی شیشیوں اور جانور باندھنے کی رسیوں میں زکات ہے، یا نہیں؟ اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ بیوپاری آدمی جو سامان بیچتا ہے، عطر فروش جو عطر فروخت کرتا ہے، اسی طرح جانور کا بیوپاری جو جانوروں کو فروخت کرتا ہے، وہ سامان کے ساتھ ان کو بھی بیچتا ہے، تو پیکنگ کی تھیلیوں اور عطر کی شیشیوں اور جانوروں کو باندھنے کی رسیوں پر بھی اس تاجر کو زکات دینی ہوگی، جس طرح سامان پر زکات دیتا ہے اور اگر وہ ان چیزوں کو بیچتا نہ ہو؛ بل کہ یوں ہی دے دیتا ہو، یا دیتا ہی نہ ہو، تو ان چیزوں کی زکات اس پر نہیں آئے گی، مگر تاجر لوگ عموماً ان چیزوں کی بھی قیمت لگایا کرتے ہیں؛ لہذا تاجروں کو یہ مسئلہ خوب سمجھ لینا چاہیے۔

فتاوی خانیہ اور فتاوی تاتارخانیہ میں ہے کہ

”وكذا النخّاسُ إذا اشتَرىٰ دَوَابَّ للبيع واشتَرىٰ لَها جِلالاً و مَقَاوِدَ ، فَإنْ كان لا يَدْفَعُ ذلك مع الدَّابَّة إلى المُشْتَرِي لا زكاةَ فيها، وإن كان يَدْفَعُها مع الدَّابَّة كان فيها الزكاةُ إذا حال عليها الحَوْل ، وكذا العَطَّارُ إذا اشتَرَى قَوَارِيرَ “. (١)

خریدتے وقت بیچنے کی نیت پکی نہیں تھی تو؟

اگر چیز خریدتے وقت اسے بیچنے کی پختہ نیت نہیں تھی؛ بل کہ یہ سوچ کر خریدا کہ ہو

(١) الخانية :١/٢٢١، التاتارخانية :٣/١٦٩

سکے تو ذاتی استعمال میں لاؤں گا اور اگر موقعہ ہوا، تو بیچ دوں گا، یعنی بیچنے کی پکی نیت نہیں تھی، تو وہ بھی مالِ تجارت نہیں؛ لہٰذا اس پر بھی زکات نہیں آئے گی، جب تک کہ وہ اس کو عملاً بیچ نہیں دیتا۔

اسی طرح اگر اس خیال سے خریدا کہ یہ چیز پڑی رہے، بعد میں دیکھا جائے گا کہ اگر کچھ نفع میں جائے، تو بیچ دوں گا، تو بھی اس پر زکات نہیں ہے؛ کیوں کہ بیچنے کی پکی نیت نہیں ہے۔

الدر المختار میں ہے:

" اشْتَرٰی شیئاً للقُنْیَةِ نَاوِیاً إنْ وَجَدَ رِبْحاً بَاعَه لازکاۃَ عَلَیْه ". (۱)

فتاویٰ خانیہ میں ہے کہ:

" اشْتَرٰی خَادِماً للخَدْمة وهو یَنْوِي أنّه لو أصَابَ رِبْحاً یَبِیْعُه فحَال علیه الحَوْلُ لا زَکَاةَ فِیْه ، وکَذَا لو اشْتَرَی جَوَالِقَ بِعَشْرَةِ آلاف دَرْهَمٍ لِیُؤَاجِرَهَا من النَّاسِ فحَالَ علیها الحَوْلُ لا زکاةَ فیها ؛ لأنَّه اشْتَرَاهَا لِلْغَلَّةِ وعَزْمُه أنّهُ لو وَجَدَ رِبْحاً یَبِیْعُهَا لا یُعْتَبَرُ ". (۲)

"التاتارخانیة" میں ہے کہ:

" وفي فَتَاوَی الشیخ الفَقِیْه أبيْ اللیثِ: إذا اشْتَرَی جَوَالِقَ بِعَشْرَةِ آلاف دَرْهَمٍ لِیُؤَاجِرَهَا من النَّاسِ فحَالَ علیها الحَوْلُ لا زکاةَ فیها ؛ لأنَّه اشْتَرَاهَا لِلْغَلَّةِ؛ لاَ لِلتِّجَارَةِ، فإن

---

(۱) الدر المختار:۱۹۵/۳

(۲) الخانیة :۲۲۱/۱

كانَ فِيْ نِيَّتِه أنّه يَبِيْعُها آخِراً، فَلا عِبْرَةَ لِهَذا. " (۱)

بیچنے کی نیت سے خریدا، پھر نیت بدل گئی

اسی طرح اگر ایک چیز مثلاً مکان خرید افروخت کرنے کی نیت سے، مگر خریدنے کے بعد اس کی نیت بدل گئی اور وہ اس کو اپنے ذاتی استعمال میں لگالیا، تو اس پر بھی زکات نہیں آئے گی۔

دُرَرالحکام میں ہے کہ

"لا يَبْقَى للتِّجارَةِ مَا اشْتَرَاه لَهَا ، فَنَوَى خِدْمَتَه ، ثُمَّ لا يَصِيْرُ للتِّجارَةِ وإنْ نَوَاهُ لَهَا مَا لَمْ يَبِعْهُ. " (۱)

اور" الدر المختار" میں بھی اسی کے مثل لکھا ہے کہ

" (لا يبقى للتجارة ما) أي عَبْدٌ مثلاً (اشْتَرَاه لَهَا فَنَوى) بعدَ ذَلِکَ (خِدْمَتَه ثُمَّ) مَا نَوَاه للخدمة (لا يَصِيْرُ للتِّجارةِ) وإنْ نواهُ لَهَا مَا لَمْ يَبِعْه بِجِنْسِ مَا فيه الزَّكَاةُ ". (۳)

"فتاوى التاتارخانيه" میں ہے کہ

" لَوْكانَ عَبْدٌ لِلتِّجارَة يَنْوِيْ أنْ يَكُونَ للخِدْمَة بَطَلَ عنه الزكاةُ بِمُجَرَّدِ النِّيَّةِ". (۴)

پلاٹ بنا کر بیچنے کے لیے جو زمین خریدی جائے اس پر زکات

جو زمین اس لیے خریدا کہ اس میں پلاٹ بنا کر بیچنا ہے، جیسے دس بیس ایکڑ زمین

---

(۱) التاتارخانية: ۱۶۹/۳
(۲) درر الحكام شرح غرر الأحكام: ۱۷۵/۱
(۳) الدر المختار: ۱۹۲/۳
(۴) التاتارخانية: ۱۶۶/۳

خریدا اور اس پر پلاٹ بنایا؛ تاکہ ان کو فروخت کیا جائے، تو وہ بھی مال تجارت ہے، لہذا اس پر بھی زکات عائد ہوگی۔ وھو واضح و ظاھرٌ۔

پہلے یہ حدیث بیان کی جا چکی ہے کہ حضرت سمرہ بن جندب-رضی اللہ عنہ- سے حدیث مروی ہے کہ: رسول اللہ-صلی اللہ علیہ وسلم- ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم ان تمام چیزوں میں زکات نکالیں، جو ہم تجارت کے لیے رکھتے ہوں۔

"الجوھرة النیرة" میں ہے کہ:

"الزَّكاةُ واجبةٌ في عُرُوْضِ التِّجَارة كائنةً ما كانت، أي سَوَاء كانتْ من جِنْس ما تَجِبُ فيه الزكاةُ كالسَوَائم أو من غيره كالثِّيَاب والحَمِير". (۱)

جو تجارتی زمین یا دکان، مکان بکتے نہ ہوں، ان کی زکات

یہاں ایک اہم سوال موجودہ دور میں یہ پیش آتا ہے کہ بعض اوقات تجارتی مقصد کے لیے خریدی ہوئی زمین، یا مکان، یا اور کوئی سامان بکتا نہیں ہے اور پڑا رہتا ہے، ان کا کوئی خریدار نہیں ملتا اور بعض وقت اس پر سالہا سال بھی گزر جاتے ہیں۔ خصوصاً جب کساد بازاری کا دور دورہ ہو، تو ایسے وقت میں ایک تاجر بسا اوقات ہمت بھی نہیں کرتا کہ وہ اپنا مال بیچ دے؛ کیوں کہ شدید ترین نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور اس وقت عموماً تجار لوگ بازار کی حالت کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے ہیں؛ تاکہ نقصان نہ ہو، یا نقصان کم سے کم ہو، اور اس انتظار میں کبھی سالہا سال لگ جاتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ ایسی اشیائے تجارت کی زکات کا کیا حکم ہے، آیا سال بہ سال دینی ہوگی، یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ جب یہ مکان، یا دکان، یا زمین تجارت کی نیت سے خرید کیا ہے، تو جمہور علماء و فقہاء، جن میں امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بھی ہیں، ان کے نزدیک

(۱) الجوھرة النیرة: ۱/۳۰۴، باب زکاة العروض

اس کی زکات ہر سال آئے گی، اس کے بکنے، یا نہ بکنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اور کئی سالوں تک بھی اگر چہ وہ نہ بکیں؛ کیوں کہ یہ مال تجارت ہے۔

ہاں! امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ ایسے مال تجارت کی زکات ہر سال واجب نہیں؛ بلکہ مال بکنے کے بعد صرف ایک سال کی زکات دی جائے گی۔

امام مالک کے مسلک میں تاجر کی دو قسمیں ہیں: ایک کو وہ مدیر اور دوسرے کو محتکر کہتے ہیں۔ مدیر وہ تاجر ہے، جو قیمت کے بڑھنے کا انتظار کیے بغیر روز روز خریدتا بیچتا رہتا ہے۔ اور محتکر وہ ہے جو کسی چیز کو خریدنے کے بعد اس کی قیمت کے بڑھنے کا انتظار کرتا رہتا ہے اور جب قیمت بڑھ جاتی ہے، تو فروخت کر دیتا ہے۔

چنانچہ علامہ ابن جزی نے ''القوانين الفقهية'' میں لکھا ہے کہ

" ثم إن التجارةَ على ثَلاثَةِ أنْوَاع : إدَارَةٌ ، واحْتِكَارٌ، و قَرْضٌ . فأما المُدِيْرُ فهو الَّذِي يَبِيْعُ ويَشْتَرِيْ ولا يَنْتَظِرُ وَقْتاً وَلَا يَنْضَبِطُ له حولٌ كأهْل الأسْواق..............وأما غيرُ المُدِيْر وهو الَّذِي يَشْتَرِي السلعَ ويَنْتَظِرُ بِهَا الغَلاءَ ".(۱)

اور تاجر مدیر کا حکم ان کے یہاں یہ ہے کہ وہ ہر سال میں کوئی ایک ماہ اس کے لیے مقرر کر کے اس میں سال بہ سال اپنے سرمائے کی زکات دے گا۔ اور محتکر کا حکم ان کے یہاں یہ ہے کہ اس پر اس وقت تک زکات نہیں، جب تک کہ وہ مال بک نہ جائے اور جب وہ مال بک جائے، تو بکنے کے بعد اس کی قیمت میں سے ایک سال کی زکات دے گا۔

ابن جزی " القوانين الفقهية'' میں محتکر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فلا زكاةَ عليه حَتّٰى يَبِيْعَهَا ، فإنْ بَاعَهَا بعدَ الحَولِ أو أحْوَالٍ زَكّٰى الثمنَ لِسَنَةٍ وَاحِدَةٍ. ''(۲)

(۱) القوانين الفقهية:۱/۷۰، الباب الخامس في التجارة

(۲) القوانين الفقهية :۱/۷۰

اورعلامہ جزری نے "الفقهُ على المَذَاهِبِ الأربعة " میں مالکیہ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"وأمّا كيفيةُ زَكاةِ عَرَضِ التِّجَارةِ ، فإنْ كانَ التَّاجِرُ مُحْتكِراً فَيُزَكِّيْ مَا بَاعَ به من النقدين مَضْمُوماً إلى ما عِنْدَه منها لِسَنَةٍ وَاحِدةٍ فقط، ولو أقامت العُرُوْض عِنْدَه أعْوَاماً ". (۱)

اورعلامہ ابوالطاہر التنوخی المالکی نے لکھا ہے کہ:

" فإنْ كانتِ العُرُوْضُ يُتَرَصَّدُ بها الأسواق وزيادتها ، فلاتجبُ الزَّكاةُ حَتّٰى تُبَاعَ ، فتَجِبُ حينئذٍ إن تَمّ الحَوْلُ ، أو يُنْتَظَرُ تمامُه إن لم يَتِمّ ، ولو أقامتْ أحوالاً لَمْ تُبَعْ لَمْ تَجِبْ إلا زَكاةٌ واحدةٌ ؛ وهذا لأنّ الزكاةَ قَدْ فهم من الشريعة أنَّهَا متعلقةٌ بالنَّمَاء وبالعَيْنِ لا بِالعُرُوْضِ، فإذا قامتْ أحوالاً لم تُبَعْ ؛ فإنَّه لم يَحْصُل فيها النَّمَاءُ إلا مرةً واحدةً ، فلا تجبُ إلا زكاةٌ واحدةٌ . وهي قبلَ البَيْعِ عرضٌ ، والزَّكاةُ لا تتعَلَّقُ بالعُرُوْض ، فإذا باع وجَبَتِ الزكاةُ."(۲)

امام مالک کے مسلک کا خلاصہ یہ ہے کہ جس تجارت میں تاجر خریدتا بیچتا رہتا ہے اور قیمت کے بڑھنے کا انتظار نہیں کرتا، جیسے عام طور پر دکان دار لوگ اور پھیری والے لوگ روزمرہ کی چیزیں: اناج وغلہ، مسالہ جات، سبزیاں، گھریلو استعمال کی چیزیں، کپڑے، وغیرہ کو حاضر قیمت پر فروخت کرتے ہیں، تو اس قسم کے مال پر سال میں ایک بار زکات واجب ہوگی، جس طرح جمہور کے نزدیک ہے؛ لیکن اگر تجارت ایسی ہو، جس میں تاجر

---

(۱) الفقه على المذاهب الأربعة :۵۵۲/۱

(۲) التنبيه على مبادئ التوجيه:۸۰۲/۲

اپنے مال کو قیمت کے بڑھنے کے انتظار میں روکے رکھتا ہے اور قیمت کے بڑھنے پر فروخت کرتا ہے، جیسے زمینیں، مکانات، وغیرہ، تو اس مال کی زکات اس وقت واجب ہوتی ہے جب وہ مال بک جائے اور بکنے کے بعد صرف ایک سال کی زکات واجب ہوگی۔

پھر یہاں حضرات فقہائے مالکیہ میں ایک مسئلہ یہ زیر بحث آیا ہے کہ اگر کسی مدیر (روزمرہ چیزوں کو خریدنے اور بیچنے والے) کا مال کساد بازاری کا شکار ہوجائے اور نہ بکے، تو وہ محتکر کے حکم میں ہوجائے گا، یا نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ محتکر کے حکم میں نہیں ہوگا، تو مال بکے، یا نہ بکے، اس کو زکات دینی پڑے گی، اور اگر وہ محتکر کے حکم میں ہوجائے گا، تو وہ بھی مال کے بکنے تک اس کی زکات نہیں دے گا، بکنے کے بعد دے گا۔ اس سلسلے میں مالکیہ کی دو رائیں ہیں:

علامہ ابوالطاہر التنوخی المالکی نے لکھا ہے کہ

"وإذا بَارَتْ عُرُوضُ المُدِيْر فهلْ يَخْرُجُ بذلك عن حُكْمِ الإدَارَةِ ويَرْجِعُ إلى النَّوْعِ الأوَّل الَّذِيْ تَجِبُ فيه الزكاةُ بالبيع ؟ في المَذْهَبِ قَوْلان."(۱)

امام ابن الماجشون اور امام سحنون اور امام ابن نافع نے اس کو محتکر کے حکم میں مانا ہے، جب کہ امام ابن قاسم کہتے ہیں کہ یہ محتکر نہیں ہوگا۔ اور پھر بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ نہ بکنے والا مال چاہے کم ہو یا زیادہ ہو، دونوں صورتوں کا ایک ہی حکم ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ نہ بکنے والا مال زیادہ ہو تب یہ حکم ہے، تھوڑے بہت مال میں یہ حکم نہیں ہے۔(۲)

معاصرین فقہاء میں سے شیخ یوسف القرضاوی نے لکھا ہے کہ جمہور کا مسلک دلیل کی رو

---

(۱) التنبيه على مبادئ التوجيه:۸۰۴/۲

(۲) دیکھئے: التبصرة للإمام اللخمي:۸۹۷/۲، التوضيح في شرح مختصر ابن الحاجب:۴۹/۲، عقد الجواهر الثمينة فى مذهب عالم المدينة:۳۱۸/۱

سے اقوی وراجح ہے، لیکن امام مالک کے مسلک کو بعض خاص حالات میں ضرورت کی بنا پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔

شیخ یوسف القرضاوی کی عبارت یہ ہے:

" ومَع هٰذَا قَدْ يَكُونُ لرأيِ مَالِكٍ و سحنون مجالٌ يُؤْخَذُ به فيه، وَذٰلِكَ في أحْوالِ الكَسَادِ والبَوَارِ، الَّذِيْ يُصِيْبُ بعضَ السِّلَعِ في بَعْضِ السِّنِيْن ، حَتّٰى لَتَمُرُّ الأعْوَامُ ، ولا يُبَاعُ منها إلا القَلِيْلُ . فَمِنَ التَيْسِيْر والتَّخْفِيْفِ على من هٰذِه حَالُه ألّا تُؤْخَذَ منهُ الزكاةُ إلاّ عَمَّا يَبِيْعُه فِعْلاً ، على أنْ يُعْفٰى عَمَّا مَضٰى عليه مِنْ أعْوامِ الكَسَادِ ، وذلك لأنّ ما أصَابَهُ لَيْسَ بِاخْتِيَارِه ولا مِنْ صُنْعِ يَدِه. "(۱)

اور اسی کو شیخ مصطفیٰ الزرقاء نے بھی اپنے فتاوی میں اختیار کیا ہے؛ چناں چہ جب ان سے نہ بکنے والے مالوں کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انھوں نے ایک تفصیلی فتوی لکھا، جس میں فرمایا کہ:

"إنّ ما سَألْتَنِي عنه منْ رأيِي في زكاة البَضَائِع الكَاسِدَة والتَّاجِر المُتَرَبِّص ، رأيِي فيه من القديم هو مَذهَبُ مَالِكٍ – رضي الله عنه –........ فأنَا أُفْتِيْ به دَائماً تَيْسِيْراً على النَّاسِ ولا سيما فِيْ العقاراتِ ،حَيْثُ يَكْثُرُ فيها المُشْتَرُوْن المُتَرَبِّصُوْنَ في عهد التَضَخُّم النَقدِي العَام اليَوْمَ . " (۲)

احقر کہتا ہے کہ جمہور کا مسلک اگر چہ اس میں قوی وراجح ہے، لیکن اگر کساد بازاری

(۱) فقه الزكاة: ۳۳۵/۱

(۲) فتاوی الشیخ الزرقاء: ۳۴/۲

کے دور میں اس قول کو اختیار کیا جائے ،تو مناسب معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ آج کل ایسے حالات خاص طور پر زمینوں اور فلیٹ و مکانات کے کاروبار میں کثرت کے ساتھ پیش آتے ہیں اور تاجر لوگوں کو اس میں نہ صرف یہ کہ نفع نہیں ہوتا؛ بل کہ بسا اوقات شدید گھاٹے سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے؛ لہذا کساد بازاری کے وقت میں اس کو اختیار کیا جانا مناسب ہے۔

لیکن یہ علی الاطلاق نہیں ،بل کہ میں سمجھتا ہوں کہ مال نہ بکنے کی دو حالتیں ہیں:

(۱) ایک عام حالت جس میں کسی کسی تاجر کو کبھی کبھی ایسی نوبت آتی ہے کہ کسی وجہ سے مال کے لیے گاہک نہیں ملتا اور وہ مال بکے بغیر پڑا رہتا ہے۔ یہ ایک انفرادی صورت حال ہے ،اس صورت میں تو جمہور کے مسلک کے مطابق زکات ہر سال واجب ہونا چاہیے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ کساد بازاری کا دور دورہ ہو، جس کی وجہ سے سبھی تاجر عموماً اس کا شکار ہو رہے ہوں ،تو اس میں امام مالک کے مسلک کو اختیار کیا جانا مناسب ہے، اور اس میں بھی فقہائے مالکیہ کی یہ رائے اختیار کی جائے کہ مال کا سِد زیادہ ہو، معمولی و مختصر نہ ہو؛ تا کہ اگر ایک جانب جمہور کے مسلک سے زیادہ سے زیادہ قربت باقی رہے، تو دوسری جانب تجار پر کچھ آسانی و تخفیف ہو جائے۔

لہذا حاصل یہ ہے کہ مالکیہ کے مسلک کے مطابق کساد بازاری کے دور میں نہ بکنے والا مال اگر زیادہ اور کثیر ہے، تو اس کی زکات اس کے بکنے کے بعد واجب ہوگی اور صرف ایک سال کی واجب ہوگی اور اس سے پہلے کے سالوں کی واجب نہ ہوگی اور اگر مال معمولی اور مختصر ہے، تو سال بہ سال اس کی زکات دینی ہوگی ۔ واللہ اعلم۔

معدنیات، گرانئیٹ ، ماربل ، ریت کی کانوں پر زکات

زمین سے گرانئیٹ اور ماربل نکال کر جو لوگ کاروبار کرتے ہیں ، ان کے لیے زکات کا کیا حکم ہے؟ اسی طرح ریت نکال کر جو لوگ بیچتے ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟ کیا اس

کومعدنیات کاحکم ہوگا،یامال تجارت کا؟

سب سے پہلے یہاں معلوم ہونا چاہیے کہ معدنیات کے سلسلے میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے کہ اس پرآیازکات واجب ہوگی،یاخمس یعنی اس کاپانچواں حصہ؟اسی طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ کونسے معادن میں کیاواجب ہے،اور یہ کہ کتنی مقدارواجب ہے؟

ہم یہاں صرف علمائے حنفیہ کا مسلک ذکرکرتے ہیں ، یہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ: کانوں سے حاصل ہونے والی چیزیں تین قسم کی ہوتی ہیں:

(۱)ایک وہ جوجامد ہوں اوران کوپگھلانااورکسی شکل میں ڈھالناممکن ہو،جیسا سونا، چاندی،لوہا،پیتل وغیرہ۔

(۲)دوسرے وہ جوجامدتوہوں،مگران کوپگھلانااورڈھالناممکن نہ ہو،جیسے مختلف قسم کے پتھر،یاقوت،زبرجد،بلور،عقیق،سرمہ،چونا،گچ،وغیرہ۔

(۳) تیسرے وہ چیزیں ہیں جوسیال یعنی بہنے والی ہوں،جیسے پانی،تیل، پٹرول، تارکول،وغیرہ۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک پہلی قسم کے معدنیات میں خمس (اس کا پانچواں حصہ) واجب ہے، جواسلامی حکومت کا حق ہوگا،خواہ وہ اپنی ذاتی زمین میں دریافت ہوا ہو،یا کسی نے سرکاری زمین میں اس کا کھوج لگایا ہو۔اور جوخمس سے زائد ہے،وہ اسی کا ہے جس کی زمین ہے،یاجس نے اس کاکھوج لگایاہے۔

اوردوسری دوقسم کے معدنیات میں کچھ واجب نہیں اور یہ سب کا سب اس کا حق ہے جس نے اس کودریافت کیاہو۔(۱)

یہ توحکم ہے معادن یعنی کانوں کا ،لیکن ہمارے یہاں عام طور پر گرائنیٹ اور ماربل،پتھر،ریت،وغیرہ کے معادن اورکانوں کی مالک حکومتیں ہوتی ہیں اورحکومتیں ان

(۱) بدائع الصنائع:۲/۶۷، فتح القدیر:۲/۵۲۱،حاشیۃ الجلبی علی تبیین الحقائق :۱/۲۸۸

معادن کوایک مدت کے لیے بعض کمپنیوں، یا افراد کو لیز پر فراہم کرتی ہیں اور یہ کمپنیاں، یا افراد اس مدت تک ان کانوں اور معادن سے نفع اٹھاتے ہیں اور ان کی مدت ختم ہونے پر ان کا معاہدہ ختم ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس صورت میں ان کا حکم کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ چوں کہ یہ کمپنیاں اور افراد ان معادن سے نکلنے والی چیزوں کو فروخت کرتے ہیں، لہٰذا یہ لوگ جس قدر گرانئیٹ، یا ماربل، یا پتھر ان کانوں سے نکالتے ہیں، وہ مال تجارت شمار ہوتا ہے اور مال تجارت میں زکات واجب ہوتی ہے، لہٰذا ان پتھروں کی مالیت پر سال بہ سال زکات دینا ہوگا۔

چناں چہ امام سرخسی نے معادن سے نکلنے والی چیزوں پر زکات نہ ہونے کے سلسلے میں ایک حدیث: " لا زَكَاةَ فِي الحَجَر " (پتھر میں زکات نہیں) کو نقل کر کے فرمایا کہ:

"ومَعْلُوْمٌ أنّه لَمْ يُرِدْ بِهِ إذَا كَانَ لِلتِّجَارَةِ ، وإنَّمَا أرَادَ بِهِ إذَا اسْتَخْرَجَه مِنْ مَعْدَنِه ". (۱)

معلوم ہوا کہ جہاں فقہاء نے معدنیات پر عدم زکات کا ذکر کیا ہے، وہاں مراد یہ ہے کہ اگر وہ تجارت کے لیے نہ ہوں، اور اگر تجارت کے لیے ہوں، تو ان پر زکات عائد ہوگی۔

اب رہا یہ کہ اس کی زکات کس حساب سے دینی ہوگی؟ احقر کو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ماربل یا گرانئیٹ اور دیگر پتھر اور ریت وغیرہ، چوں کہ یک دم ان کے ہاتھ نہیں آجاتا؛ بل کہ بلاسٹنگ کے ذریعے جیسے جیسے اس کو توڑا اور کھودا جاتا ہے، ویسے ویسے حاصل ہوتا رہتا ہے اور جب تک وہ کھودا اور توڑا نہ جائے، ان کے ہاتھ نہیں آتا، لہٰذا جس قدر مال سال میں ان کے ہاتھ آجائے، بس اتنی مقدار کی ان کو زکات دینی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

کنویں کا پانی اگر فروخت کیا جائے، تو اس کی زکات

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر زمین سے پانی کا خزانہ ملا، جیسے کنواں تو اس میں

(۱) المبسوط للسرخسي: ۲۱۲/۲

زکات نہیں۔ امام محمد نے "الاصل" اور "السیر الصغیر" میں صراحت کی ہے کہ

"وأمَّا المِلْحُ ونَحْوُه فلاَ شَيْءَ فيه، وكَذٰلك القِيْرُ والنِّفْطُ إنَّمَا كانَ ذٰلك بِمَنْزِلَةِ المَاءِ ولا شَيْءَ فيه ."(۱)

علامہ سمرقندی نے "تحفۃ الفقہاء" میں لکھا ہے کہ

"وأما إذا كان مَعْدِنُ القِيْرِ والنِّفْطِ فلا شَيْءَ فيه ، ويَكُوْنُ للوَاجِدِ ؛ لأنّ هٰذَا ماءٌ". (۲)

امام محمد کے کلام میں اور دیگر فقہاء کے بیانات میں تیل اور تارکول میں کچھ واجب نہ ہونے کی علت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ یہ پانی کی طرح ہے، اس سے یہ بات نکل آئی کہ پانی میں کچھ واجب نہیں ہے۔

لہذا کسی کے پاس کنواں ہو، تو اس پر اس میں کچھ زکات، یا خمس واجب نہیں ہے؛ لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ وہ اس پانی کو فروخت نہ کرتا ہو اور اگر وہ اس کو فروخت کرتا ہو، تو اس میں بھی زکات واجب ہوگی؛ کیوں کہ اس صورت میں یہ مال تجارت میں شامل ہو جائے گا۔

رہا یہ سوال کہ وہ کس قدر پانی کی زکات دے گا،؛ کیوں کہ پانی تو نکلتا رہتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سال بھر میں وہ جتنا پانی نکال کر فروخت کرے، اس قدر پانی کی زکات دینی ہوگی؛ کیوں کہ پانی جو کنویں میں موجود ہے، کنویں والا فی الحال اس پانی کا مالک نہیں ہوتا؛ بل کہ اس وقت مالک ہوتا ہے، جب کہ وہ پانی کو کنویں سے نکال لے اور اپنے قبضے میں کر لے۔ اور اسی لیے کنویں ہی میں رہتے ہوئے اس کے پانی کی فروخت کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ وہ ابھی اس کی ملک ہی میں نہیں۔

(۲) الأصل :۵۶۸/۷، السیر الصغیر :۲۸۱

(۲) بدائع الصنائع:۵۲۹/۱

چناں چہ فقہاء حنفیہ نے اس کی تصریح کی ہے، امام شامی نے ''ردالمحتار'' میں فرمایا کہ

''وقال الرملي: إنَّ صَاحِبَ البِئرِ لا يَمْلِكُ المَاءَ . . .
..... و هٰذَا مَا دَامَ فِيْ البِئرِ ، أمّا إذا أخْرَجَهُ مِنها بالِاحْتِيَالِ كَمَاْ فِيْ السَّوَانِي، فَلا شَكَّ في مِلْكِه لِحِيَازَتِه لَه فِيْ الكِيْزَان ، ثُمَّ صَبّه فِيْ البِرَكِ بعدَ حِيَازَتِه''. (۱)

اور ''فتاوی الولوالجيه'' کی عبارت یہ ہے کہ:

''ولو نُزِحَ ماءُ بئرٍ بِغَيْرِ أمرِه حَتّٰى صَارَتْ يَابِسَةً، لاشَيْءَ عليه لأنَّ صاحبَ البئرِ غيرُ مَالكٍ لِلمَاءِ''. (۲)

بلکہ خود امام محمد نے'' کتاب الأصل ''میں ایک مسئلے کی تعلیل کرتے ہوئے اس کی تصریح کی ہے کہ

''أنّ رَبَّ الشرْبِ لا يَمْلِكُ الماءَ ولا يَجُوزُ بيعُه فيه''. (۳)

الغرض کنویں کی دیواروں اور متعلقہ چیزوں کا تو وہ مالک ہوتا ہے، مگر پانی کا مالک نہیں ہوتا اور اسی لیے کنویں میں ہوتے ہوئے پانی کا فروخت کرنا جائز نہیں؛ کیوں کہ وہ ابھی اس کی ملکیت میں نہیں آیا، ہاں جب وہ پانی کسی بھی طریقے سے نکال لے جیسے بورویل لگا کر، یا موٹر لگا کر، یا ڈول سے، تب وہ اس کا مالک بنتا ہے۔

اس تفصیل سے بتانا یہ ہے کہ کنویں کے پانی کی زکات کا حساب اس پانی سے سے لگایا جائے گا جو کنویں سے نکال کر فروخت کیا گیا ہے، لہذا سال بھر کا حساب دیکھ کر اس کی زکات دی جائے گی۔ واللہ اعلم۔

---

(۱) رد المحتار:۲۵۸/۷، باب البيع الفاسد
(۲) فتاوى الولوالجية :۳۴/۱
(۳) كتاب الأصل:۱۶۲/۸

سمندری معدنیات، لؤلؤ، مرجان، عنبر وغیرہ میں زکات

اسی سے ملتا جلتا مسئلہ سمندری معدنیات کا ہے، جیسے لؤلؤ، موتی، مرجان، عنبر وغیرہ، ان کے بارے میں ائمہ میں اختلاف ہے کہ ان میں زکات ہے، یا نہیں؟ اس میں امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ سمندری معدنیات میں کچھ بھی واجب نہیں، نہ زکات، نہ خمس اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ ان میں بھی خمس واجب ہے۔

"الدر المختار" اور "شامي" میں ہے کہ

"وكذا جَمِيعُ ما يُسْتَخْرَجُ منَ البَحْر مِن حِلْيَةٍ ولو ذَهَباً كان كَنْزاً في قَعْرِ البَحْر . قال الشَّامِي: ولَو كَانَ ما يُسْتَخْرَجُ من البَحْرِ ذَهَباً مَكْنُوزاً بِصُنْعِ العِبَادِ في قَعْرِ البَحْرِ؛ فإنَّهُ لا خُمُسَ فيهِ وكُلُّهُ لِلوَاجِد". (۱)

اور "المحيط البرهاني" میں فرمایا کہ

" ولا خُمُسَ في الذَّهَب والفِضَّة يُسْتَخْرَجَان من البَحْر وكذلک جَمِيعُ ما يُسْتَخْرَجُ مِنَ البَحْرِ كالعَنْبَرِ واللُّؤلُؤ، فلاخُمُسَ فيه، ليسَ بِغَنِيْمَةٍ". (۲)

اور" الاختيار لتعليل المختار" میں ہے کہ:

"ولا شَيْءَ فِيْمَا يُسْتَخْرَجُ مِنَ البَحْر كاللُّؤلُؤ والعَنْبَر والمَرْجَان.......... وقال أبُو يُوسُف: فِيْهِ الخُمُس الخ". (۳)

لیکن یہاں بھی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اس وقت ہے کہ ان چیزوں کو محض اپنے استعمال

(۱) الدر المختار مع رد المحتار :۲۶۰/۳، باب الركاز

(۲) المحيط البرهاني:۶۸/۲

(۳) الاختيار لتعليل المختار:۱۱۵/۱

میں لایا جائے اوران سے تجارت کا قصد نہ ہو، اور اگر ان کی تجارت کا قصد ہو، تو یہ بھی مال تجارت کا حکم پا کر قابل زکات اموال میں شمار ہوں گے۔

لہذا آج کل جو لوگ ان سمندری معدنیات کو اس لیے نکالتے ہیں کہ ان سے تجارت کریں گے، تو ان کو سال بہ سال ان کی زکات دینی ہوگی۔

تجارتی مچھلیوں اور جھینگوں کی زکات

مچھلیوں اور جھینگوں میں زکات ہے، یا نہیں؟ اس میں یہ بات واضح ہے کہ جو لوگ مچھلیوں اور جھینگوں کو پالتے ہیں یا ان کا شکار کرتے ہیں، اگر ان کا مقصد محض یہ ہو کہ اپنے استعمال میں لایا جائے، تو ان میں زکات نہیں ہے؛ کیوں کہ شریعت نے جن جانوروں کے پالنے پر ان پر زکات عائد کی ہے، مچھلیاں اور جھینگے ان میں سے نہیں ہیں، اور یہ بات مقرر ہے کہ اموال زکات کوئی اپنی جانب سے طے نہیں کر سکتا؛ بل کہ یہ تو توقیفی چیز ہے کہ شریعت میں جن کو اموال زکات قرار دیا گیا ہے، وہی اموالِ زکات ہوں گے۔ بلہذا مچھلیوں اور جھینگوں پر زکات نہیں۔

لیکن اگر ان کا شکار تجارتی مقصد سے کیا جائے، یا ان کی خریدی آگے بیچنے کے لیے ہو، یا ان کو اسی مقصد سے با قاعدہ پالا جاتا ہو، جیسے آج بہت سے لوگ تالاب بنا کر ان کو پالتے ہیں اور مقصد تجارت ہوتا ہے، تو ان میں حسب قاعدہ زکات واجب ہوگی؛ کیوں کہ یہ اس صورت میں مال تجارت میں داخل ہیں۔

اور آج یہ مچھلیوں اور جھینگوں کا کاروبار دنیا کے بڑے کاروباروں میں داخل ہے اور اس میں لگے ہوئے لوگوں کے یہاں لاکھوں اور کروڑوں کا کاروبار اس میں چلتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس میں زکات ضرور واجب ہوگی۔

مرغیوں کے فارم اور انڈوں کی زکات

مچھلیوں اور جھینگوں کی طرح آج کل مرغیوں کا کاروبار بھی بہت بڑا کاروبار ہے

اور مستقل ان کے فارم تیار ہوتے ہیں؛ تا کہ ان کی نسل کو بڑھایا جائے اور پھر ان کی تجارت کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ ان میں زکات ہے، یا نہیں؟ یہاں بھی وہی بات سمجھ لینی چاہیے کہ شریعت میں جن جانوروں پر زکات عائد کی گئی ہے، ان میں مرغیاں نہیں ہیں؛ لیکن یہ اصول بار بار پیش کیا گیا ہے کہ کوئی بھی چیز تجارتی مقصد سے لی جائے، تو اس میں زکات واجب ہوتی ہے، لہٰذا جہاں بھی لوگ اس کو تجارتی مقصد سے پالتے ہیں، یا خریدتے ہیں، تو ان پر زکات واجب ہوگی۔

اور انڈوں کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر مرغیاں پال کر ان سے انڈے خود کے استعمال کے لیے حاصل کرے، تو ان مرغیوں میں زکات نہیں اور انڈوں میں بھی زکات نہیں؛ لیکن اگر اپنی مرغیوں سے، یا دوسروں سے انڈوں کو تجارتی مقصد سے لیا جائے، تو انڈوں پر زکات واجب ہے، ہاں! اس صورت میں انڈوں کے لیے پالی ہوئی مرغیوں پر زکات نہیں آئے گی۔ (۱)

تجارتی دودھ میں زکات

اسی طرح دودھ کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی دودھ کا کاروبار کرتا ہے، خواہ اپنی گائیوں، بھینسوں سے نکال کر ہو، یا دوسروں سے خرید کر ہو، ہر صورت میں اس میں زکات واجب ہے؛ کیوں کہ یہ مال تجارت ہے۔

کمپنی کے شیئرز کی زکات

شیئرز پر زکات کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ اس بارے میں علمائے معاصرین کے مابین کئی طرح سے اختلاف پایا جاتا ہے:

(۱) ایک تو اس لحاظ سے اختلاف ہے کہ شیئر کمپنی میں شیئر خریدنے والا کس مقصد

(۱) دیکھو: احسن الفتاوی:۳۱۱/۴، فتاوی رحیمیہ:۱۶۱/۷

سے شیئر خریدتا ہے؟ آیا محض نفع کھانے اور اپنے روزمرہ کی اپنی ضروریات کے پورا کرنے لیے ہے، یا اس مقصد سے کہ اس سے تجارت قائم کرے اور اس کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے فائدہ اٹھائے؟

بعض معاصرین علماء کی رائے یہ ہے کہ اگر شیئر خریدنے والے کا مقصد محض اس کا منافع کھانا ہو اور ضروریات زندگی کو پورا کرنا ہو، تو اس قسم کے شیئر کی زکات مال شرکت کی طرح سے دی جائے گی، کہ شیئر کا جو حصہ اثاثے کی شکل میں ہے، اس پر زکات نہیں آئے گی اور جو تجارت کا مال ہے یا نقدی ہے، اس پر زکات عائد ہوگی؛ کیوں کہ جب کوئی شیئر خریدتا ہے، تو اس کا کچھ حصہ کمپنی کے اثاثوں (Assests) میں لگتا ہے، جیسے بلڈنگ یا فرنیچر، یا مشنری وغیرہ، اور کچھ حصہ نقد پیسوں (Liquid) کی شکل میں رہتا ہے، یا کمپنی کے سامان تجارت میں لگا ہوتا ہے، خواہ وہ خام مال کی شکل میں ہو یا کوئی پروڈکٹ کی شکل میں، تو جتنا حصہ اپنے شیئر کا بلڈنگ یا مشنری میں لگا ہے، اس پر زکات نہیں آئے گی؛ کیوں کہ یہ مال تجارت نہیں ہے۔ اور جو نقدی کی شکل میں ہے، یا خام مال جس کی تجارت ہوتی ہے، یا کوئی پروڈکٹ جس کو فروخت کیا جاتا ہے، کی شکل میں ہے، اس پر زکات آئے گی؛ کیوں کہ یہ سب مال تجارت ہے۔

اور اگر شیئر خریدنے والے کا مقصد یہ ہے کہ میں میرے شیئر کو قیمت بڑھنے پر فروخت کردوں گا اور اس کے اتار چڑھاؤ سے فائدہ اٹھاؤں گا، تو یہ شیئر بھی مال تجارت ہے اور اس قسم کے شیئر کی پوری قیمت اور ویلیو پر بھی زکات آئے گی، خواہ اس کا حصہ کسی بھی شکل میں ہو۔

اسی کو شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی نے اپنے رسالے ''آپ زکات کس طرح ادا کریں'' میں اختیار کیا ہے۔ (۱)

---

(۱) دیکھو: آپ زکات کس طرح ادا کریں: ۳۲

نیز شیخ ڈکتور صدیق الضریر کی بھی یہی رائے ہے جیسا کہ ان کے مقالے مندرجہ "مجلة الفقه الإسلامي "میں ہے۔(۱)

اور شیخ عبداللہ البسام نے بھی اسی کو لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ

"إنّ بَعضَ المُسَاهِمِيْن يَتَّخِذُ الأسهمَ للاتِّجَار والتَّعامُل بقَصْدِ الرِبْح ، وأنّ بعضَهم يَتَّخِذُهَا للاقْتِنَاءِ والكَسْبِ من غَلاتِهَا ، لا للاتِّجَار فيها. فأمّا القِسْمُ الأوّلُ : فهذا تُعْتَبَرُ الأَسْهُمَ عندَه عُرُوْضَ تِجَارةٍ و تعامُلٍ في البُوْرْصَةِ بالبيع والشِّرَاء ، فيَكُونُ حُكْمُها حُكْمَ عُرُوْض التِّجَارة، فتُؤْخَذُ الزكاةُ منها بقَدرِ قيمتِها في نهايةِ العَام الّذِي ملكتْ فيه وذلک كُلّ عام حينما يَدُوْر حَوْلُها . وأما القِسْمُ الثاني : فإنَّ الزكاةَ تُؤخَذُ من أربَاحِهَا ، وأمَّا الأسْهُمَ نفسُها فتُعْتَبَرُ كالعِقَار المُعَدّ للإيْجَارِ تَكُوْنُ الزَّكاةُ في إجارةٍ دونَ رقبةِ العِقَار؛ لأنّ هٰذِه الأسهمَ قد جُعِلَتْ في دَرَجَةِ الأُولى لِلاستثمارِ وتَوْظِيْفِ المَال ".(۲)

اور "مجمع الفقه الإسلامي "جدۃ نے بھی اپنی قرارداد میں اسی کو اختیار کیا ہے؛ چناں چہ اس قرارداد میں ہے کہ

" فإن كان سَاهَمَ في الشركة بقَصْدِ الاستفادة من ريع الأسْهُمِ السَّنَوِي، لا بِقَصْدِ بيعِها عند مَا تَرْتَفِعُ قيمتُها ، فإنّه يُزَكِّيْهَا زكاةَ المستغلات..........، فإنّ صاحبَ هذه الأسهم

(۱) مجلة الفقه الإسلامي:۴/۱/۶۸۸-۶۹۹

(۲) بحث الشيخ البسام في مجلة الفقه الإسلامي :۴/۱/۱۵

لا زكاةَ عليه في أصلِ السَّهْم وإنَّمَا تَجِبُ الزكاةُ في الريع ....، وإنْ كان المُسَاهِمُ قد اقْتَنٰى الأسْهُمَ بقصد التِّجَارةِ زَكَّاها زكاةَ عُرُوْضِ التِّجَارَة الخ ".(۱)

اس سلسلے میں دوسرا قول بعض علماء کا یہ ہے کہ شیئر ہر صورت میں، خواہ وہ کسی بھی نیت سے لیا گیا ہو، مال تجارت ہے؛ کیوں کہ اس وقت اس کی یہ حیثیت خود بخود مسلم ہو چکی ہے، اور اس کا بازار الگ ہے، جہاں اس کی خرید و فروخت ہوتی ہے، اور اس کو اسی مقصد سے خریدا جاتا ہے کہ اس سے تجارت کی جائے اور بازار حصص میں اس کو قیمت کے بڑھنے پر بیچا جائے؛ لہذا خواہ کچھ حصہ اس میں سے عمارت یا فرنیچر یا کسی اور سامان کی صورت میں بھی ہو، وہ سب کا سب بھی مال تجارت ہی ہے۔ اس قول پر شیئر خواہ کسی مقصد سے خریدا گیا ہو، وہ مال تجارت ہے، لہذا اس کی زکات مال تجارت کی طرح اس کی موجودہ قیمت پر لازم ہوگی۔

اسی کو ندوۃ البرکۃ کے دوسرے اجلاس نے اختیار کیا ہے اور بعض شرعی اداروں نے بھی اس کو اختیار کیا ہے اور امام ابوزہرہ، شیخ عبدالرحمٰن، شیخ عبدالوھاب الخلاف اور شیخ یوسف القرضاوی نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ (۲)

لیکن پہلا قول اکثر علماء نے اختیار کیا ہے، اور اصولی اعتبار سے بھی یہی بات معقول اور فقہی لحاظ سے لائق ترجیح معلوم ہوتی ہے۔

(۲) اس سلسلے میں دوسرا اختلاف اس لحاظ سے ہے کہ شیئر کمپنیاں اصولی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں: ایک تجارتی کمپنیاں اور دوسرے اجارتی کمپنیاں۔ تجارتی کمپنی وہ ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کا پیسہ لے کر کاروبار میں لگاتی ہے اور اس کا نفع اپنے شیئر

---

(۱) مجلة الفقه الإسلامي:۴/۱/۸۸۲

(۲) تداول أسهم الشركات : للشيخ يوسف الشبيلي:۷

ہولڈروں میں تقسیم کرتی ہے، اوران میں بعض کمپنیاں خود چیزوں کو تیار کر کے ان سے کاروبار کرتی ہیں، جب کہ بعض کمپنیاں دوسری تجارتی کمپنیوں سے سامان خرید کراس کو کاروبار میں لگاتی ہیں، جیسے امپورٹ ایکسپورٹ کی کمپنیاں، بہ ہر حال یہ کاروباری اور تجارتی کمپنیاں ہیں۔

اوراجارتی کمپنی کا کام یہ ہے کہ وہ مختلف قسم کی چیزوں کولوگوں کے لیے کرائے پر فراہم کر کے ان سے اجرت وصول کرتی اوراپنے شیئر ہولڈروں میں اس اجرت کوحسب قاعدہ تقسیم کردیتی ہے۔جیسے بعض کمپنیاں ہوٹل کے کمروں کوکرائے پر دیتی ہیں، بعض ہوائی جہازاورٹرین وغیرہ کی سیٹوں کی بکنگ کا کاروبارکرتی ہیں، یا کاراوربس وغیرہ کرائے پر چلاتی ہیں اوران کی اجرت کوکمپنی کے شیئر ہولڈروں میں تقسیم کردیتی ہیں۔

اب اختلاف یہ ہے کہ ان کمپنیوں کی الگ الگ حیثیت کی وجہ سے ان کے شیئر کی زکات کا حکم بھی الگ الگ ہے؟ جہاں تک تجارتی کمپنیاں ہیں، تواس میں سب کا اتفاق ہے کہ ان کے شیئر کی موجودہ ویلیو پر زکات عائد ہوگی؛ کیوں کہ یہ کاروبار کے لیے لگائی گئی رقم ہےاور ہر تجارتی مال پر زکات ہے جب کہ وہ نصاب کی مقدار کو پہنچ گیا ہو۔

اس کے برخلاف اجارتی کمپنیوں کے بارے میں علماء کی دورائیں ہیں:

ایک یہ ہے کہ ان میں لگے ہوئے شیئر کی اصل مالیت پر زکات نہیں ہے، بل کہ اس سے حاصل ہونے والے نفع پر زکات عائد ہوگی؛ کیوں کہ اس شیئر کی رقم مکان، دکان، ہوٹل کی عمارت، یا کار یا بس وغیرہ چیزوں کو لینے میں لگی ہے، جو کرائے پر چلانے کے مقصد سے ہیں اور یہ بات پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ کرائے پر چلانے کے لیے جو چیزیں ہوتی ہیں، ان پر زکات نہیں ہے، البتہ ان سے حاصل ہونے والے نفع پر زکات اسی طرح آئے گی جیسے دیگر روپئے پیسے پر آتی ہے۔

یہی رائے علامہ شیخ عبد الرحمٰن عیسی نے اپنی کتاب ” المعاملات الحدیثة

وأحكامها ‘‘ میں پیش کی ہے اور شیخ وھبہ الزحیلی نے ان کی اقتداء میں ’’موسوعة القضايا المعاصرة ‘‘میں اسی کو اختیار کیا ہے اور اس کو اوفق بالفقہ قرار دیا ہے۔

چناں چہ انھوں نے دوسری رائے پر جو آگے آرہی ہے، پہلی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

” ولكِنّي أرى أنَّ الاتّجاهَ الأوّل هو المُقَرَّر فِقْهاً ، وهو الَّذِي جَرَى عليه العَمَلُ مُنْذُ ظُهُوْر الشَرِكَاتِ المُسَاهَمَة و بَدْءِ انْتِشَارِهَا في الأربعيناتِ ، ولا تَقْعِيْدَ في الأمر ، فَالمُسْلِمُ يَعْرِفُ أنّ الآلاتِ الصِّنَاعِيّة لا زكاةَ فيها ، فإذَا وَظَّفَ مالَه بطريق الأسهم في شَرِكَاتِ صِنَاعِيّةٍ ، يُحْسَمُ ما يُقَابِلُ تلكَ الآلاتِ ، وإذا وَظَّفَ مَالَه في أسهم شَرِكَاتِ تِجَارِيَّةٍ زَكَّاهَا كَزَكاةِ الأموالِ التِّجَارِيّة . (١)

اوراس میں دوسری رائے یہ ہے کہ دونوں قسم کی کمپنیوں کا ایک ہی حکم ہے؛اس لیے ان میں لگے ہوئے شیئر کی موجودہ ویلیو پر زکات عائد ہوگی؛ کیوں کہ لوگوں کو اس میں بڑی پریشانی ہوگی کہ ان شیئروں کو الگ کریں اور ان کے احکام میں فرق کو جانیں؛لہذا دونوں قسم کی کمپنیوں کے شیئر پر زکات عائد ہوگی۔

اس دوسری رائے کو شیخ یوسف القرضاوی نے ” فقه الزكاة “میں اختیار کیا اور پہلی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اسی دوسری رائے کو صواب قرار دیا ہے۔(٢)

اوراس رائے کو اختیار کرنے والوں میں شیخ ابوزہرہ، شیخ عبدالوھاب الخلاف، شیخ عبدالرحمٰن حسن، ،دکتور صالح السدلان، شیخ عبدالرحمٰن الحلو ،وغیرہ،حضرات علماء ہیں۔(٣)

(١) دیکھو: موسوعة القضايا المعاصرة :٢/٦٩٠

(٢) فقه الزكاة :١/٤٩٥

(٣) دیکھو : الأسهم والسندات وأحكامها:٢٦٩

لیکن احقر کے نزدیک پہلی رائے زیادہ مضبوط معلوم ہوتی ہے ؛ کیوں کہ ایک تو نیت اور مقصد کے لحاظ سے یہ اوفق بالشرع ہے، تو اصول کے لحاظ سے اوفق بالفقہ ہے ؛ کیوں کہ سب کو معلوم ہے کہ تجارت ایک الگ چیز ہے اور اجارہ بالکل دوسری چیز ہے، تو اس کے لحاظ سے احکام میں فرق ایک واضح اور بدیہی بات ہے؛ لہذا جو کمپنیاں محض تجارتی ہیں، ان کا حکم ان کمپنیوں کے لحاظ سے جدا ہونا چاہیے جو اجارتی ہیں؛ لہذا پہلی کمپنیوں کے شیئرز پر زکات سامان تجارت کا اعتبار کرتے ہوئے شیئر کی کل موجودہ قیمت پر ہوگی، جب کہ اجارتی کمپنی کے شیئر کی قیمت پر زکات عائد نہیں ہوگی ؛ بل کہ اس کے نفع پر ہوگی اور اس نفع کو مالک اپنے دیگر مال کے ساتھ ملا کر ان کی زکات ادا کرے گا۔

اس مسئلے پر بہت عمدہ بحث دلائل کے ساتھ علماء کے لیے شیخ احمد بن محمد الخلیل کی کتاب ”الأسهم والسندات و أحكامها“ میں موجود ہے۔

اس سلسلے میں تیسرا اختلاف اس لحاظ سے ہے کہ شیئر کی زکات کس قیمت کے اعتبار سے دی جائے گی ، مگر میں اس مسئلے کو آگے چل کر ادائیگی زکات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بیان کروں گا۔

حقوق معنویہ کی زکات

عصر حاضر کی ترقی نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو نئی نئی چیزیں ایجاد کی ہیں اور ان کی ایک لمبی قطار ہمارے سامنے کھڑی ہے، ان میں جہاں مادی وظاہری چیزیں شامل ہیں ، وہیں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو غیر مادی اور معنوی ہیں ، اور اس قسم کی چیزوں میں سے ایک وہ بھی ہیں، جن کو ”حقوق معنویہ“ کہا جاتا ہے۔

قدیم دور میں اگر چہ ”حقوق مجردہ“ کا تصور اور ان پر بحث کتب فقہ میں ملتی ہے، جس سے اس قسم کے حقوق کا وجود اس دور میں بھی معلوم ہوتا ہے؛ لیکن جس وسیع اور ہمہ گیر پیمانے پر اور متنوع اقسام کے ساتھ آج یہ حقوق سامنے آئے ہیں، سابق دور میں اس

کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔

حقوق معنویہ سے مراد وہ حقوق ہیں، جو کسی مادی چیز سے متعلق نہ ہوں؛ بل کہ ذہنی و فکری، یا عملی سرگرمیوں کے نتائج سے متعلق ہیں، جیسے حق تالیف وتصنیف، یا حق فن کاری، یا تجارتی نشان (ٹریڈ مارک)، یا کسی تجارت یا صنعت کاری کا لائسنس، وغیرہ۔

شیخ عبد السلام العبادی نے اس موضوع پر اپنے مقالے میں قانون دانوں کے حوالے سے "حقوق معنویہ" کی تعریف یہ نقل کی ہے کہ:

"الحَقُّ المَعْنَوِي هو سُلْطَةٌ لشخصٍ عَلَى شيءٍ غيرِ مَادِيٍّ ، هُو ثَمرةُ فَكْرِه أو خَيَالِه أو نَشَاطِه كَحَقِّ المُؤلِّف في مُؤَلَّفَاتِه العِلْمِيّةِ ، وحَقِّ الفَنَّان في مُبْتَكَرَاتِه الفَنِّيَّة ، وَحَقّ المُخْتَرِع فِي مُخْتَرَعَاتِه ، وحَقُّ التَّاجِر في الإسْمِ التِّجَارِيّ والعَلامةِ التِّجَارِيّة وثِقَةِ العُمَلاءِ". (۱)

اور استاذ علی الخفیف نے اپنی کتاب " الملكية في الشريعة الإسلامية مع المقارنة بالشرائع الوضعية " میں اسی طرح کی بات نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"أمّا الحُقُوقُ المعنويةُ فهي الَّتي تَرِدُ وتَنصِبُ على أشياء معنويةٍ لا تُدْرَكُ بحَاسَّةٍ مِنَ الحَوَاس ، وإنَّمَا تُدرَكُ بالعَقْل والفِكْرِ ؛ كالأفكَارِ والاخْتِرَاعَاتِ ، ولِذَا كان الحقُّ المَعْنَوِي سُلْطَةٌ على شَيْءٍ غيرِ مَادِّيٍّ هو ثمرةُ فكرِ صاحبِ الحَقِّ أو خَيَالِه أو نَشَاطِه : كحَقِّ المُؤلِّف فيما ابْتَدَعَه من أفكارٍ عِلمِيّةٍ،وحَقّ الفَنَّان في مُبْتَكَرَاتِه الفَنِّيَّة وحَقّ المُخْتَرِع

(۱) الفقه الإسلامي والحقوق المعنوية، بحث للدكتور عبد السلام العبادي، مجلة مجمع الفقه الإسلامي:۵/۳/۲۴۷۰

فِي مُخْتَرَعَاتِهِ الصِّنَاعِيّة وهكذا ". (۱)

الغرض حقوق معنویہ وہ حقوق ہیں، جن کا تعلق مادی اشیاء سے نہیں، بل کہ فکری ایجادات، عقلی اختراعات اور فنی انکشافات سے ہیں، لہذا اس میں تصنیفی وتالیفی حق، کسی فن کار کی فن کاری کا حق، کسی موجد کی ایجاد کا حق، اسی طرح تاجر کی تجارتی سرگرمیوں کا حق، جس سے اس کا نام پیدا ہوا اور کمپنی وغیرہ کا ٹریڈ مارک جیسی چیزیں داخل ہیں۔

اب یہاں سوال یہ ہے کہ ان حقوق معنویہ پر زکات عائد ہوتی ہے، یا نہیں؟ اس کے جواب سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ "حقوق معنویہ" کے بارے میں یہ بحث ہے کہ ان پر مال کی تعریف صادق آتی ہے، یا نہیں؟ شیخ وھبہ الزحیلی نے متقدمین علماء حنفیہ کا نقطۂ نظر مال کی تعریف میں یہ بیان کیا ہے کہ ان کے یہاں مال میں دو شرطیں ملحوظ ہیں:

(۱)"إمكانُ الحِيَازَة و الإحْرَاز"(اس کا قبضہ کیا جانا اور محفوظ کرنا ممکن ہو۔)

(۲)"إمكانُ الانْتِفَاع بِهِ عَادَةً و عُرْفاً "(اس سے عرفاً وعادتاً منتفع ہونا ممکن ہو۔)

لیکن متاخرین حنفیہ نے مال کی ایسی تعریف بیان کی ہے جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ مال ہر وہ چیز ہے جو لوگوں کے مابین کوئی قیمت رکھتی ہو، اور جمہور کے نزدیک بھی مال ہر وہ چیز ہے جس کی عرف میں کوئی قیمت مانی جاتی ہو۔(۲)

لہذا جمہور کے نزدیک اور متاخرین فقہائے حنفیہ کے نزدیک مال کی جو تعریف کی گئی ہے، اس کے لحاظ سے حقوق معنویہ بھی مال میں داخل ہو جاتے ہیں، کیوں کہ موجودہ دور کے عرف میں اور تجار کی عادت میں ان حقوق کی قیمت مانی جاتی ہے اور ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جاتا ہے، جو مال کے ساتھ ہوتا ہے؛ لہذا حقوق معنویہ مال میں داخل ہیں۔

(۱) الملكية في الشريعة لعلي الخفيف :۱۴

(۲) مجلة مجمع الفقه الإسلامي:۲۳۹۳/۳/۵

اکثر معاصرین نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ حقوق معنویہ بھی مال کے حکم میں داخل ہیں؛ لیکن حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب زید مجدہ نے اس میں یہ قید لگائی ہے کہ ان حقوق کا اگر سرکاری طور پر رجسٹریشن کرالیا جائے، تب یہ مال کے حکم میں ہوں گے۔

چناں چہ آپ لکھتے ہیں کہ:

"اگر اس حق کا حکومتی رجسٹریشن بھی کرالیا گیا ہو، جس کے لیے موجد اور مصنف کو محنت کرنی پڑتی ہے، مال اور وقت خرچ کرنا پڑتا ہے اور جس کی وجہ سے یہ حق ایک قانونی حق ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے ایک سرٹیفیکیٹ جاری کردیا جاتا ہے اور تاجروں کے عرف میں اسے قیمتی مال شمار کیا جاتا ہے، تو یہ بات بعید نہیں ہوگی کہ اس رجسٹرڈ حق کو مروجہ عرف کی بنیاد پر اعیان و اموال کے حکم میں کردیا جائے۔ اور ہم پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ بعض اشیاء کو اعیان و اموال کے حکم میں داخل کرنے میں عرف کو بڑا دخل ہے، اس لیے کہ مالیت لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے اور رجسٹریشن کے بعد اعیان کی طرح اس کا احراز بھی ہوجاتا ہے اور وقت ضرورت کے لیے اس کا ذخیرہ بھی کیا جاسکتا ہے، تو اس عرف کا اعتبار کرنے میں کتاب وسنت کی کسی نص کی ممانعت نہیں ہے، بہت سے بہت قیاس کی مخالفت ہے، اور قیاس کو عرف کی وجہ سے ترک کردیا جاتا ہے۔"

پھر آپ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ انھی پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے علمائے معاصرین کی ایک جماعت نے اس حق کی بیع کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے، ان میں سے برصغیر کے علماء میں سے مولانا فتح محمد لکھنوی (شاگرد مولانا عبدالحی لکھنوی)، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا مفتی نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مفتی عبدالرحیم لاجپوری، بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ (۱)

اور مجمع الفقہ الاسلامی نے بھی اپنے پانچویں اجلاس میں جو کویت میں بتاریخ: یکم

(۱) فقہی مقالات: ۱/۲۲۵

۶ر جمادی الاولی تا ۱۵ر جمادی الاولی ۱۴۰۹ھ منعقد ہوا تھا، اپنی قرارداد میں یہی فیصلہ کیا ہے کہ یہ حقوق معنویہ مالی قیمت رکھتے ہیں اور ان کو مال شمار کیا جاتا ہے۔ (۱)

الغرض حقوق معنویہ جب سرکاری طور پر منظوری کے مرحلے سے گزر جائیں، تو اس کے مال ہونے میں کوئی دو رائے نہیں ، اب ہم اس سوال کی جانب آتے ہیں کہ ان ''حقوق معنویہ'' پر زکات عائد ہوتی ہے، یا نہیں؟

اس سلسلے میں معاصرین علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اس سلسلے کی ابحاث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں معاصر علماء کی دو رائیں ہیں:

(۱) بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ حقوق معنویہ میں زکات واجب ہے، کیوں کہ یہ مال ہے اور اس کو بیچا و خریدا جاتا ہے، لہٰذا اس پر حسب قاعدہ زکات واجب ہوگی۔

(۲) اکثر حضرات نے اس میں تفصیل بیان کی ہے، وہ یہ کہ:

(الف) اگر حقوق معنویہ محض اپنے کام میں لانے کے لیے ہیں، فروختگی و تجارت کے لیے نہیں، تو اس میں زکات واجب نہیں، کیوں کہ یہ مال مالِ نامی نہیں ہے؛ بل کہ ایسا ہے جیسے استعمالی سامان، یا ضرورت کی اشیاء اور یہ بات معلوم ہے کہ زکات مال نامی پر واجب ہوتی ہے، جیسا کہ تفصیل سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

(ب) ہاں اگر کوئی شخص اپنا حق معنوی بیچ دے ، جیسے کوئی اپنا تجارتی لائسنس دوسرے کو بیچ دے، تو جو نقد مال اس کو حاصل ہو، اس پر زکات واجب ہوگی۔ اگر اس کے پاس پہلے سے قابل زکات مال ہے، تو اس کے ساتھ اس کو ملا کر سب کی زکات دی جائے گی اور اگر پہلے سے قابل زکات مال نہیں ہے، تو ایک سال گزرنے کے بعد اس کی زکات دی جائے گی ، بہ شرطے کہ وہ نصاب کے برابر ہو۔

(ج) اگر کوئی شخص حقوق معنویہ کی تجارت اور کاروبار کرتا ہو کہ لوگوں کے حقوق لیتا

---

(۱) مجلة مجمع الفقه الإسلامي: ۲۵۸۱/۳/۵

اور دوسروں کو فروخت کرتا ہو، تو اس کے حق میں یہ حقوق معنویہ مالِ تجارت کا حکم رکھتے ہیں؛ لہٰذا وہ ان حقوق کی بازاری قیمت کے مطابق سال بہ سال زکات ادا کرے گا۔

یہی رائے اوفق بالفقہ ہونے کی وجہ سے اصح اور اکثر حضرات کے نزدیک مختار ہے؛ لہٰذا اسی کو قابلِ عمل سمجھنا چاہیے۔(۱)

جو بینک، یا کمپنی ڈوب جائے، اس کے ڈپازٹ اور شیئر کی زکات کا حکم

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض وقت بینک ڈوب جاتی ہے، اسی طرح کوئی کمپنی ڈوب جاتی ہے، تو اس میں جمع رقم، یا شیئر پر زکات کا کیا حکم ہے؟

احقر کو اس میں کوئی تصریح نہیں مل سکی؛ لہٰذا اصولی طور پر اس کا جواب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جو بینک یا کمپنی ڈوب جائے، تو اس کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ وہ بینک یا کمپنی ان حالات سے دوچار ہونے کے بعد دوبارہ سنبھلنے کا رخ کر رہی ہو اور اس میں اس کے آثار نمایاں ہوں، یا سرکاری طور پر اس کی کوئی گیارنٹی دی گئی ہو۔

اس صورت میں اس کی رقومات اور شیئرز پر زکات عائد ہوگی اور یہ دین قوی ہی کے حکم میں سمجھے جائیں گے؛ کیوں کہ وہ رقومات دیر سویر مل جانے کی امید ہے، یا قانونی طور پر اس کو تحفظ حاصل ہے، لہٰذا اگر یہ رقم وصول ہو جائے اور شیئر قابلِ انتفاع ہو جائے، تو اس کی زکات ادا کی جائے اور تمام گذشتہ سالوں کی زکات بھی ادا کی جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس بینک یا کمپنی کے سنبھلنے کے کوئی آثار نہ ہوں اور نہ کوئی

---

(۱) اس مسئلے کی تفصیل کے لیے دیکھو: **الحقوق المعنوية والتصرف فيها وزكاتها ، از دكتور علي محي الدين قره داغي. زكات الحقوق المعنوية ، از شيخ سعيد رمضان البوطي . الحقوق المعنوية ، ماليتها ووجوب الزكاة فيها ، از دكتور زاهر فؤاد محمد.**

قانونی تحفظ حاصل ہو،تو اس کا حکم ''مال ضمار'' کا حکم ہوگا۔

اور مال ضمار کی تعریف ''بدائع الصنائع ''میں یہ کی گئی ہے کہ

'' هُوَ كُلُّ مالٍ غيرِ مَقْدُوْرِ الانتفاعِ بِهِ مع قيامِ أصل المِلْكِ ؛ كالعَبْدِ الآبِقِ والضَّالِّ، والمَالِ المَفْقُوْد ، والمَالِ السَّاقِطِ في البَحْرِ ، والمَالِ الَّذِيْ أخَذَهُ السُّلطانُ مُصَادَرةً ، والدَّيْنِ المَجْحُوْدِ إذَا لَمْ يَكُن لِلْمَالِكِ بَيِّنَةٌ وحَالَ الحَوْلُ ، ثُمَّ صَار لَه بَيِّنَةٌ ؛ بأنْ أقَرَّ عِنْدَ النَّاسِ ، والمَالِ المَدْفُوْنِ في الصَّحْراء إذا خَفِيَ عَلَى المَالكِ مكانُه '' .(١)

اور''الاختيار لتعليل المختار ''میں ہے کہ

''وهُوَ المَالُ الضَّائِعُ والسَّاقطُ في البَحْرِ ،والمَدْفُوْنُ في المَفَازَةِ إذَا نَسِيَ المَالِكُ مَكَانَه ، والعَبْدُ الآبِقُ والمَغْصُوبُ ، والدَّيْنُ المَجْحُوْدُ إذا لَمْ يَكُنْ عليهما بَيِّنَةٌ ، والمُوْدَعُ عِنْدَ مَنْ لا يَعْرِفُه ونَحْوُ ذٰلک '' .(٢)

خلاصہ یہ ہے کہ جو مال بھی ایسا ہو،جس سے انتفاع کی قدرت باقی نہ رہے،تو وہ مال ضمار ہے اور مال ضمار کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے کہ اس پر زکات ہے،یا نہیں،امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس پر بھی زکات عائد ہوتی ہے،مگر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مال ضمار پر زکات نہیں؛لہٰذا اگر قسمت سے وہ مال مل جائے،تو گذشتہ ایام کی زکات نہیں آئے گی،بل کہ اس پر وصولی کے بعد آئندہ زکات آئے گی۔(٣)

---

(١) بدائع الصنائع : الزكاة /فصل في الشرائط التي ترجع إلى المال،٢/٣٩٠

(٢) الاختيار لتعليل المختار:١/١٠١

(٣) مجمع الأنهر :١/١٩٤.بدائع الصنائع :٢/٣٩٠.الاختيار لتعليل المختار: ١/١٠١

باغ یا کھیتی کی زمین کی مالیت پر زکات نہیں ہے، منافع پر زکات ہے

اگر کسی شخص کے پاس باغ ہو، جس سے ایک قسم کا یا مختلف قسم کا پھل اس کو حاصل ہوتا ہو، یا کھیتی کی زمین ہو، جس میں وہ کھیتی کرتا ہو، تو یہ باغ اور کھیتی کی زمین بھی مال تجارت نہیں ہے، کیوں کہ وہ اس باغ اور کھیت کو بیچنے کا ارادہ نہیں رکھتا؛ بل کہ اس میں کھیتی کرنے یا درخت لگا کر نفع حاصل کرنا چاہتا ہے؛ لہذا کھیت اور باغ کی مالیت پر زکات نہیں آئے گی، ہاں! اس باغ یا کھیت سے ہونے والی آمدنی و منافع پر زکات آئے گی۔

جس دکان یا فیکٹری میں تجارت ہوتی ہے، اس پر زکات نہیں ہے

اسی طرح تجارت کرنے کے لیے جو دکان استعمال ہوتی ہے، یا فیکٹری کی عمارت استعمال ہوتی ہے، وہ خود مال تجارت نہیں ہے؛ بل کہ وہ مقام تجارت ہے، لہذا اس دکان اور فیکٹری کی عمارت پر زکات نہیں آئے گی۔

فیکٹری کی مشنری اور مال بردار ٹرک مال تجارت نہیں ہے

ایک مسئلہ یہاں یہ ہے کہ اگر کسی کی کوئی فیکٹری ہو، یا کوئی دکان ہو، تو اس میں جو مال فروخت کرنے کا ہو، یا جو مال فیکٹری میں فروخت کے لیے تیار کیا گیا ہو، جیسے کپڑے کی فیکٹری میں کپڑا، وہ مال تجارت ہے اور خود فیکٹری کی عمارت اور وہاں جو چیزیں استعمال کی ہوں جیسے فرنیچر، یا مشنری، جس سے مال تیار کیا جاتا ہے، وہ مال تجارت نہیں ہے؛ لہذا پہلی قسم کی چیزوں پر زکات ہے اور دوسری قسم کی چیزوں پر زکات نہیں ہے۔

"ھدایہ" میں ہے:

"وَلَیْسَ فِي دُوْرِ السُّکْنٰی ، وثِیابِ البَدَن ، وأثَاثِ المَنْزِلِ، ودَوَابِّ الرُّکُوْب ، وعَبِیْدِ الخدمَةِ ، وسلاحِ

الاسْتِعْمالِ زَكَاةٌ ؛ لأنَّها مَشْغُوْلَةٌ بالحَاجَةِ الأَصْلِيَّة ، ولَيْسَتْ بِنَامِيَةٍ ، وعَلَى هٰذا كُتُبُ العِلْمِ لأهلِهَا وآلاتُ المُحْتَرِفِيْن ؛ لما قلنا ".(۱)

"درر الحکام" میں ہے کہ:

"وَلَا فِي دُورِ السُّكْنٰى ونَحْوِها كَثِيَابِ البَدَنِ ، وأَثَاثِ المَنْزِلِ ، ودَوَابِّ الرُّكُوْب ، وعَبِيْدِ الخِدْمَة ، وكُتُبِ العِلْم لأَهْلِه ، وآلاتِ المُحْتَرِفِيْن " . (۲)

اسی سے معلوم ہوگیا کہ فیکٹری میں تیار ہونے والے مال کی سپلائی کے لیے کوئی ٹرک، یالاری ہو، تو اس پر بھی زکات نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ بھی مشنری کی طرح مال تجارت نہیں؛ بل کہ یہ تجارت میں کام میں لایا جانے والا سامان ہے۔

درزی، بڑھئی وغیرہ کے اوزار پر زکات

اسی سے سمجھ لیں کہ جو مختلف قسم کے صنعت کار لوگ اپنی صنعت کاری کے لیے اوزار استعمال کرتے ہیں، جیسے درزی کی سلائی مشین، چھاپنے والے کی پرنٹنگ مشین، بڑھئی کے اوزار، زمین کھودنے کی مشین (JCB) اور عمارت ڈھانے کی مشین بلڈوزر (Bulldozer) وغیرہ، ان پر بھی زکات نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ سب مال تجارت میں داخل نہیں ہے؛ بل کہ ذرائع واسباب تجارت میں سے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی شخص انھی چیزوں کو فرخت کرتا ہو، تو اس کے حق میں یہ سب مال تجارت ہیں۔ اور اس پر زکات عائد ہوگی۔

---

(۱) الهداية:۱۶۶/۲

(۲) درر الحكام:۱۷۲/۱-۱۷۳

بحث پنجم

زکات کا نصاب کیا ہے؟



بحث پنجم
زکات کا نصاب کیا ہے؟

زکات کے فرض ہونے کے لیے نصاب کیا ہے؟ نصاب کہتے ہیں اس مقدار کو جس تک پہنچنے پر مال پر زکات فرض ہوتی ہے اور اگر اس سے کم ہو، تو زکات فرض نہیں ہے۔

یہاں ایک بات ذہن میں رکھ لیں کہ زکات کے مالوں کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے، ان میں سے ہر ایک کا نصاب الگ الگ ہے، مثلاً جانوروں میں سے اونٹ اگر پانچ ہو جائیں، تو ان میں زکات ہے؛ لہٰذا اونٹ کا نصاب یہ ہے کہ پانچ اونٹ ہو جائیں اور گائے، بھینس میں تیس سے کم میں زکات نہیں اور تیس ہو جائیں، تو ان میں زکات ہے؛ لہٰذا گائے، بھینس کا نصاب تیس گائیں ہیں، اور بکری میں چالیس ہو جائیں، تو زکات ہے، اس سے کم میں زکات نہیں۔

لیکن میں اس وقت سونا، چاندی اور روپئے، پیسے کے نصاب پر گفتگو کروں گا؛ کیوں کہ زیادہ تر لوگ جو ہمارے مخاطب ہیں، وہ اسی قسم کا مال اپنے پاس رکھتے ہیں۔ لہٰذا اب سنیے کہ سونے کا نصاب کیا ہے:

سونے اور چاندی کا نصاب

سونے کا نصاب جو احادیث میں بیان کیا گیا ہے، وہ بیس دینار، یا بیس مثقال ہے

اور چاندی کا نصاب دوسو درہم ہے۔

چنانچہ حضرت علی –رضی اللہ عنہ– سے صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے فرمایا کہ

" فَإِذَا كَانَتْ لَکَ مِئَتَا دِرْهَمٍ وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِم ، وَلَيْسَ عَلَيْکَ شَيْءٌ - يَعْنِيْ فِي الذَّهَبِ - حَتَّى يَكُوْنَ لَکَ عِشْرُوْنَ دِيْنَاراً ، فَإِذَا كَانَ لَکَ عِشْرُوْنَ دِيْنَاراً وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ فَفِيْهَا نِصْفُ دِيْنَارٍ ، وَمَا زَادَ فَبِحِسَابِ ذَلِکَ " .

(پس جب تیرے پاس دوسو درہم ہوجائیں اور ان پر ایک سال گزر جائے، تو ان میں پانچ درہم ہیں اور تجھ پر سونے میں کچھ نہیں، جب تک کہ تیرے پاس بیس دینار نہ ہوجائیں، پس جب بیس دینار ہوجائیں اور ان پر سال گزر جائے، تو ان میں نصف دینار ہے اور جو اس سے زیادہ ہوجائیں، تو زکات ان میں اسی کے حساب سے ہوگی۔)(۱)

نصاب کی مقدار گرام کے حساب سے

اب یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بیس مثقال پرانے وزن کے حساب سے ساڑھے سات تولے ہوتے ہیں اور گرام کے حساب سے ان کی مقدار ستاسی گرام اور چار سو اسّی ملی گرام ہے۔ یعنی 87 گرام، 480 ملی گرام؛ لہذا جس کے پاس ستاسی گرام چار سو، اسّی ملی گرام سونا ہو، اس پر ایک سال گزرنے کے بعد زکات فرض ہوجائے گی۔

اور دوسو درہم کو تولے والے حساب سے دیکھیں، تو ساڑھے باون تولے ہوتے

(۱) أبو داود :۱۵۷۳. شرح السنة :۱۵۸۲. الأحاديث المختارة: ۵۲۸. السنن الصغرى للبيهقي:۱۱۹۸

ہیں اور گرام کے حساب سے چھ سو بارہ گرام، تین سو ساٹھ ملی گرام کے برابر ہوتے ہیں ،یعنی612 گرام،360 ملی گرام؛لہذا جس کے پاس چھ سو بارہ گرام، تین سو ساٹھ ملی گرام چاندی ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس پر زکات آئے گی۔

چاندی اور سونے میں سے کون سا نصاب اصل ہے؟

موجودہ دور میں اہل علم کے مابین یہ مسئلہ بھی زیر بحث رہا ہے، کہ آج کل سونے اور چاندی کے نرخ میں بے حد تفاوت پایا جاتا ہے۔اور یہ تفاوت کئی کئی گنا ہوتا ہے، تو ایجاب زکات اور حرمت اخذِ زکات کا نصاب چاندی کے حساب سے مقرر کیا جانا چاہیے، یا سونے کے حساب سے؟ بالفاظ دگر سونے کے نصاب کو اس میں اصل ماننا چاہیے، یا چاندی کے نصاب کو؟

اس مسئلے پر ماضی قریب کے علماء اور معاصر علماء نے متعدد پہلوؤں سے بحث کی ہے۔اور اس بحث کے نتیجے میں بعض علماء جیسے "شیخ ابوزہرہ، شیخ عبدالوہاب الخلاف اور شیخ حسن، وغیرہ حضرات علما نے سونے کے نصاب کو اصل قرار دینے کی تجویز کی ہے۔ علامہ شیخ یوسف القرضاوی کی بھی یہی رائے ہے۔

اور ان حضرات نے جن امور کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) چاندی کی قیمت میں دور رسالت کے بعد کافی تغیر آگیا اور یہ تغیر در اصل زمانے کے تغیر کا نتیجہ ہے، جیسے کہ اور چیزوں میں ہوا ہے، اس کے برخلاف سونا اپنی قیمت پر برقرار رہتے ہوئے بہت حد تک آگے بڑھ گیا۔شیخ ابوزہرہ، شیخ عبدالوہاب الخلاف اور شیخ حسن نے یہی کہا ہے۔(۱)

(۲) علامہ یوسف القرضاوی نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے؛ اس لیے کہ اموال زکات کو اگر موازنہ کر کے دیکھا جائے کہ پانچ اونٹوں پر زکات ہے، چالیس بکریوں پر

---

(۱) فقہ الزکاۃ:۱/۲۶۴

زکات ہے، پانچ وسق کھجور، یا کشمش پر زکات ہے، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس عہد میں زکات کے تمام نصابوں سے قریب سونا ہے، چاندی نہیں؛ اس لیے مناسب یہی ہے کہ نصابِ زکات کے لیے سونے کو اصل قرار دیا جائے۔(۱)

(۳) دکتور وھبہ الزحیلی نے اگر چہ کہ جمہور کی رائے کو ترجیح دی ہے، تاہم انھوں نے " الفقه الإسلامي وأدلته" اور "موسوعة القضايا المعاصرة " میں اس رائے کی تائید میں مختلف امور لکھے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

> ''کرنسی نوٹوں کی تقویم میں سونے کو اصل ٹھہرانا بلحاظ دلیل راجح ہے؛ اس لیے کہ لوگوں کے آپسی تعامل میں سونا ہی اصل حیثیت رکھتا ہے، اور اس لیے بھی کہ سونا ہی دراصل کرنسی نوٹوں کی پشت پر ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ دور رسالت میں اور اہل مکہ کے نزدیک مثقال (جو سونے کا ہوتا ہے) ہی اصل پیسہ و کرنسی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور یہی دیت کے مقرر کرنے میں بھی اساس مانا جاتا تھا اور صراف لوگ بھی سونے کی قیمت ہی سے رائج الوقت کرنسی کی قیمت لگاتے ہیں۔(۲)

لیکن اکثر علما معاصرین کی رائے یہ ہے کہ چاندی کے نصاب کو اصل قرار دے کر اسی سے نصاب کا تعین کیا جائے۔ اور اس کی متعدد وجوہ ہیں:

(۱) ایک تو اس وجہ سے کہ چاندی کے نصاب پر اجماع ہے، جب کہ سونے کا نصاب مختلف فیہ ہے۔

چنانچہ اکثر علماء وفقہاء کا قول جہاں یہ ہے کہ سونا اگر بیس مثقال ہے، تو زکات عائد

---

(۱) فقه الزكاة للقرضاوي:۱/۲۶۴

(۲) موسوعة القضايا المعاصرة:۲/۶۷۰، الفقه الإسلامي وأدلته :۲/۷۶۰

ہوگی، وہیں حضرت حسن بصری سے نقل کیا گیا ہے کہ سونا چالیس مثقال ہونے پر زکات آئے گی۔(۱)

نیز اکثر علماء وفقہاء اگر یہ کہتے ہیں کہ سونا بیس مثقال ہو، تو زکات ہے، خواہ اس کی قیمت چاندی کے نصاب کے برابر ہو، یا نہ ہو، تو امام عطاء بن ابی رباح، امام طاوس، امام زہری، امام سلیمان بن حرب، اور امام ایوب سختیانی – رحمہم اللہ تعالیٰ – یہ کہتے ہیں کہ اگر سونا، چاندی کے نصاب کی قیمت کو پہنچ جائے، تو اس میں زکات ہے اور اگر سونا، چاندی کے نصاب کی قیمت کو نہیں پہنچا، تو اس میں زکات نہیں ہے اور اگر سونا بیس مثقال سے کم ہونے کے باوجود چاندی کے نصاب کی قیمت کو پہنچ جائے، تو اس میں زکات ہے۔(۲)

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے، جب کہ سونے کے نصاب میں اختلاف ہے، دوسرے یہ کہ جمہور نے اگر چہ دونوں نصابوں کو اصل مانا ہے، تاہم بعض ائمہ کے نزدیک چاندی کا نصاب اصل ہے، اس لیے ان کے نزدیک سونے میں چاندی کی قیمت کے برابر ہونے نہ ہونے کا لحاظ کیا گیا ہے۔

(۲) دوسرے اس وجہ سے کہ چاندی کا نصاب صحیح حدیث سے ثابت ہے، اور اس کی تخریج بخاری ومسلم نے بھی کی ہے، جب کہ سونے کے نصاب کے بارے میں وارد احادیث اس پائے کی نہیں ہیں اور ان کی تخریج اصحاب سنن نے کی ہے اور ان کی تصحیح میں اختلاف بھی ہے، اور اگر صحیح بھی ہیں، تو اس مقام کی نہیں، جو چاندی کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔(۳)

---

(۱) الإجماع لابن المنذر:۵۳، الإشراف لابن المنذر: ۴۲/۳، المجموع للنووي:۵۰۳/۵، المغني:۲۱۲/۴

(۲) الإشراف لابن المنذر:۴۲/۳، المجموع للنووي:۵۰۳/۵، المغني:۲۱۲/۴

(۳) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے : نصب الراية : ۳۶۴/۲ – ۳۶۹، التلخيص الحبير ، ص:۱۳۵٦، رقم المسألة :۱۰۶۴

حتی کہ امام ابو عمر بن عبد البر مالکی نے ''الاستذکار'' میں یہ فرمادیا کہ

''لم يثبتْ عن النبي ــ ﷺ ــ في زكاةِ الذَّهَب شَيْء مِن جهة نقل الآحاد العدول الثقات الأثبات ''. (۱)

اور اسی وجہ سے -- کہ احادیث صحیحہ میں سونے کا نصاب بیان نہیں ہوا ہے -- بعض حضرات کو یہ بھی کہنا پڑا کہ سونے کے نصاب کے بارے میں احادیث صحیحہ نہیں ہیں؛ بل کہ اس میں اجماع، یا قیاس سے حکم لگایا گیا ہے۔

چناں چہ حضرت امام شافعی ''الرسالة'' میں کہتے ہیں کہ

''فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰه ــ ﷺ ــ في الورِق صدقةً ، وأخذ المُسْلِمُونَ في الذهب بعده صَدَقَةً ، إمّا بخبر عن النبي ــ ﷺ ــ لَمْ يَبْلُغْنَا ، وإمّا قياساً على أن الذهب والورِق نقدُ الناس الذي اكْتَنَزُوْه وأجَازُوْه أثماناً على ما تَبَايَعُوْا به في البُلْدَان قبل الإسلام و بعده ''. (۲)

اور امام مہلب فرماتے ہیں کہ

''ولم يَنْقُلْ عن النبي ــ ﷺ ــ فرض زكاة الذهب من طريق الخبر كما نُقِلَ عنه زكاةُ الفضة... .... فَعَدَلَ المُسْلِمُون بِخَمْسِ أوَاق من الفضة عشرين مثقالاً وجَعَلُوْه نصابَ زكاة الذهب ، وتواتر العمل به ، وعليه جماعة العلماء''. (۳)

(۱) الاستذكار:۹/۳۴

(۲) الرسالة :۱۹۲-۱۹۴

(۳) شرح البخاري لابن بطال:۳/۴۴۰-۴۰۱

الغرض سونے کا نصاب بیس مثقال اگر چہ جمہور کے نزدیک ثابت ہے اور اس کی دلیل بعض احادیث، یا اجماع، یا قیاس ہے؛ تاہم اس میں شک نہیں کہ چاندی کا نصاب جن احادیث سے ثابت ہے، وہ سونے کے نصاب کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہیں۔

(۳) تیسرے اس وجہ سے کہ چاندی کا نصاب فقرا کے حق میں زیادہ مفید و نفع بخش ہے۔اور حضرات فقہاء نے متعدد امور میں ''أنفع للفقراء والمساكين'' ہونے کو ایک اصول کے طور پر اختیار کیا ہے۔

علامہ مرغینانی نے ''بداية المبتدی'' میں لکھا ہے کہ

" الزكاةُ واجبةٌ في عروضِ التجارةِ كائنةً ماكانتْ إذا بَلَغَتْ قيمتُها نِصَاباً من الوَرِق والذَّهَب ، يُقَوِّمُها بما هو أنفع للمساكين ".(۱)

اور ''فتاوى التاتارخانيه'' میں ہے کہ

"ذكر محمدٌ في الأصل : أنَّ المالكَ فيها بالخيار ، إن شاء قَوَّمَ بالدراهم وإن شاء قَوَّمَ بالدنانير، ولم يحكِ فيه خلافاً، وعن أبي حنيفة : أنه يُقَوِّمُ بِمَا فيه إيجابُ الزكاة ، حتّٰى إذا بلغ بالتقويم بأحَدِهِمَا نصاباً ولَمْ يبلغ بالآخر قَوَّمَ بما يبلغُ نصاباً ، وهو إحدى الروايتين عن محمد ، ولو كان بالتقويم بكلٍّ واحدٍ يبلغُ نصاباً يُقَوِّمُ بما هو أنفع للفقراء من حيث الرواج ".(۲)

حنفیہ کے یہاں تو یہ اصول متعدد ابواب میں استعمال کیا گیا، ان کے علاوہ فقہائے حنابلہ کے یہاں بھی اس اصول کو استعمال کیا گیا ہے۔

---

(۱) بداية المبتدي:۳۹

(۲) فتاوى التاتارخانية :۱۶۵/۳

ان تین جوہات کی بنا پر اکثر علماءِ معاصرین نے موجودہ دور میں چاندی کے نصاب کو معیار مانا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے۔

روپیہ پیسہ اور کرنسی نوٹ اور مال تجارت کا نصاب

کرنسی نوٹ اور روپئے، پیسے کا نصاب یہ ہے کہ سونے اور چاندی کا جو نصاب بیان کیا گیا، ان میں سے کسی کی بھی قیمت کے برابر روپیہ، پیسہ اور کرنسی نوٹ ہوں؛ لہذا جس کے پاس روپیہ پیسہ اور کرنسی اس کے برابر ہو، تو اس پر بھی ایک سال گزر جانے پر زکات فرض ہو جائے گی۔

اسی طرح مال تجارت جس کا ذکر کیا گیا، اس کا نصاب بھی یہی ہے کہ وہ مال اگر سونے یا چاندی کے نصاب کی قیمت کے برابر ہو جائے، تو اس پر بھی زکات فرض ہو جائے گی اور ان دونوں میں سے جو بھی ''أنفع للفقراء'' ہو، اس کے حساب سے اس مال کی قیمت لگائی جائے گی۔

علامہ مرغینانی -رحمہ اللہ- نے ''بداية المبتدی'' میں لکھا ہے کہ

" الزكاةُ واجبةٌ في عروضِ التجارةِ كائنةً ماكانتْ إذا بَلَغَتْ قيمتُها نِصَاباً من الوَرِق والذَّهَب ، يُقَوِّمُها بما هو أنفع للمساكين ". (۱)

پھر امام محمد کے نزدیک کرنسی نوٹ، یا مال تجارت کی قیمت سونے یا چاندی میں سے کسی کے بھی لحاظ سے لگائی جا سکتی ہے؛ لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ مال تجارت اور کرنسی نوٹوں کی قیمت لگانے کے لیے سونے یا چاندی میں اس کا لحاظ کیا جائے گا، جس سے زکات واجب ہوگی، یہاں تک کہ اگر ایک کے لحاظ سے زکات واجب ہوتی ہو اور دوسرے

(۱) بداية المبتدي:۳۹

کے لحاظ سے واجب نہ ہوتی ہو، تو اس کا لحاظ کیا جائے گا، جس میں زکات واجب ہوتی ہے اور اگر دونوں کے لحاظ سے بھی نصاب کی قیمت بنتی ہو، تو اس نصاب کا لحاظ کیا جائے گا، جو فقراء کے حق میں زیادہ نفع بخش ہو۔ اور آج کل یہ بات واضح ہے کہ چاندی کا لحاظ کرنے میں فقراء کا زیادہ فائدہ ہے؛ لہذا اب روپیہ، پیسہ، کرنسی اور مال تجارت میں چاندی کی قیمت کا لحاظ کیا جائے گا۔

" قال في التاتارخانية: "ذكر محمدٌ في الأصل : أنَّ المالک فيها بالخيار ، إن شاء قَوَّمَ بالدراهم وإن شاء قَوَّمَ بالدنانير، ولم يحک فيه خلاف، وعن أبي حنيفة : أنه يُقَوِّمُ بِمَا فيه إيجابُ الزكاة ، حتّٰى إذا بلغ بالتقويم بأحَدِهِمَا نصاباً ولمْ يبلغ بالآخر قَوَّمَ بما يبلغُ نصاباً ، وهو إحدى الروايتين عن محمد ، ولو كان بالتقويم بكلِّ واحدٍ يبلغُ نصاباً يُقَوِّمُ بما هو أنفع للفقراء من حيث الرواج ". (۱)

اسی طرح بدائع الصنائع اور المحيط البرهاني، درمختار وغیرہ کتب فقہیہ میں بھی ہے۔ (۲)

نصاب کے بارے میں ایک اہم تنبیہ

اوپر جو تفصیل عرض کی گئی اور فقہاء کی عبارات نقل کی گئیں، ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سونے، یا چاندی کے نصاب میں تو وزن کا اعتبار ہے، جب کہ کرنسی اور مال تجارت میں وزن کا نہیں ، بل کہ ان کی قیمت کا اعتبار ہے کہ ان کی قیمت سونے وچاندی کے

(۱) التاتارخانية:۳/۱۶۴

(۲) دیکھو: بدائع الصنائع:۲/۴۱۶. المحيط البرهاني:۲/۲۴۶. تبيين الحقائق: ۱/۲۷۹. الدر المختار:۳/۲۲۸-۲۳۰. البحر الرائق:۲/۲۴۶

نصاب کے برابر ہو۔

لہذا سونے و چاندی کی قیمت کے بڑھنے و گھٹنے کا کوئی اثر ان کے نصاب پر نہیں ہوگا؛ کیوں کہ ان میں ان کے وزن کا اعتبار ہے، خواہ ان کی قیمت کم ہو جائے یا بڑھ جائے، اس سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مثلاً ایک شخص کے پاس ساڑھے سات تولے سونا ہے، جس پر زکات واجب ہوتی ہے اور اس کی قیمت ایک لاکھ ہو، یا کبھی گھٹ کر پچاس ہزار رہ جائے، ہر دو صورتوں میں اس پر زکات آئے گی، اس کے برخلاف کسی کے پاس مثلاً پچیس ہزار کے کرنسی نوٹ ہیں، تو اگر یہ کرنسی نوٹوں کی قیمت چاندی کے نصاب کے برابر ہے، تو اس پر زکات عائد ہوگی اور اگر ان کی قیمت اس کے برابر نہ ہو، تو زکات نہیں آئے گی، مثلاً زید کے پاس جو رقم ہے، اس میں نصاب کے برابر چاندی آجاتی ہو، تو اس پر زکات ہے اور اگر نصاب کے برابر چاندی نہ آئے، تو اس پر زکات نہیں ہے۔

اسی طرح مال تجارت کا حکم بھی ہے کہ اس میں بھی یہ دیکھا جائے گا کہ اس کی قیمت چاندی کے نصاب کے برابر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو زکات آئے گی ورنہ نہیں۔



بحث ششم

زکات کے واجب ہونے کی شرطیں

بحث ششم
زکات کے واجب ہونے کی شرطیں

زکات واجب ہونے کی شرطیں کیا ہیں؟ علماء نے لکھا ہے کہ زکات کے فرض ہونے کی چند شرطیں ہیں، اگر وہ شرطیں موجود ہوں، تو زکات فرض ہوگی، اور اگر وہ شرطیں نہیں ہیں، تو زکات بھی فرض نہیں ہوگی۔ یہاں ان شرائط پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

(۱) نصاب کے برابر مال ہو

ان شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مال نصاب کے برابر ہو، اور اوپر یہ بیان کردیا گیا کہ نصاب کی مقدار کیا ہے، جس پر زکات فرض ہوتی ہے؟ لہذا اگر کسی کے پاس سونا تو ہے؛ مگر 87 گرام، 480 ملی گرام سے کم ہے، تو اس پر زکات نہیں ہے، اسی طرح ایک آدمی کے پاس چاندی تو ہے، مگر 612 گرام، 360 ملی گرام سے کم ہے، تو اس پر زکات نہیں۔ اسی طرح کسی کے پاس رقم، روپئے، پیسے تو ہیں، مگر وہ سونے یا چاندی کے نصاب کی قیمت کے برابر نہیں ہیں، تو اس پر بھی زکات نہیں ہے۔

چناں چہ ”بدایة المبتدی“ میں ہے کہ:

” لَيْسَ فيمَا دُوْنَ مِائَتَيْ دِرْهَمٍ صَدقةٌ .فإذا كانتْ مائتَيْن وَحالَ عليها الحول ففيها خَمْسَةُ دَرَاهم ....

.... و ليس فيما دُوْن عِشْرِيْنَ مِثْقالاً مِنَ الذَّهَب صَدَقَةٌ ، فإذا كانتْ عِشْرِيْنَ مِثْقالاً فَفِيْهَا نصفُ مِثْقَال ". (۱)

کچھ سونا اور کچھ چاندی ہوتو؟

لیکن یہاں ایک اہم مسئلہ جان لینا ضروری ہے، وہ یہ کہ یہ جو مسئلہ بیان کیا گیا، یہ اس صورت میں ہے جب کہ کسی کے پاس صرف سونا، یا صرف چاندی ہو، لہٰذا اگر وہ نصاب کے برابر ہے، تو وہ شخص زکات دے گا، ورنہ نہیں دے گا؛ لیکن اگر کسی کے پاس کچھ سونا ہے اور کچھ چاندی ہے، اگر چہ دونوں میں سے کوئی بھی نصاب کے برابر نہیں ہے، بل کہ نصاب سے کم ہے، تو اس صورت میں سونے اور چاندی دونوں کو ملا کر قیمت نکالی جائے گی، اگر دونوں کو ملا نے سے کسی ایک نصاب کے برابر ان کی قیمت ہو جائے، تو تب بھی زکات نکالنا لازم ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص کے پاس صرف چالیس گرام سونا اور تین سو گرام چاندی ہے، تو ظاہر ہے کہ کسی کا بھی نصاب مکمل نہیں ہے، لیکن اگر قیمت نکالیں، تو اس سونے اور چاندی کی قیمت آج کل کے حساب سے چاندی کے نصاب کے برابر ضرور ہو جائے گی؛ لہٰذا ایسی صورت میں بھی زکات فرض ہوگی۔

چناں چہ فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ سونے اور چاندی کو ایک دوسرے میں ضم کیا جائے گا، اسی طرح سامان تجارت کو بھی سونے یا چاندی میں ضم کیا جائے گا۔

امام مرغینانیؒ ''الهداية'' میں فرماتے ہیں کہ:

" وتُضَمُّ قيمةُ العُرُوضِ إلى الذَّهَبِ والفِضَّةِ حتّٰى يَتِمَّ النصابُ ، لأنَّ الوُجُوب في الكُلِّ باعتبار التجارة ، وإن افترقتْ جهةُ الإِعْدَاد، ويُضَمُّ الذهب إلى الفضة للمجانسة."(۲)

(۱) بداية المبتدي:۳۹

(۲) الهداية :۱۹۴/۲

اور"الاختيار لتعليل المختار"میں ہے کہ:

"ويُضَمُّ أحدُهُمَا إلى الآخر؛ لأنَّهما مُتَّحِدَان في معنى المَالِية والثَّمَنِيّة ، والزَّكاةُ تَعَلَّقَتْ بِهِمَا باعتبارِ المالية و الثمنية ، فيُضَمُّ نَظَراً للفقراء ." (۱)

نیز"كنز الدائق"اور اس کی شرح"البحر الرائق"میں ہے:

"وتُضَمُّ قيمةُ العروض إلى الثمنين والذهب إلى الفضة قيمةً، أما الأوّلُ فلأنَّ الوُجُوب في الكُلّ باعتبار التجارة وإن افترقتْ جهة الإعْدَادِ ، وأما الثاني فللمجانسة من حيث الثمنية. (۲)

صرف رقم ہونے پر مقدار نصاب کیا ہے؟

اسی سے ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیجیے کہ اگر کسی کے پاس سونا بھی نہیں ہے، چاندی بھی نہیں ہے، مگر روپیہ پیسہ ہے، جیسا کہ عام طور پر مردوں کے پاس ہوتا ہے، تو اس صورت میں بھی سونے یا چاندی میں سے کسی کے بھی نصاب کے برابر اس روپئے کی قیمت ہوجائے، تو اس پر زکات فرض ہوجائے گی۔

مثلاً ایک شخص کے پاس پچاس ہزار روپئے ہیں، تو آج کل اس سے سونے کا نصاب تو نہیں بنے گا؛ مگر چاندی کا نصاب بن جائے گا، یعنی اتنی رقم سے چاندی کے نصاب کی قیمت پوری ہوجاتی ہے؛ لہٰذا اس پر زکات واجب ہوجائے گی۔

اسی طرح اگر کسی کے پاس سونا، چاندی اور روپیہ تینوں ہیں، مگر کوئی بھی نصاب کے

---

(۱) الاختيار لتعليل المختار:۱/۱۱۱

(۲) البحر الرائق:۲/۴۰۰

برابر نہیں ہے، تب بھی یہ تینوں چوں کہ ایک ہی جنس مانے جاتے ہیں، لہذا ان کو ملا کر دیکھا جائے گا، کہ چاندی کے نصاب کی قیمت کو یہ تینوں مل کر پہنچ جاتے ہیں، تو اس پر زکات آئے گی۔

(۲) مال نامی یعنی بڑھنے والا ہو

زکات کے واجب ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ نصاب کے برابر جو مال ہے، وہ مال نامی (یعنی بڑھنے کی صلاحیت رکھتا) ہو، اس میں بڑھوتری ہوتی ہو، اور یہ بڑھنا کبھی تو حقیقی طور پر ہوتا ہے، جیسے کسی کے پاس اونٹ، یا گائے، یا بکری ہو، تو ان میں ایک کے دو اور دو کے چار ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ بڑھنا کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ اس مال میں صلاحیت بڑھنے کی ہوتی ہے جیسے روپیہ، پیسہ، سونا چاندی اور مال تجارت، کہ اگر ان کو کسی تجارت اور کاروبار میں لگایا جائے، انویسٹ کیا جائے، تو اس مال میں اضافہ ہو جائے گا۔ الغرض جو مال بھی بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس پر زکات فرض ہوگی اور جو مال نامی نہیں ہے، اور اس میں بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہے، اس مال پر زکات نہیں ہے۔

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ روپیہ پیسہ، سونا، چاندی مالِ نامی ہے؛ کیوں کہ سونے، چاندی اور روپے پیسے کو اللہ تعالیٰ نے مال کمانے اور بڑھانے کے ذریعہ کے طور پر ہی پیدا کیا ہے؛ لہذا کسی کے پاس یہ چیزیں موجود ہوں، تو اس پر زکات فرض ہوگی، خواہ وہ اس سے تجارت کی نیت کرے یا نہ کرے۔

اسی طرح جو بھی مال تجارت اور بیچنے کے لیے لیا ہو، وہ بھی مال نامی ہے؛ کیوں کہ اس سے بھی مال بڑھتا ہے۔

علامہ کاسانی ـ رحمہ اللہ ـ نے "بدائع الصنائع" میں لکھا ہے کہ:

" ومنها كونُ المال نامياً ؛لأن معنى الزكاة وهو النَّمَاء لايحصلُ إلَّا مِنَ المَالِ النَّامِي . ولسْنَا نَعْنِيْ به حقيقةَ النَّمَاء ؛ لأنَّ ذلك غيرُ معتبر ، وإنَّمَا نَعْنِيْ به كونَ المال مُعَدًّا

لِلاسْتِنمَاءِ بالتجارة أو بالإسامة ". (۱)

نیز علامہ کاسانی -رحمہ اللہ- لکھتے ہیں کہ

"دَلِيْلُنَا ؛ لأنَّ الزكاةَ عبارةٌ عن النَّمَاء ، وذلک من المَالِ النَّامِيْ على التفسير الذي ذَكَرْنَاهُ ، وهُوَ أنْ يكونَ مُعَدّاً لِلاسْتِنمَاء ، وذلک بالإعداد للإسامة في المواشي ، وللتجارةِ في أموال التجارة إلَّا أنَّ الإعْدَادَ للتجارة في الأثْمَانِ المُطْلَقَة من الذهب والفضة ثابتٌ بأصْلَ الخلقة ؛ لأنَّهَا لا تَصلحُ للانتفاع بأعْيَانِهَا في دَفْعِ الحَوَائِج الأصْلِيَّة ، فلا حَاجَةَ إلى الإعْدَادِ من العَبْد للتجارةِ بالنِّيَّة.................. وأمّا فيْمَا سِوَى الأثمَانِ من العُرُوْضِ فإنَّمَا يكونُ الإعداد فيها للتِّجَارَةِ بالنية ، الخ ". (۲)

اس کے برخلاف جو مال نامی نہ ہو، اس پر زکات نہیں ہے، جیسے ذاتی مکان، ذاتی دکان، سواری: کار، اسکوٹر وغیرہ، گھر میں استعمال کی جانے والی چیزیں جیسے برتن، صوفے، کرسیاں، قالین، پنکھے، فریج، واشنگ مشین، اسی طرح کپڑے، اناج وغلہ، ہیرے، جواہرات، وغیرہ، یہ سب ایسی چیزیں اور سامان ہیں، جن میں بڑھوتری نہیں ہوتی؛ لہذا یہ سب مال غیر نامی ہے، اس لیے ان پر زکات نہیں ہے۔

جیسا کہ "درر الحکام" میں ہے کہ

"ولا في دُوْرِ السُّكْنٰى ، ونحوها كَثِيَابِ البَدَن ، وأثَاثِ المَنْزِل ودَوَابِ الرُّكُوْب وعَبِيْدِ الخِدْمَة وكُتُبِ العلم لأهْلِهَا

(۱) بدائع الصنائع : الزكاة/فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ۳۹۴/۲

(۲) بدائع الصنائع :۳۹۵/۲

وَآلَاتِ الْمُحْتَرِفِيْن ". (۱)

کرائے پر چلانے والے مکان یا دکان کی مالیت پر زکات نہیں ہے

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی نے مکان یا دکان بنایا، یا خریدا، یا فلیٹ خریدا، یا بنوایا؛ مگر اس کا مقصد بیچنا نہیں ہے، بل کہ کرائے پر دینے کے لیے خریدا، یا بنوایا ہے، تو اس پر زکات ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ اس پر بھی زکات نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ تجارت کے لیے نہیں ہے۔ ہاں! اس سے جو کرایہ وصول ہوتا ہے، وہ اگر جمع کر کے رکھا، تو وہ اور روپے پیسے میں شامل ہو جائے گا اور اس کی زکات آئے گی، جب کہ وہ نصاب کے برابر ہو اور سال گزر جائے۔

''فتاوی التاتارخانية'' میں ہے کہ

" وفي فتاوی الشیخ الفقیه أبي اللیث : إذا اشْتَرٰی جَوَالِقَ بِعَشْرَةِ آلاف دِرْهَمٍ لِیُؤَاجِرَهَا مِنَ النَّاس فَحَال علیها الحَوْلُ لا زَكَاةَ فیها؛ لأنَّه اشْتَرَاهَا لِلْغَلَّة لا لِلتِّجَارَةِ ، فإنْ كانَ في نِیَّتِه أنّه یَبِیْعُهَا آخِراً فَلاَ عِبْرَةَ لِهٰذا ، وكذلك الجَوَابُ في إبل الحَمَّالِیْن وحُمُرِ المُكَارِیْن . (۲)

کرائے پر چلانے والی بس، کار وغیرہ کی مالیت پر زکات نہیں

اسی طرح اگر کسی نے کار، یا بس خریدی اور اس کو کرائے پر چلاتا ہے، تو اس کار اور بس کی مالیت پر زکات نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ بھی مال نامی نہیں ہے، جیسے کرائے پر چلانے والا مکان ہے۔ ہاں! اس کی آمدنی پر زکات آئے گی، جب کہ وہ سال بھر باقی رہے اور نصاب کے برابر ہو۔

---

(۱) درر الحكام: ۱/۱۷۲-۱۷۳

(۲) التاتارخانية: ۳/۱۶۹

ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیجیے کہ دکان میں، یا فیکٹری میں جو مشنریاں ہوتی ہیں، اوزار ہوتے ہیں، مال بردار ٹرک ہوتے ہیں، وہ بھی مال نامی نہیں ہے؛ لہذا ان پر بھی زکات نہیں ہے۔ یہ مسئلہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔

کراکری کے سامان پر زکات نہیں ہے

اسی طرح ایک اور مسئلہ قابل توجہ ہے کہ بعض لوگ مختلف قسم کی چیزوں کو کرایے پر دیتے ہیں، جیسے پنڈال و شامیانے، کرسیاں، شادی اور تقریبات کا سامان، پکوان کے برتن، وغیرہ، بل کہ آج یہ بہت بڑا بزنس ہے، تو کیا ان چیزوں پر زکات ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کرائے پر دی جانے والی چیزوں پر زکات نہیں ہے، کیوں کہ یہ چیزیں مال نامی نہیں ہیں، البتہ ان چیزوں سے جو کمائی ہوتی ہے، وہ اگر کھا پی کر بچے اور ایک سال گزر جائے، تو اس پر زکات آئے گی۔

''فتاوی خانیة'' اور ''فتاوی تاتارخانية'' میں ہے کہ:

" وَلَوْ اشْتَرٰی قُدُوْراً مِنْ صُفْرٍ يُمْسِكُهَا أَوْ يُؤَاجِرُهَا لا تَجِبُ فيها الزكاةُ كمَا لا تَجِبُ فِيْ بُيُوْتِ الغَلَّة ".(۱)

(۳) مال پر ملکیت تامہ ہو

وجوب زکات کی تیسری شرط یہ ہے کہ مال پر ملکیت تامہ ہو، یعنی آدمی مال کا مالک بھی ہو اور وہ اس کے قبضے میں بھی ہو، چاہے، وہ قبضہ حقیقی ہو، یا حکمی ہو۔

''الهداية'' میں ہے کہ

" الزكاة واجبةٌ على الحُرِّ العَاقِلِ البَالِغِ المُسْلِمِ ، إذا مَلَكَ نِصَاباً مِلْكاً تَامّاً ، وحَالَ عليه الحَوْلُ. "

(۱) الخانية ، فصلٌ في مال التجارة:۱/۲۲۱. التاتارخانية :۳/۱۶۹

(۲) الهداية :۲/۱۶۱

ملکیت تامہ کیا ہے؟

اب یہاں یہ سمجھنا ہے کہ ملکیت تامہ کا کیا مطلب ہے؟ ملکیت تامہ کی تفسیر یہ ہے کہ ایک آدمی مال کا مالک بھی ہو اور اس پر اس کا قبضہ بھی ہو، لہذا جو ایسا ہوگا وہ مکمل مالک ہے؛ لہذا جو مال اپنے قبضے میں نہ ہو، اس پر زکات نہیں ہے، جیسے مال مرھون یعنی جو چیز مال کے عوض میں گروی رکھی گئی ہو، اس پر زکات نہیں؛ کیوں کہ یہ چیز مالک کے قبضے میں نہیں ہے، جیسا کہ آگے عرض کیا جائے گا۔

''بدائع الصنائع ''میں علامہ کاسانیؒ نے لکھا ہے کہ

" ومنها المِلْکُ المُطْلَق وهو أن يَكُونَ مَمْلُوْكاً له رَقَبَةً ويَداً. ''(۱)

علامہ حدادی۔ رحمہ اللہ۔ ''الجوهرة النيرة ''میں لکھتے ہیں کہ

" لأنَّ المِلْکَ التَّامّ : هو ما اجتمع فيه المِلْکُ واليَد". (۲)

مالک تام کی اس سے زیادہ جامع تعریف فقہائے حنابلہ نے کی ہے کہ:

" المِلْکُ التَّامُّ عِبارَةٌ عَمَّا كانَ بِيَدِهِ لَمْ يَتَعَلَّقْ فيه حَقُّ غَيْرِهِ، يَتَصَرَّفُ فيه عَلَى حَسبِ اخْتِيَارِه ، وفَوَائِدُه حَاصِلَةٌ له ". (۳)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملک تام یہ ہے کہ جو مال اس کے مالک کے ہاتھ میں ہو اور اس میں کسی اور کا کوئی حق نہ ہو اور اس میں تصرف کا اختیار اس کو حاصل ہو اور اس کے فوائد اس کو میسر ہوں۔

---

(۱) بدائع الصنائع : الزكاة/فصل الشرائط التي ترجع إلى المال، ۳۹۰/۲

(۲) الجوهرة النيرة :۲۸۵/۱

(۳) المبدع في شرح المقنع :۲۹۶/۲. كشف القناع :۹/۲

مالِ حرام پر زکات ہے؟

اوراسی شرط وجوب زکات کے نتیجے میں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خالص حرام مال جیسے: رشوت، غصب، سود، یاچوری وغیرہ کا مال چوں کہ ملکیت میں نہیں آتا؛ لہٰذا اس پر بھی زکات نہیں ہے؛ البتہ اس حرام مال کو اولاً ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی، جن کا یہ مال ہے اوراگر پتہ نہ چلے تو پھر فقراء پر کل کا کل مال صدقہ کرنا واجب ہے۔

علامہ شامی نے لکھا ہے:

" في القنية : لو كان الخبيثُ نِصَاباً لا يلزمه الزكاةُ لأنَّ الكُلَّ واجبُ التَّصَدُّق عليه، فلا يُفِيْدُ إيجابَ التَّصَدُّق بِبَعْضِه، ومثلُه في البزازية."(۱)

علامہ شامی-رحمہ اللہ- نے اس کو حاشیہ " البحر الرائق "پر نقل کر کے شرنبلالی سے یہ بھی نقل کیا ہے:

" وبه صرّح في شرح المنظومة ويجب عليه تفريغُ ذِمَّتِه بِرَدِّهِ إلى أرْبَابِه إنْ عُلِمُوْا وإلَّا إلى الفُقَرَاء. "(۲)

غرض خالص مال حرام واجب التصدق ہے، اور اس پر زکات نہیں ہے اور دی جائے تو مقبول بھی نہیں ہے۔

حدیث میں ہے : « لاَ يَقْبَلُ اللّٰهُ إلَّا الطَّيِّبَ » (۳)

اوراس کی توجیہ یہی کی گئی ہے کہ یہ مال حرام اس شخص کی ملکیت میں نہیں ہے،

---

(۱) الشامي على الدر المختار :۳/ ۲۱۸

(۲) منحة الخالق على البحر الرائق:۲/ ۳۶۰

(۳) البخاري : الزكاة / باب الصدقة من كسب طيب ، ح :۱۴۱۰، مسلم : الزكاة/ باب قبول الصدقة من الكسب الطيب ، ح:۱۰۱۴

جس نے غلط طریقہ سے اس کو حاصل کیا ہے۔

امام ابن حجر-رحمہ اللہ- نے امام قرطبی-رحمہ اللہ- سے نقل کیا ہے:

"وإنَّمَا لا يَقْبَلُ اللّٰهُ الصدقةَ بالحَرَام ؛ لأنَّه غَيْرُ مملوكٍ للمُتَصَدِّق وهو مَمْنُوْعٌ من التصرف فيه ، والمُتَصَدَّقُ به مُتَصَرِّف فيه." (۱)

غرض یہ کہ مال حرام ملکیت میں نہیں آتا؛ لہٰذا اس مال پر زکات واجب نہیں ہے۔

مالِ مخلوط بالحرام پر زکات

البتہ ایسے مال پر زکات واجب ہوگی، جو مال حرام سے مخلوط ہو اور دونوں مالوں میں امتیاز مشکل ہو جائے؛ کیوں کہ اپنے حلال مال کے ساتھ حرام مال ملانے سے یہ مال حرام بھی اس کی ملک میں داخل ہو جائے گا؛ لہٰذا اس مخلوط مال پر زکات واجب ہوگی۔

علامہ ابن نجیم-رحمہ اللہ- نے لکھا ہے:

" وفي فتح القدير و غيره: لا يخرج عن ملك النصاب المذكور ما ملك بسبب خبيث و لذا قالوا: لو أن سلطاناً غصب مالًا وخلطه صار ملكاً له حتي و جبت عليه الزكاة."(۲)

یہ قول امام ابو حنیفہ-رحمہ اللہ- کا ہے اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد-رحمہما اللہ-) کے مسلک پر اس مال مخلوط پر بھی زکات واجب نہ ہوگی؛ کیوں کہ ان کے نزدیک ملک ثابت نہیں ہے۔

علامہ ابن نجیم-رحمہ اللہ-اسی موقعے پر لکھتے ہیں:

(۱) فتح الباري:۳/۲۷۹

(۲) البحر الرائق :۲/۳۵۹

" أما على قو لهما فلا يثبت الملک."

لیکن امام صاحب کے قول پر بھی مخلوط مال پر وجوب زکات اس صورت پر ہے، جب کہ مال مخلوط کے سوا بھی نصاب زکات ہو؛ اگر مخلوط مال کے سوا کوئی اور نصاب اس شخص کے پاس نہ ہو، تو اس میں زکات نہیں ہے۔

علامہ شامی۔ رحمہ اللہ۔ نے "فتاوی التاتارخانية" سے نقل کیا ہے:

" مَنْ مَلَکَ أمْوَالاً غَيْرَ طَيِّبَةٍ، أو غَصَبَ أمْوالاً و خَلَّطَهَا مَلَكَهَا بالخَلْط و يَصِيْرُ ضَامِناً ؛ وإنْ لَمْ يكن له سِوَاهَا نصابٌ ، فلا زكاةَ عليه فيها وإن بلغتْ نِصَاباً ."(۱)

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غیروں کے جو اموال اس نے اپنے مال میں ملا دیے ہیں، وہ غیروں کو واپس کرنا لازم ہے؛ لہٰذا یہ مدیون ہوا اور مدیون کا مال اگر دین سے زائد نہ ہو، تو اس میں زکات نہیں ہے۔ چناں چہ "تاتارخانیہ" میں لکھا ہے:

" لأنه مديونٌ و مالُ المديون لا ينعقد سَبَباً لوُجُوب الزكاة عندنا ." (۲)

اس توضیح سے مخلوط مال پر وجوب زکات کے قول پر جو اشکال علامہ ابن نجیم۔ رحمہ اللہ۔ نے "البحر الرائق" میں پیدا کیا ہے، وہ ختم ہو گیا، انھوں نے اشکال یہ کیا ہے:

" وهو مشكلٌ ؛ لأنَّه وإنْ كانَ مِلْكُه عند أبي حنيفة بالخَلْطِ فهو مَشْغُوْلٌ بالدين والشَّرْطُ الفَرَاغُ عنه ، فينبغي أن لا تَجِبَ الزكاةُ فيه على قوله ."

(۱) الشامي :۲۱۸/۳

(۲) الشامي :۲۱۸/۳

(۳) البحرالرائق :۳۵۹/۲

(خلط سے امام صاحب -رحمہ اللہ- کے نزدیک ملک تو ثابت ہو جاتی ہے، مگر چوں کہ یہ مال مشغول بالدین ہے اور وجوب زکات کی شرط دین سے فارغ ہونا ہے، اس لیے اس مخلوط مال پر زکات نہ ہونا چاہیے۔)

مگر اوپر کی وضاحت نے بتا دیا کہ یہ وجوب اس وقت ہے، جب کہ اس مال کے سوا دوسرا مال نصاب موجود ہو؛ لہٰذا اشکال ختم ہو گیا؛ لیکن یہ قول علامہ شامی -رحمہ اللہ- "تاتارخانیۃ" کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زکات اس زائد مال نصاب میں واجب ہوگی، نہ کہ اس مخلوط مال میں۔

" لكن لايخفى أن الزكاة حينئذٍ إنما تجب فيما زاد عليها لا فيها."(۱)

لہٰذا خلاصہ یہ نکلا کہ مخلوط مال سے زائد مال نصاب کے برابر اگر ہے، تو اس زائد مال پر زکات آئے گی اور مخلوط مال میں زکات نہ ہوگی؛ کیوں کہ اس کا اس کے حق داروں کو لوٹانا واجب ہے، البتہ مال مخلوط پر اس وقت ضرور زکات واجب ہو جائے گی، جب کہ اس کے حقدار لوگ اس شخص کو بری کر دیں، چناں چہ "البحر الرائق" میں "المبتغی" کے حوالہ سے یہ قید نقل کر کے اس کو قید حسن قرار دیا ہے۔ (۲)

اسی طرح اس وقت بھی اس مال میں زکات ہوگی، جب کہ ان حرام اموال کے مالک معلوم نہ ہوں۔

علامہ شامی -رحمہ اللہ- نے حاشیہ "البحر الرائق" اور حاشیہ "الدر المختار" دونوں میں اپنے شیخ سے نقل کیا ہے:

" بأن المراد ما إذا لم يعلم أصحاب الأموال المغصوبة؛

(۱) دیکھو : الشامي :۳/ ۲۱۸

(۲) البحر الرائق :۲/ ۳۶۰

لأن الدين إنما يمنع وجوب الزكاة إذا كان له مطالب من جهة العباد و بجهل أصحابه لا يبقى له مطالب فلا يمنع وجوبها." (۱)

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ مال مخلوط بالحرام پر دوصورتوں میں زکات آتی ہے:

(۱) ایک تو اس صورت میں جب کہ اس حرام مال کے حق دار بری کردیں۔

(۲) دوسرے اس وقت جب کہ اس کے اصحاب وحق دار معلوم نہ ہوں۔

ان دو کے علاوہ باقی اور صورتوں میں اس پر زکات تو واجب نہ ہوگی ؛ البتہ اس پر حرام اموال کو ان لوگوں تک پہنچانا ضروری ہوگا، جن کے یہ اموال ہیں۔ واللہ أعلم

گراجویٹی (Gratuity) پر زکات کا حکم

جب یہ معلوم ہوگیا کہ جو چیز اپنی ملکیت میں ہو، زکات اسی پر عائد ہوتی ہے، اور یہ وجوب زکات کی ایک اہم شرط ہے، تو یہاں سے گراجویٹی (Gratuity) جس کو عربی میں "مکافاة نهاية الخدمة" کہتے ہیں، اس پر زکات کا حکم بھی معلوم ہوگیا کہ اس پر زکات عائد نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ تو ابھی ملکیت ہی میں نہیں آئی ہے۔

کیوں کہ یہ ایک ایسی رقم ہوتی ہے، جو سرکاری، یا غیر سرکاری اداروں میں خدمت کرنے والے ملازمین کو ملازمت سے سبکدوشی پر، یا ریٹائرمنٹ پر یک مشت دی جاتی ہے۔ یہ آجکل کے قانون کے لحاظ سے ایک لازمی حق مانا گیا ہے، جو ملازمین کو ریٹائرمنٹ پر یا سبکدوشی پر ملتا ہے ؛ مگر اس میں یہ بات واضح ہے کہ جب تک یہ رقم ملازم کو نہیں مل جاتی، وہ اس کا مالک نہیں ہوتا ؛ لہذا ملنے سے پہلے اس رقم پر زکات واجب نہیں ہوگی، ہاں ! ملنے کے بعد حسب قواعد شرعیہ اس پر سال گزرنے کے بعد، یا اپنے پاس پہلے سے مال ہو، تو اس کی زکات کے ساتھ اس پر بھی زکات آئے گی۔

---

(۱) الشامي : حاشية البحر الرائق:۲/۳۶۰، ورد المحتار:۳/۲۱۸

اگر چہ گراجویٹی (Gratuity) کی حقیقت کیا ہے؟ اس سلسلے میں عصر حاضر کے علماء میں متعدد آراء پائے جاتے ہیں:

(۱) بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ رقم ملازم کی اجرت کا ایک حصہ ہے، جس کو بعد میں دینے کا معاہدہ تھا؛ لہذا یہ دین کے حکم میں ہے؛ لہذا اس پر زکات عائد ہوگی۔ شیخ یوسف القرضاوی کی یہی رائے ہے۔(۱)

(۲) اکثر فقہاء معاصرین کا کہنا ہے کہ گراجویٹی دراصل ایک احسان ہے، جس کا سرکاری، یا غیر سرکاری ادارہ التزام کرتا ہے، کہ وہ اپنے ملازم کو ریٹائرمنٹ پر دے گا، یہ کوئی اس کی اجرت کا حصہ نہیں ہے، بل کہ ایک تبرع ہے۔

شیخ وھبہ الزحیلی نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ:

"وحينئذٍ لا أرى الزَّكَاةَ فيها إذا كان الشخصُ مُوَظَّفاً لَدَى الحُكُومَة إلَّا بعدَ قبضِهَا ومُرُوْرِ حولٍ تَامٍّ على ادِّخَارِهَا أو تُضَمُّ إلى الواجب الزكوي إن وُجِدَ كالمَال المُستَفَاد في أثناء الحَوْل ، ويُخرِجُ المَالِكُ الزكاةَ على ما كان يملك من نُقُوْدٍ وعلى ما دَخَلَ في ذِمَّتِه مِنْ هِبَاتٍ اوْ تَبَرُّعَاتٍ أو مُستَحقَّاتٍ قَانُوْنِيَّةٍ مشروعةٍ".

اور مجمع الفقہ الاسلامی (جدہ) نے دُبئی میں منعقدہ اپنے ایک فقہی سمینار مورخہ: ۳۰ر صفر تا ۵ر ربیع الاول ۱۴۲۶ء میں اسی کو اختیار کیا اور اسی کے مطابق قرارداد منظور کی ہے، اس قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:

" ولا تجبُ زكاتُهَا على المُوَظَّف أو العَامِل طوالَ مُدَّة الخِدْمَةِ ، لِعَدَمِ تَحَقُّقِ المِلْكِ التَّامِّ ، وإذا صَدَرَ قَرَارٌ بتحديدها

(۱) فقه الزكاة :۱/۱۳۹

(۲) مجلة الفقه الإسلامي :۱۶/۱/۵۴

و تسليمها للمُوَظَّف أو العامل دفعةً واحدةً أو على فَتَرَاتٍ دوريَّةٍ أصْبَحَ ملكُه لها تَامًّا ، فيُضَمُّها إلى موجوداته الزكوية .(۱)

لہذا اگراجویٹی پر وصولی سے پہلے زکات نہیں ہے، بل کہ وصولی کے بعد یا تو سال گزرنے کے بعدزکات عائد ہوگی، جب کہ اس شخص کے پاس کوئی اور مال قابل زکات موجود نہ ہو، اوراگر پہلے سے قابل زکات مال ہو،تواسی کے ساتھ اس کی بھی زکات دی جائے گی۔

پنشن کی رقم پر زکات

اسی سے ایک مسئلہ یہ بھی مفہوم ہوا کہ ملازمین کو جو ریٹائرمنٹ کے بعد ماہانہ پنشن ملتی ہے جس کو عربی میں "الراتب التقاعدي" کہتے ہیں، اوراس کے انتقال کے بعداس کی بیوی، یااولاد کوملتی ہے، اس پر بھی زکات عائد نہیں ہوتی؛ کیوں کہ وہ رقم بھی جب تک وصول نہ ہو، اس کی ملکیت میں نہیں آتی ، اور نہ وہ اس کے لیے وصولی سے پہلے قابل تصرف و انتفاع ہے۔اور یہ سیاسی حالات کی وجہ سے کبھی موقوف بھی ہوسکتی ہے، اسی طرح اس کی مختلف شرائط کی وجہ سے بھی موقوف ہوجانے، یا کم ہوجانے کا امکان رہتا ہے، الغرض چوں کہ یہ مال اپنی ملکیت میں نہیں ہے، یا ملکیت تامہ اس پر حاصل نہیں ہے؛ لہذا اس پر بھی وصول ہونے سے پہلے زکات نہیں اور وصول ہونے کے بعد ایک سال باقی رہے، تو سال کے بعد، یا دیگر مال پہلے سے موجود ہو، تو اس کے ساتھ ملا کر اس کی زکات دی جائے گی۔

شیخ وھبہ الزحیلی کی یہی رائے ہے، اسی طرح شیخ دکتور عجیل جاسم النشمی ، دکتور احمد بن عبد العزیز الحداد، دکتور محمد نبیل غنائم نے بھی اپنی ابحاث میں اسی کو اختیار کیا ہے، جیسا کہ مجلۃ الفقہ الاسلامی میں ان کے مقالات سے معلوم ہوتا ہے۔(۲)

شیخ وھبہ الزحیلی نے اپنے مقالے: "زكاة الأموال المجمدة " میں بحث

(۱) مجلة الفقه الإسلامي:۳۲۳/۱/۱٦

(۲) دیکھو: مجلة مجمع الفقه الاسلامي: عدد :۱٦، جز اول

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”وأرى أنَّه لا زكاةَ على الراتب التقاعدي في أثناء الخدمة ، مثل الراتب الأصلي لِعجْزِ مُسْتَحِقِّه عن التصرف أو الانتفاع به في أي وقت يشاء ، ولأنَّ الحصول عليه مقيد بشروط ، وقد يَحْرُمُ منه لأَسْبَابٍ سِيَاسِيةٍ كما يحدث فعلاً أو لأسبابٍ و شُرُوطٍ تَتَعَلَّقُ بالوضع الصِّحِّي كفحص يطلب منه ويتفاوتُ مِقْدَارُه بحسب مُدَّة التَّوَظُّف وعامل السن وغير ذلك كالاستقالة.(۱)

شیخ وھبہ الزحیلی نے آگے پنشن کو ”مال ضمار“ (جو مال گم ہوگیا ہو) کے مشابہ قرار دیا ہے اور کہا کہ مال ضمار میں زکات نہیں ہے، مگر احقر کہتا ہے کہ یہ بات تو صحیح ہے کہ پنشن کی رقم پر زکات نہیں، مگر اس کو مال ضمار سے مشابہ قرار دینا صحیح نہیں؛ کیوں کہ مال ضمار تو وہ ہے جو اپنی ملکیت میں تھا اور وہ گم ہوگیا، اور پنشن کی رقم تو ملازم کی ملکیت میں داخل ہی نہیں ہوتی، لہذا پنشن پر زکات نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آدمی اس کا مالک ہی سرے سے ہوتا نہیں، جب تک کہ وہ وصول نہ ہو جائے۔

گروی رکھی ہوئی چیز پر زکات نہیں

اوپر یہ بات بیان کی گئی تھی کہ زکات اس مال پر واجب ہوتی ہے، جس پر ملکیت تامہ حاصل ہو، اور ملکیت تامہ کا معنی یہ بتایا تھا کہ جس مال پر ملکیت بھی ہو اور قبضہ بھی ہو۔ اوپر وہ مثالیں آئیں، جن میں آدمی کو ملکیت ہی حاصل نہیں ہے۔

اور جو مال ملکیت میں ہو، مگر قبضے میں نہیں، اس کی مثال گروی رکھی ہوئی چیز ہے،

---

(۱) مجلة مجمع الفقه الإسلامي :۵۸/۱/۱۶

مثلاً کسی نے اپنا زیور کسی کے پاس گروی رکھ کر اس پر کچھ قرض لے لیا، تو اس زیور پر زکات نہیں آئے گی، جب تک کہ وہ گروی سے چھڑا نہ لیا جائے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ زیور اگرچہ کہ اس کی ملکیت میں ہے، مگر اس کے قبضے میں نہیں ہے اور جب تک وہ قرض واپس نہیں کرے گا، یہ زیور اسے واپس نہیں ملے گا؛ لہذا جب تک وہ زیور گروی ہے، اس پر زکات نہیں آئے گی۔

پھر جو قرض اس پر لیا ہے، وہ اس چیز کی قیمت سے کم ہو یا زیادہ ہو، دونوں صورتوں کا یہی حکم ہے کہ اس پر زکات گزشتہ سالوں کی نہیں آئے گی۔

علامہ طحطاویؒ نے صاحب البحر کے اس قول پر کہ وجوب زکات کے موانع میں سے رھن بھی ایک ہے، اس پر لکھا ہے کہ

"وظاهره: ولو كان الرهن أزيد من الدين." (۱)

اور شامی نے بھی ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔ (۲)

مکان یا دکان کے اڈوانس کی رقم پر زکات کا مسئلہ

ایک اور مثال لیجیے کہ ایک مکان کرایے پر لینے کے لیے جو رقم اڈوانس کے طور پر مالک مکان کو دی جاتی ہے، اس کا مالک تو یہ کرایے پر مکان لینے والا ہے، مگر فی الحال اس کا قبضہ اس پر نہیں ہے؛ اس لیے اکثر علماء کے نزدیک اڈوانس کی رقم پر زکات نہیں آئے گی؛ نہ گھر کے مالک پر آئے گی، نہ کرائے دار پر آئے گی؛ کیوں کہ گھر کا مالک تو اس رقم کا مالک نہیں ہے اور کرایہ دار مالک تو ہے، مگر وہ رقم اس کے قبضے میں نہیں ہے، جیسے مال مرھون۔

اس سلسلے میں اصل بحث یہ ہے کہ اڈوانس کی اس رقم کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ اس پر احقر نے اپنے رسالے "احکام زکات" میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے

(۱) حاشية الطحطاوي على الدر المختار :۱۶۰/۳

(۲) رد المحتار:۱۸۰/۳

کہ اس رقم کے متعلق متعدد احتمالات ہیں:

(۱) ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ قرض ہو؛ مگر تعامل اور عرف اس کا رد کرتے ہیں؛ کیوں کہ قرض میں میعاد مقرر نہیں ہو سکتی، فقہا نے لکھا ہے:

"كُلُّ دَيْنٍ حالٌّ إذَا أجّلَه صَاحِبُه صَارَ مُؤجّلاً إلّا القَرْض، فإنّ تأجِيلَه لا يَصِحُّ ."(۱)

اور جب چاہے واپس کیا جاسکتا ہے اور اڈوانس کی رقم میں یہ بات مفقود ہے؛ لہٰذا یہ قرض نہیں ہے۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ امانت یا ودیعت ہو؛ مگر یہ احتمال بھی اس لیے صحیح نہیں کہ امانت اگر بغیر تعدی کے تلف ہو جائے، تو اس کا ضمان نہیں آتا۔

چناں چہ صاحب "هداية" لکھتے ہیں:

" الوَدِيْعَةُ أمانةٌ فِيْ يَدِ المُوْدَعِ إذَا هَلَكَتْ لَمْ يَضْمَنْهَا ."(۲)

اسی طرح امام ابن قدامہ حنبلی اور ابو اسحاق شیرازی شافعی نے بھی لکھا ہے کہ ودیعت امانت ہے اور وہ بلا تعدی ہلاک ہو جائے، تو اس کا ضمان نہیں آتا۔(۳)

مگر اڈوانس کے سلسلہ میں عرف اور عادت سے ثابت ہے کہ یہ رقم ہر صورت میں واجب الادا ہوتی ہے؛ خواہ وہ تلف ہی کیوں نہ ہو جائے اور خواہ تعدی کی صورت ہو یا نہ ہو؛ لہٰذا اس کو امانت و ودیعت بھی نہیں کہہ سکتے۔

(۳) تیسرا احتمال اس کے بارے میں یہ ہے کہ یہ رقم عاریت ہو؛ لیکن یہ بھی صحیح نہیں، ایک تو اس وجہ سے کہ عاریت میں بھی مالک کو ہر وقت رجوع کا حق ہوتا ہے، اور

---

(۱) الهداية :۵/۱۷۶، قبيل باب الربا. البحر الرائق:۶/۲۰۲، باب المرابحة والتولية . فتح القدير:۶/۴۸۴

(۲) الهداية :۶/۲۱۱، كتاب الوديعة

(۳) دیکھو:المغني :۹/۲۵۷، المهذب :۳/۳۸۶

اڈوانس میں یہ بات نہیں ہے۔

دوسرے عاریت بھی مثل ودیعت امانت ہے، جس کے بغیر تعدی ہلاک وتلف ہوجانے سے ضمان لازم نہیں آتا۔

صاحب ہدایہ اپنی کتاب "بدایة المبتدي" میں لکھتے ہیں:

" ولِلْمُعِيْر أنْ يَرْجعَ في العَارِيَة متىٰ شَاءَ، والعَاريةُ أمانةٌ إنْ هلكتْ من غير تَعَدٍّ لَمْ يَضْمَن. "(۱)

اور یہ ظاہر ہے کہ اڈوانس کی رقم ہلاک وتلف ہوجانے کی صورت میں بھی واجب الادا شمار ہوتی ہے۔

تیسرے علما نے لکھا ہے کہ عاریت اگر دراہم و دنانیر، یا مکیلی، یا موزونی، یا معدودی شیٔ ہو، تو وہ قرض کے حکم میں ہوتی ہے۔

چناں چہ فقہا نے لکھا ہے:

"وعَارِيةُ الدَّرَاهِم و الدَّنَانِيْر والمَكِيلِ والفُلُوْس والمَوْزُوْن والمَعْدُوْد قرضٌ ."(۲)

لہٰذا اڈوانس کی رقم کو عاریت کہنے کی صورت میں بھی وہ قرض ہی کہلائے گی اور اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اڈوانس کی رقم کے بارے میں یہ احتمال عرف وعادت کی رو سے صحیح نہیں؛ لہٰذا اڈوانس کی رقم عاریت میں بھی داخل نہیں ہوسکتی۔

(۴) اس سلسلہ میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ اڈوانس کی رقم رہن ہو اور یہ احتمال کافی حد تک اس رقم اڈوانس پر منطبق ہوسکتا ہے، ایک تو اس لیے کہ شئے مرہون جس طرح مضمون ہوتی ہے، اسی طرح اڈوانس کی رقم بھی مضمون ہوتی ہے۔ دوسرے اس لیے کہ

(۱) بدایة المبتدي :۱/۲۰۶، کتاب العاریة

(۲) الهدایة:۶/۲۳۵، کتاب العاریة. المبسوط:۱۱/۱۴۵

"شی مرہون" کی واپسی جس طرح اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ "مرہون بہ" (دَین) کو واپس نہ کیا جائے، اسی طرح اڈوانس کی رقم بھی اس وقت تک واپس نہیں ہوتی جب تک کہ کرایہ دار، گھر، یا دکان مالک کے حوالے نہ کردے۔ تیسرے اس لیے کہ رھن میں جس طرح "شیٔ مرھون" کو مرتھن کے پاس رکھنے کا مقصد مرتھن کے دل میں وثوق پیدا کرنا ہے، اسی طرح اڈوانس دینے کا بھی یہی مقصد ہے۔

جب یہ واضح ہوگیا کہ اڈوانس کی رقم "شی مرھون" کے مشابہ ہے، تو اب اس کے بارے میں زکات کا حکم معلوم کرنا آسان ہوگیا۔ علما نے لکھا ہے کہ "شی مرہون" اگر مرتھن کے قبضے میں ہو، تو اس پر زکات نہیں ہے؛ کیوں کہ زکات کے وجوب کی ایک شرط — جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا — ملک تام ہے اور ملک تام نام ہے مال کے مملوک ومقبوض ہونے کا اور شی مرھون چوں کہ مالک کے قبضے میں نہیں ہے، اس لیے اس پر ملک تام نہیں؛ لہٰذا اس پر زکات واجب نہ ہوگی۔

علامہ ابن نجیم -رحمہ اللہ- نے لکھا ہے:

" وَمِنْ مَوَانِعِ الوُجُوْب الرَّهْنُ إذا كانَ فِي يَدِ المُرْتَهِن لِعَدَمِ مِلْكِ اليَد."(۱)

درمختار و ردالمحتار میں ہے:

" وَلاَ فِيْ مَرْهُوْن ؛ أي لا عَلَى المُرْتَهِن لِعَدَمِ مِلْكِ الرَّقبةِ ، ولا عَلَى الرَّاهِنِ لِعَدَمِ اليَد". (۲)

بالکل اسی طرح اڈوانس کی رقم پر بھی زکات نہیں ہے، نہ مالک پر؛ کیوں کہ مالک کے قبضہ میں نہیں ہے اور نہ راہن پر؛ اس لیے کہ وہ اس کا مالک ہی نہیں۔ واللہ أعلم

(۱) البحر الرائق :۲/۳۵۵

(۲) الدر المختار و رد المحتار:۳/۱۸۰

لیکن اس مسئلے میں موجودہ دور کے فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر تو وہی کہتے ہیں جو میں نے ابھی عرض کیا ہے، لیکن بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس رقم کی زکات کرایہ دار پر آئے گی؛ لہٰذا میں عرض کرتا ہوں کہ اگر کسی کو اللہ نے سہولت دی ہے، تو وہ اڈوانس کی رقم کی زکات بھی دیدے تو اچھا ہے اور اگر کسی کو سہولت نہیں ہے، تو وہ جمہور کے قول پر عمل کرے اور زکات نہ دے، تو گنجائش ہے۔

الکٹرک ڈپارٹمنٹ یا کسی اور سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کو دیے گئے زرِ ضمانت پر زکات

یہیں سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ بعض اوقات الکٹرک ڈپارٹمنٹ کو الکٹرک میٹر لینے یا دوسرے کسی ادارے کو کسی کام کے لیے بطور ڈپازٹ رقم دی جاتی ہے — جس کے بارے میں یہ طے ہوتا ہے کہ جب وہ چیز واپس کردیں گے، تو وہ رقم بھی لوٹا دی جائے گی — اس پر بھی قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے زکات عائد نہ ہوگی، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ ہاں! جب وہ واپس مل جائے، تو ایک سال کے بعد اس پر زکات عائد ہوگی، یا کوئی پہلے سے صاحب نصاب ہے، تو اس کے اس مال کے ساتھ ملا کر اس کی بھی زکات دی جائے گی۔

پراوِڈنٹ فنڈ (PF) پر زکات کا مسئلہ

یہیں سے ایک اور مسئلے کا جواب نکل آتا ہے، وہ یہ کہ پراوڈنٹ فنڈ (PF) پر زکات ہے، یا نہیں؟ پراوڈنٹ فنڈ جس کا شارٹ فارم: پی، یف، ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور کمپنیوں میں ملازمین وایمپلائیز کی تنخواہ سے ایک حصہ کاٹ لیا جاتا ہے اور بعد میں سرکار، یا کمپنی اس میں اپنی طرف سے کچھ رقم ملا کر ملازم کو دیتی ہے اور بعض وقت اس میں مزید رقم انٹرسٹ کے نام سے بھی دی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں سوال یہ ہے کہ کیا اس رقم پر زکات ہے؟

پہلے جان لیں کہ ''پی ایف'' دو قسم کا ہے: ایک لازمی (compulsary) اور دوسرا اختیاری (Optional)، جو لازمی ہے اور ملازم کی تنخواہ سے کاٹ کر کمپنی یا سرکار اس کے کھاتے میں جمع کرتی ہے، اس پر گذشتہ سالوں کی زکات نہیں ہے؛ بل کہ اس کے قبضے میں آنے کے ایک سال بعد اس پر زکات آئے گی، جب کہ وہ رقم استعمال میں آئے بغیر سال تک جمع رہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تنخواہ سے جو رقم از خود سرکار، یا کمپنی نے کاٹ لی اور ابھی ملازم کو نہیں دی، تو وہ رقم اس کے قبضے میں ہی نہیں آئی؛ بل کہ اس کی ملکیت میں بھی داخل نہیں ہوئی۔ ہاں! یہ رقم اس شخص کا حق ہے، جو اس کے کام کے بدلے اس کو ملنا ہے؛ لہذا یہ دین کے حکم میں ہوئی۔ اور دین کی فقہاء نے تین قسمیں بیان کی ہیں: قوی، متوسط اور ضعیف، اور یہ دین ضعیف یا متوسط کے حکم میں ہے، جس پر امام ابوحنیفہ کے نزدیک گذشتہ سالوں کی زکات نہیں آتی؛ بل کہ یہ رقم ملنے کے بعد آئندہ سال کی زکات اس پر آئے گی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب -رحمہ اللہ- نے اس مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، اور خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ پراوڈنٹ فنڈ میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ وہ دین متوسط ہو اور دوسرے یہ کہ اس کو دین ضعیف قرار دیا جائے اور دین ضعیف ہونے کا احتمال راجح ہے، لہذا اس راجح احتمال کی بنیاد پر تو اس پر زکات واجب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں، اور اگر اسے دین متوسط قرار دیا جائے، تب بھی امام کرخی، صاحب بدائع اور صاحب غایۃ البیان کی تصریح کے مطابق اصح روایت یہی ہے کہ اس پر سنین ماضیہ کی زکات واجب نہیں ہوتی، علامہ شامی کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے؛ البتہ صاحب بحر نے دین متوسط پر زکات کے وجوب کو ترجیح دی ہے،............لہذا امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق پراوِڈنٹ فنڈ

پر زکات سالہائے گذشتہ کی واجب نہیں ہوتی۔ (1)

اور دوسری صورت پی یف (PF) کی یہ ہے کہ ملازم خود اپنی مرضی سے اپنی تنخواہ کا ایک حصہ کٹاتا اور پی یف میں جمع کراتا ہے۔ اس رقم کا مسئلہ یہ ہے کہ اس رقم پر ہر سال زکات آئے گی؛ کیوں کہ یہ رقم اس نے اپنی تنخواہ میں سے از خود کٹائی ہے، تو اسے حکماً قبضہ مانا جائے گا اور جب اس کو اس پر قبضہ حاصل ہے اور اس نے وہ رقم اس فنڈ میں جمع کی ہے تو اس کی زکات بھی اس پر ہر سال لازم آئے گی، جس طرح بینک میں رکھی ہوئی رقم پر ہر سال زکات واجب ہوگی؛ کیوں کہ یہ دین قوی کے حکم میں ہوگی، اور دین قوی کا حکم یہ ہے کہ اس کی زکات ہر سال واجب ہوتی ہے، ہاں! اس کی ادائیگی میں یہ گنجائش ہے کہ ملنے کے بعد ادا کرے۔

پراوِڈنٹ پر زکات کے مسئلے کی تفصیل کسی کو دیکھنا ہو، تو میرے رسالے ''احکام زکات'' میں دیکھ لیں، اس میں میں نے اس مسئلے پر تفصیل سے لکھا ہے۔

قبضہ کی دو قسمیں: حقیقی و حکمی

اوپر یہ بیان کیا گیا تھا کہ وجوب زکات کے لیے ملکیت تامہ شرط ہے اور ملکیت تامہ یہ ہے کہ مال پر ملکیت بھی ہو اور اس پر قبضہ بھی ہو، اب یہاں ایک بات یہ سمجھنا ہے کہ فقہاء کی عبارات سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ قبضہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک حقیقی قبضہ جیسے ایک شخص کے پاس اس کا اپنا مال موجود ہے، اور دوسرا حکمی قبضہ، جیسے ایک شخص کا مال اس کے کسی دوست کے پاس امانت رکھا ہوا ہے، یا کسی کو قرض دے رکھا ہے، تو یہ مال اگرچہ اس کے پاس حقیقی طور پر تو نہیں ہے، مگر حکمی طور پر اس کے قبضے میں ہے، کیوں کہ وہ جب چاہے اپنا مال اس سے لے سکتا ہے اور اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے۔ لہذا جو مال اپنے پاس نہ ہو،

(1) جواہر الفقہ: ۳/۲۶۳-۲۶۴

لیکن مقدورالانتفاع ہو،تو وہ بھی حکماً قبضہ مانا جائے گا اوراس مال پر بھی زکات واجب ہوگی۔

امام کاسانی کی ’’بدائع الصنائع‘‘ میں ہے:

’’ ومالُ ابن السبيل مَقْدُورُ الانتفاع به في حَقِّه بيد نائبه ، وكذا المَدْفُوْن في البيت؛ لأنّه يُمكِنُ الوُصُول إليه بالنبش بخلاف المَفَازَة؛ لأنّ نَبْشَ كُلِّ الصَّحْرَاء غيرُ مَقْدُورٍ له، وكذا الدَّيْن المُقَرُّ بِهِ إذَا كانَ المُقِرُّ ملياً فهو مُمْكِنُ الوُصُوْل إليه‘‘. (۱)

الغرض جب یہ بات واضح ہوگئی،تو اب سمجھیے کہ اگر ایک شخص مال کا مالک تو ہے؛ مگر وہ اس کے قبضے میں نہیں ہے،نہ حقیقی طور پر،نہ حکمی طور پر،تو فی الحال اس کی زکات اس پر نہیں آئے گی،بل کہ جب وہ رقم اپنے قبضے میں آجائے،تو اس پر ایک سال کے بعد زکات آئے گی۔

بینک ڈپازٹ(Bank Deposit) کا حکم

اسی سے یہ معلوم ہوگیا کہ بینک میں جو رقم رکھی جاتی ہے،اس پر زکات ہے،خواہ وہ فکس ڈپازٹ کے طور پر ہو یا سیونگ اکاونٹ میں رکھی ہو،یا کرنٹ اکاؤنٹ میں ہو،جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان کر چکا ہوں؛ کیوں کہ یہ مال اور رقم بینک کو بطور قرض دی گئی ہے اور آدمی نے خود اپنی مرضی سے بینک میں رکھا ہے؛اس لیے اس پر اس کا حکمی قبضہ ہوگیا۔بعض لوگ فکس ڈپازٹ پر یہ اشکال کرتے ہیں کہ اس میں ایک مقررہ مدت کے لیے جب آدمی رقم جمع کردیتا ہے،تو اس مدت سے پہلے اس کو نکالنے کا اختیار ہی نہیں ہوتا،تو اس کا قبضہ کہاں ہے؟لیکن ایک بات سمجھ لیں کہ جب آدمی نے خود اس کو اپنی مرضی سے بینک میں ایک مدت کے لیے رکھ دیا ہے،تو اس کو حکمی قبضہ مانا جائے گا،لہذا اس پر سال بہ سال زکات

(۱) بدائع الصنائع:۲/۳۹۰

آئے گی۔ البتہ اس کی ادائیگی اس وقت واجب ہے، جب وہ رقم بینک سے نکال لے اور جب نکال لے، تو گذشتہ سالوں کی زکات بھی دے گا۔ اور بہتر تو یہ ہے کہ ہر سال زکات نکالتا جائے؛ کیوں کہ اس میں سہولت بھی ہے اور عبادت میں جلدی کرنا تو اچھا ہی ہے۔

بونڈز، سیونگ سرٹیفیکیٹس اور فینانشیل سرٹیفیکیٹس پر زکات

اسی طرح اگر کسی نے حکومت سے یا کسی کمپنی سے بونڈز (Bonds) خریدے ہوں، یا سیونگ سرٹیفیکیٹس (Saving certeficates) یا فینانشیل سرٹیفیکیٹس (Financial certeficates) خریدے ہوں، تو یہ سب بھی روپئے اور نقدی کے حکم میں ہیں اور یہ بھی حکومت، یا کمپنی کو دیے گئے قرضے جات ہیں؛ لہذا ان پر بھی اسی طرح زکات آئے گی، جس طرح ذاتی طور پر دئے گئے قرض پر اور بینک میں رکھے مال پر زکات آتی ہے۔ البتہ اس کی زکات فوری ادا کرنا لازم نہیں؛ بل کہ وصولی کے بعد دی جاسکتی ہے، لیکن تمام گزشتہ سالوں کی دینا ہوگا، جیسا کہ قرض کے سلسلے میں وضاحت کی جاچکی ہے۔

ہاں! ایک بات یہ بھی یاد رکھئے کہ بونڈز (Bonds) ہوں، یا سیونگ سرٹیفیکیٹس (Saving certeficates) ہوں، یا فینانشیل سرٹیفیکیٹس (Financial certeficates) ہوں، ان میں چوں کہ سود بھی ملتا ہے، اس لیے ان کا خریدنا جائز نہیں، اور سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے حرام ہے، اور ان میں جو سود ملتا ہے، اس کو بلا نیت ثواب صدقہ کر دینا واجب ہے اور اس لیے زکات بھی صرف اپنی اصل رقم پر عائد ہوگی، سود پر زکات نہیں، بل کہ اس کو صدقہ کر دینا چاہیے۔

اسی کو اکثر موجودہ دور کے فقہاء نے اختیار کیا ہے، دکتور احمد کردی، شیخ وھبہ الزحیلی، دکتور رفیق المصری، وغیرہ حضرات نے اسی کو لیا ہے۔

شیخ وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں کہ

" وبِالرَّغْم مِنْ تَحْرِيْمِ السَنَدَات ، فإنّه يَجِبُ زَكَاتُها ؛ لأَنَّهَا تُمَثِّلُ دَيْناً لِصَاحِبِهَا ، وتُؤَدّى زَكَاتُهَا عَنْ كُلّ عَام ، عَمَلاً برأي جُمْهُوْرِ الفُقَهَاء غيرِ المَالكِيّة ؛ لأنّ الدَّيْنَ المَرْجُو (وهو ما كان على مُقِرٍّ مُوْسِرٍ) تَجِبُ زَكَاتُه في كل عام ". (۱)

اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان سندات پر زکات عائد ہوگی اور مال تجارت کی طرح اصل و نفع (یعنی اس کے سود) سب پر زکات دینی ہوگی۔ شیخ یوسف القرضاوی کے کلام سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ:

" وقد بَيَّنَّا مِنْ قبلُ أنّ القولَ الصحيحَ في الدين المرجو — وهو ما كان على مُقِرٍّ مُوسِرٍ — وجوبُ تزكيته كلَّ عَام وهو قول جمهور الفقهاء واختيارُ أبي عبيد وغيره ؛ لأَنَّ الدين المَرْجُو بِمَنْزِلَةِ ما في يَدِه . وهذا القولُ يَتَعَيَّنُ الأخذُ بِه بالنظر للسندات خاصةً؛ لأنَّهَا دُيُوْنٌ لها خُصُوصيةٌ تميزها عن الديون التي عَرَّفَهَا الفُقهاء ؛ لأنَّهَا تنمى و تجلب للدائن فائدةً ، وإن كانتْ مَحْظُورَةً ، فإنّ حظرهذه الفائدة لايكونُ سَبَباً لإعفاء صاحبِ السند من الزكاة ؛ لأنّ ارتكاب الحرام لا يُعْطِي صاحبَه مزيةً على غيره" . (۲)

اسی طرح دکتور صالح السدلان نے بھی اسی کو اپنے رسالے " زكاة الأسهم والسندات " میں اختیار کیا ہے۔ (۳)

---

(۱) موسوعة الفقه الإسلامي والقضايا المعاصرة:۲/۲۸۲

(۲) فقه الزكاة : الفصل العاشر / زكاة السندات:۱/۵۲۸

(۳) زكاة الأسهم والسندات :۱۹. الأسهم والسندات في الفقه الإسلامي: ۳۵۸

مگر اکثر علماء کے نزدیک صحیح قول وہ ہے، جو اوپر عرض کیا گیا کہ سود کو نکال کر بلا نیت ثواب فقراء کو دیا جائے اور جو اصل قرض کی رقم ہے، اس پر زکات دی جائے۔

قرض پر دی ہوئی رقم پر زکات

اسی سلسلے میں قرض پر دی ہوئی رقم کی زکات کا مسئلہ بھی زیر بحث آتا ہے کہ اگر ایک شخص نے کسی کو قرض پر رقم دی، تو وہ اسی کی ملکیت ہے اور اگر چہ قبضہ بظاہر نہیں ہے، مگر چوں کہ وہ جب چاہے، اس سے اپنی رقم لے سکتا ہے؛ اس لیے وہ رقم حکماً اس کے قبضے میں ہے؛ لہذا اگر وہ قرض کی رقم نصاب کے برابر ہے، تو اس پر ایک سال کے بعد زکات واجب ہو جائے گی ، البتہ اس کی ادائیگی وصول ہونے کے بعد کی جا سکتی ہے اور وصول ہونے کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکات بھی لازم ہوگی۔

لیکن یہاں ایک بات سمجھ لینا چاہیے کہ قرض کی کئی صورتیں ہیں ، اور اس لحاظ سے اس کے احکام میں بھی کچھ فرق ہے، لہذا یہاں اس کو جان لینا ہے۔ حضرات فقہاء نے دین (جو کسی کے ذمے میں واجب ہو جائے) کی کئی صورتیں بیان کی ہیں اور اسی میں قرض بھی داخل ہے، لہذا ہم اسی کی روشنی میں قرض کی تفصیل عرض کرتے ہیں کہ قرض کی کئی صورتیں ہیں:

(۱) قرض دار قرض کا انکار کرے اور اس پر کوئی دلیل وثبوت بھی نہ ہو، ایسے قرض پر گذشتہ سالوں کی زکات نہیں ہے۔ (۱)

(۲) قرض پر ثبوت نہ تھا اور قرض دار انکار کر رہا تھا، پھر کسی طرح ثبوت فراہم ہو گیا، تو اس قرض پر بھی گذشتہ ایام کی زکات نہیں ہے۔

چناں چہ ''الهداية'' میں ہے:

---

(۱) الهداية:۲/۱٦٦

”وَمَنْ لَهُ علی آخَر دینٌ فَجَحَدَه سِنِیْن، ثم قامتْ به بینةٌ لَمْ یُزَکِّه لِمَا مَضٰی“ . (۱)

(۳) قرض دار انکار کرے اور قرض پر ثبوت قائم ہو، اس صورت میں گذشتہ سالوں کی زکات لازم ہے۔ (۲)

اور امام محمد سے عدم وجوب منقول ہے اور بعض علما نے اسی کی تصحیح کی ہے۔ (۳)

(۴) قرض دار قرض کا انکار کرے اور ثبوت نہ ہو؛ مگر قاضی کو اس کا علم ہو، اس میں علما کے دو قول ہیں: ایک قول میں اس مال دین پر زکات ہے؛ مگر مفتی بہ قول اس صورت میں عدم وجوب کا ہے۔

علامہ حصکفی نے ”الدر المختار“ میں لکھا ہے:

” إنّ المُفْتیٰ به عدمُ القَضَاءِ بِعِلْم القَاضِي “. (قال الشامي) : أي عدمُ صحة قضاء القاضي اعتماداً علی عِلْمِه ، فَلَوْ عَلِمَ بالمَجْحُوْدِ وقَضٰی بِهِ لَمْ یَصِحّ ، ولا یَجِبُ أنْ یُزَکِّيَ لِمَا مَضٰی.“(۴)

(۵) قرض ایسے شخص پر ہو، جو قرض کا اقرار کرتا ہو اور وہ مال دار ہو، اس صورت میں اس مال پر زکات ہے۔

(٦) قرض ایسے شخص پر ہو، جو قرض کا اقرار کرتا ہو، مگر وہ تنگ دست ہو، اس صورت میں بھی زکات ہے۔

---

(۱) الهدایة :۲/۱٦٦
(۲) الهدایة :۱/۱٦۷
(۳) دیکھو: الدر المختار والشامي :۳/۱۸۵
(۴) الشامي:۳/۱۸۵

صاحب ہدایہ نے فرمایا:

"وَ لَوْ كانَ الدينُ عَلَى مُقِرٌّ ملئ أَوْ مُعْسِرٍ تَجِبُ الزَّكاةُ."(۱)

(۷) قرض ایسے شخص پر ہو جو اقرار کرتا ہو اور اس کو قاضی نے مفلس قرار دے دیا ہو، اس صورت میں امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف –رحمہما اللہ– کے نزدیک اس دین کی زکات لازم ہے اور امام محمد –رحمہ اللہ– کے نزدیک واجب نہیں ہے:

"ولو كانَ الدينُ عَلَى مُقِرّ مُفَلَّسٍ فهو نصاب عند أبي حنيفةَ ، وعند محمدٍ لا يَجِبُ، وأبُو يُوسُف مع أبي حنيفة في حكم الزكاة." (۲)

خلاصہ یہ کہ قرض دینے والے پر قرض کی زکات یا تو اس وقت لازم ہوگی، جب کہ قرض دار قرض کا اقرار کرے، یا اس وقت جب کہ قرض پر ثبوت قائم ہو؛ کیوں کہ ان سب صورتوں میں قرض دینے والے کو قرض کے مال پر ملکیت تامہ حاصل ہے؛ کیوں کہ مملوک ہونا تو ظاہر ہے اور قبضہ اگر چہ حقیقتاً نہیں ہے؛ لیکن چوں کہ اس کو مال دین تک وصول ورسائی ممکن ہے؛ لہٰذا یہ حکماً قبضہ ہے، پس ملکیت تامہ حاصل ہوگئی؛ لہٰذا اس پر زکات ہو گی اور دوسری صورتوں میں قبضہ نہ حقیقتاً ہے؛ نہ حکماً؛ اس لیے زکات نہ ہوگی، اسی کو صاحب "ھدایہ" نے ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے:

" لإمكان الوُصُوْل إليه ابتداءً أو بِوَاسِطَة التحصيل". (۳)

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ کون سی قسم کے قرضے پر گذشتہ سالوں کی زکات واجب ہے اور کونسے قرض پر گذشتہ سالوں کی زکات واجب نہیں ہے۔

---

(۱) الهداية:۲/۱۶۸

(۲) الهداية :۲/۱۶۸

(۳) الهداية:۲/۱۶۸

تاجر کو جو رقم تجارت کے مال کی وصول ہوتی ہے، اس کی زکات

یہیں سے ایک اور مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ اکثر تاجر حضرات کو یہ بات پیش آتی ہے کہ وہ جو سامان دوسروں کو بیچتے ہیں، اس کی قیمت ان کو علی الفور نہیں مل جاتی، بل کہ تاخیر سے ملتی ہے، اور بسا اوقات سالوں کی تاخیر بھی ہوجاتی ہے اور یہ رقم بعض وقت بڑی بڑی اور لاکھوں کی بھی ہوتی ہے، تو اس وصول ہونے والی رقم کی زکات کا حکم بھی وہی ہے، جو ابھی قرض کا بیان کیا گیا کہ سال بہ سال اس کی زکات دینی ہوگی؛ کیوں کہ یہ رقم دین قوی ہے۔ ہاں اس کو ابھی ادا کرنا لازم نہیں، بل کہ وصول ہونے کے بعد دینے کی گنجائش ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اس رقم میں سے جب نصاب کا پانچواں حصہ وصول ہو، تو اس میں سے اس کا چالیسواں حصہ ادا کرنا لازم ہے۔

''بدائع الصنائع ''میں ہے کہ

" وجملةُ القَوْل في الدُّيُوْن أنَّهَا عَلَى ثَلاثِ مَرَاتِب: دينٌ قويٌّ، ودينٌ ضعيفٌ و دينٌ وسطٌ ، أما القوي: فهو الذي وَجَبَ بَدْلاً عن مالِ التِّجَارَة ، كَثَمَن عَرض التِّجَارَة من ثياب التجارة وعبيد التجارة ، ولا خِلَافَ في وُجُوْب الزَّكَاة فيه ، إلَّا أنّه لا يُخَاطَبُ بِأدَاءِ شَيْءٍ من زكاةِ مَا مَضَى مَا لَمْ يَقْبِضْ أربعين دِرْهَماً فَكُلَّمَا قَبَضَ أربعين درهماً أدَّى دِرْهماً وَاحِداً. (۱)

تجارتی فلیٹ خریدا، مگر ابھی قبضہ نہیں ہوا، تو زکات کب نکالیں؟

اسی سلسلے کا ایک سوال سامنے آیا تھا، وہ یہ کہ تجارت کی نیت سے ایک فلیٹ بنوانے کے لیے کنٹراکٹر کو رقم دیدی گئی اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایک سال میں بنا کر دوں گا، مگر

(۱) بدائع الصنائع :۳۹۲/۲

اب دو سال ہو گئے، مگر اس نے ابھی تک وہ فلیٹ مکمل نہیں بنایا اور نہ حوالے کیا، تو اس کی زکات کا کیا حکم ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ آپ نے جو فلیٹ کنٹراکٹر سے بنوایا ہے، وہ جب تک آپ کے قبضے میں نہ آجائے، اس وقت تک آپ پر اس کی زکات واجب نہیں ہے، بل کہ جب وہ آپ کے حوالے ہو جائے اور قبضے میں آجائے، تب اس کی زکات واجب ہوگی۔

علامہ ابن نجیم کی ''البحر الرائق'' میں ہے کہ

" وقَدَّمْنَا أنّ المَبِيْع قَبْلَ القَبْض لا تَجِبُ زكاتُه على المُشْتَرِي ....فعلى هذا قولُهُمْ : لا تَجِبُ الزكاةُ ، معناه : قَبْلَ قَبْضِه ، و أما بَعْدَ قَبْضِه فَتَجِبُ فِيْمَا مَضَى كالدَّيْن القَوِيِ". (۱)

اور الدر المختار اور شامی میں ہے:

" ولا فِيمَا اشْتَرَاهُ لِتِجَارَةٍ قَبْلَ قَبْضِه . أمَّا بَعْدَه فَيُزَكِّيْه عَمّا مَضَى كما فهمه في البحر من عبارة المحيط " . (۲)

لہذا اس فلیٹ کی زکات ابھی ادا کرنا واجب نہیں، لیکن قبضے کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکات واجب ہوگی اور وہ بعد القبض ادا کی جائے گی۔

(۴) مال ضرورت اصلیہ سے زائد ہو

چوتھی شرط: زکات کے واجب ہونے کی چوتھی شرط یہ ہے کہ مالِ نصاب ضرورت وحاجت اصلیہ سے زیادہ ہو، لہذا اگر مال نصاب ضرورت اصلیہ سے زائد نہیں ہے، تو اس

(۱) البحر الرائق:۲/۳۶۵

(۲) الدر المختار مع رد المحتار:۳/۱۸۰

پر زکات نہیں آئے گی اور اگر ضرورت اصلیہ سے زائد ہے، تو اس پر زکات آئے گی۔

حاجت اصلیہ کی فقہی تعریف؟

حاجت اصلیہ کسے کہتے ہیں؟ حاجت اصلیہ انسان کی ان ضروریات کو کہا جاتا ہے جنھیں زندگی گزارنے کے لیے لازم سمجھا جاتا ہے، اور ان کے بغیر زندگی ناممکن، یا مشکل ہو جائے، جیسے کھانا، پانی، سردی و گرمی کے مناسب کپڑے، مکان، سواری، دشمن سے مقابلے کا سامان، وغیرہ۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ جو سامان اور چیزیں انسان کو ہلاکت سے بچانے کا کام کرتی ہیں، خواہ حقیقی طور پر، یا حکمی طور پر، وہ سب چیزیں اور سامان انسان کی اصلی ضرورت اور حاجت میں داخل ہیں، حقیقی طور پر ہلاکت سے بچانے والی چیزیں جیسے کھانا پانی، سردی اور گرمی کے مناسب کپڑے، رہائشی مکان، اور دشمن سے بچاؤ کا ہتھیار وغیرہ اور حکمی طور پر ہلاکت سے بچانے والی چیزیں، جیسے گھریلو استعمال کے برتن وغیرہ، سواری، صنعت کاری کے اوزار، اور روپیہ، پیسہ جو قرض ادا کرنے کے لیے ہو۔

امام قدوریؒ نے لکھا ہے کہ

" ولَيْسَ فِيْ دُوْرِ السُّكْنٰى، وثِيَابِ البَدَن، و أثَاثِ المَنزِل، و دَوَابِ الرُّكُوْب، وعَبِيْد الخِدْمَة، وسلاح الاسْتِعْمَال زكاةٌ". (۱)

"صاحب ھدایہ" اسی کی شرح میں لکھتے ہیں کہ

" لأنَّهَا مَشْغُوْلَةٌ بِالْحَاجَةِ الأَصْلِيَّةِ وَلَيْسَتْ بِنَامِيَةٍ أيْضاً، وعَلَى هٰذَا كُتُب العِلْم لأهْلِهَا و آلاتِ المُحْتَرِفِيْن لِمَا قُلْنَا". (۲)

---

(۱) مختصر القدوري :۵۱

(۲) الهداية:۱۶۶/۲

فقیہ علامہ عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بہ ابن ملک - رحمہ اللہ - نے ”شرح مجمع البحرین“ میں ”حاجت اصلیہ“ کی تعریف یہ کی ہے کہ:

”وھِيَ مَا یَدْفَعُ الھَلاکَ عن الإنسان تَحْقِیقاً کالنفقة ، وَدُورِ السُّکْنٰی ، وآلاتِ الحَرْب، والثِّیاب المُحْتَاج إلیھَا لِدَفْعِ الحَرِّ والبَرْد ، أوْ تَقْدِیْراً کَالدَّیْن ، فإنَّ المَدْیُوْن مُحْتَاجٌ إلی قَضَائِه بِمَا فِيْ یَدِه مِنَ النِّصَاب دَفْعاً عن نفسه الحَبس الَّذِيْ ھُو کالھَلاکِ وکآلاتِ الحرفة ، وأثاث المنزل، ودَوَاب الرکوب ، وکُتُب العلم لأھلھا، فإنَّ الجَھْل عندھم کالھلاک ، فإذا کانَ له دَرَاھِمُ مُسْتَحَقَّة لِیَصْرَفَھَا إلی تلک الحَوَائِج صَارَتْ کالمَعْدُوْمَة“. (۱)

الغرض جو چیزیں انسانی ضرورت میں کام آتی ہیں اور انسان کی زندگی کو جاری ساری رکھنے کے لیے لازم ہیں، وہ اصلی حاجت وضرورت میں داخل ہیں۔

ضرورت کا معیار زمانے اور اشخاص کے لحاظ سے الگ بھی ہوسکتا ہے

البتہ یہاں ایک بات پر توجہ دینا چاہیے کہ ضرورت کی ان چیزوں کا معیار ہر دور میں بدلتا رہتا ہے، کبھی روشنی کے لیے رات میں چراغ سے کام چلا لیتے تھے اور وہی اس دور کی ضرورت تھی؛ لیکن اب لائٹ ایک ضرورت بن چکا ہے۔ پہلے گرمی کو دور کرنے ہاتھ کے پنکھے کافی سمجھے جاتے تھے؛ لیکن اب بجلی کے پنکھے (Fan) اور کولر (Cooler) اور ”اے سی“ (AC) حاجت میں داخل ہے۔ پہلے دور میں سواری کے لیے گدھا، گھوڑا وغیرہ جانور کافی تھے، اور ان سے ضرورت پوری ہوتی تھی، لیکن اب موجودہ جدید دور کی

(۱) البحر الرائق :۳۶۱/۲، النھر الفائق :۴۱۵/۱، شامي:۱۷۸/۳

سواریاں: کار،بس،ٹرین، ہوائی جہاز نے ان کی جگہ لے لی ہے۔لہذا آج جب ضرورت کوشمار کریں گے،تو موجودہ دور کالحاظ کرتے ہوئے ان کوشمار کریں گے۔

اسی طرح ایک اور بات بھی سمجھ لیجیے کہ بعض چیزیں بعض لوگوں کے لحاظ سے ضرورت میں داخل ہوتی ہیں ؛لیکن دوسروں کے لحاظ سے وہ ضرورت میں داخل نہیں ہوتیں،مثلاً ایک عالم ہے،تو اس کی ضروریات میں کتابیں داخل ہیں؛لیکن ایک عام آدمی کے لحاظ سے جوان کا مطالعہ کر کے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا، یہ کتابیں ضروریات میں داخل نہیں ہیں،اسی طرح ایک انجینئر،یا ڈاکٹر کے لیے اس کے فن کی کتابیں اس کی ضرورت میں داخل ہیں ،لیکن دوسرے کے لحاظ سے یہ ضرورت میں داخل نہیں ہیں، اسی طرح بڑھئی ،یا درزی کے اوزار بڑھئی اور درزی کی ضرورت تو ہیں،مگر دوسروں کی ضرورت میں یہ چیزیں داخل نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جو چیزیں اس وقت عام معاشرے میں انسانی حاجت کے دائرے میں سمجھی جاتی ہیں ، وہ حاجت اصلیہ ہیں ، اسی طرح بعض چیزیں بعض لوگوں کی ضرورت ہوتی ہیں تو وہ ان کی حاجت اصلیہ میں داخل ہیں؛لہذا اس کے علاوہ جس کے پاس مال ہو، اس پر زکات آئے گی اور جس کے پاس حاجت اصلیہ سے زائد نہیں ہے، اس پر زکات نہیں آئے گی۔

حاجت سے زائد ہونے کا نقدی میں کوئی اعتبار نہیں

حاجت اصلیہ کے سلسلے میں ایک اور انتہائی اہم بات جان لینا ضروری ہے،وہ یہ کہ حاجت اصلیہ میں کیا سامان کے علاوہ نقدی یعنی سونا ،چاندی اور روپیہ و پیسہ بھی شامل ہے یا نہیں؟ یعنی ایک شخص کے پاس اگر روپیہ، پیسہ، یا سونا، چاندی ہو اور وہ اس کو اپنی حاجت کے لیے رکھا ہو تو کیا یہ بھی حاجت اصلیہ میں شمار ہوگا یا نہیں؟ اگر اس کو حاجت میں شمار کریں،تو ان پر زکات نہ آنا چاہیے اور اگر یہ حاجت میں داخل نہیں،تو ان پر زکات

عائد ہونی چاہیے؟

اس سلسلے میں حضرات فقہاء کی عبارات میں اختلاف نظر آتا ہے، لہٰذا ہم پہلے ان کا ذکر کریں گے، پھر اس پر تبصرہ کریں گے۔

فقیہ علامہ ابن ملک -رحمہ اللہ- کی یہ عبارت "حاجت اصلیہ" کی تعریف میں پہلے نقل کی جا چکی ہے، اسی کا اخیر جملہ یہ ہے:

"فإذَا كَانَ لَه دَرَاهِمُ مُسْتَحَقَّةٌ لِيَصْرِفَهَا إلى تِلْكَ الحَوَائِجِ صَارَتْ كَالمَعْدُوْمَة". (۱)

اس میں صاف لفظوں میں یہ آیا ہے کہ اگر کسی کے پاس ضرورت میں خرچ کے لیے درہم یا دینار ہوں، تو اس پر زکاۃ نہیں ہے اور ان درہموں اور دیناروں کو ضرورت کے لیے ہونے کی وجہ سے معدوم کی طرح سمجھا جائے گا۔

اور علامہ ابراہیم الحلبی نے "درمختار" کے حاشیے میں حاجت کی تعریف میں یہی لکھا ہے کہ اس سے مراد نقدی ہے، ان کی عبارت یہ ہے:

" مُرَادُهُ أنْ يَكُوْنَ مَعَه أحَدُ النَّقْدَيْن أو كلاهُمَا فَارِغاً عن حَاجَتِه الأصْلِية ، أي: لا يَحْتَاجُ أنْ يصرفَ شيئاً منهما ، أو من أحدهما في شيء مِمَّا ذُكِرَ مِنَ السُّكْنٰى وغَيْرِها ، ممّا يَحْتَاجُ إليه مِمَّا يَدْفَعُ به عن نفسه الهَلاكَ تقديراً كوفاء الدين أو تحقيقاً كالسُّكْنٰى وغيرها ". (۲)

اور علامہ ابراہیم الحلبی مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ حاجت اصلیہ سے یہی مراد ہے، اور یہی حق وصواب ہے، ان کی عبارت یہ ہے:

---

(۱) البحر الرائق :۳۶۱/۲، النهر الفائق :۴۱۵/۱، شامي:۱۷۸/۳

(۲) مخطوط حاشية الحلبي على الدر المختار :۲۱۲

" فالحَقُّ مَا قَدَّمْنَاه عن ابن الملک : أنّه إذَا كانَ عنده أَحَدُ النَّقْدَيْن وحَالَ عليه الحَوْلُ ؛ لكنَّهُ مُسْتَحَق الصَّرْف إلى حَوَائِجِه لا يَجِبُ فيه الزَّكَاةُ وإنْ خَالَفَ مَا في معراج الدراية والبدائع ". (۱)

اس کے مطابق اگر کسی کے پاس کسی حاجت وضرورت کے لیے درہم یا دینار، یا روپیہ، پیسہ رکھا ہو، تو اس پر زکات نہیں آئے گی اور وہ نقدی حاجت میں مشغول ہونے کی وجہ سے کالمعدوم شمار ہوگی؛ چناں چہ اس کا اخیر جملہ اس سلسلے میں بالکل صریح ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی کے پاس حوائج میں صرف کرنے کے لیے درہم ہوں، تو وہ معدوم کی طرح ہیں۔

لیکن اکثر فقہاء نے اس کے برخلاف یہ تصریح کی ہے کہ نقدی حاجت اصلیہ میں شمار نہ ہوگی، بل کہ اس پر ہر صورت میں زکات عائد ہوگی، خواہ اس کو کسی ضرورت کے لیے رکھا ہو ، یا تجارت کے لیے رکھا ہو، ہر دو صورتوں میں وہ قابل زکات ہے۔ اس لحاظ سے حاجت کی تعریف میں نقدی داخل ہی نہ ہوگی؛ بل کہ صرف ضرورت کا سامان اس میں داخل ہوگا۔

علامہ کاسانی نے "بدائع الصنائع " میں لکھا ہے کہ

" أنّ الإعدادَ للتجارةِ في الأثْمَانِ المُطْلَقَة من الذهب والفِضَّة ثابتٌ بِأصْلِ الخلقة ؛ لأنَّهَا لا تَصْلَحُ للانتفاع بأعْيَانِهَا في دَفْع الحَوَائج الأصلية ، فلا حاجةَ إلى الإعداد من العَبْد للتجارةِ بِالنِّيَّة ؛ إذ النِّيَّة لِلتَّعْيِيْن وهي مُتَعَيَّنةٌ للتِّجَارَة بأصْل الخلقة ، فلا حَاجَة إلى التعيين بالنية ، فتجب الزكاة فيها ، نَوَى التِّجَارة أو لَمْ يَنْو ، أو نَوَى النفقةَ " . (۲)

(۱) مخطوط حاشية الحلبي على الدر المختار :۲۱۳

(۲) بدائع الصنائع:۲/۳۹۵

اسی طرح امام فرید الدین بن العلاء الدھلوی نے ''فتاوی تاتارخانیہ'' میں اس کی تصریح کی ہے، جیسا کہ زیورات پر زکات کے مسئلے میں اس کی عبارت گزر گئی:

" الزكاةُ وَاجِبَةٌ في الذَّهَب وَالفِضَّة مَضْرُوبَةً كانتْ أوْ غيرَ مَضْرُوبَة ، مصوغاً كان أو غير مصوغ ، حلياً كان للرجال أو للنساء عندنا ، نَوَى التجارةَ ، أم لا " .(۱)

اسی طرح معراج الدرایہ شرح الہدایۃ میں علامہ شیخ قوام الدین الکاکی نے تصریح کی ہے کہ نقدی خواہ ضرورت میں خرچ کے لیے ہو، یا تجارت کے لیے ہو، ہر صورت میں زکات اس پر لازم ہے۔

چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ نے "البحر الرائق "میں اور علامہ سراج الدین ابن نجیمؒ نے ''النهر الفائق ''میں اور علامہ شرنبلالیؒ نے "درر الحكام "کے حاشیے میں اور ابن عابدین شامیؒ نے ''رد المحتار'' میں معراج الدرایہ سے نقل کیا ہے کہ:

''إنَّ الزَّكاةَ تَجِبُ فِي النَّقْد كَيْفَمَا أمْسَكه لِلنَّمَاءِ أوْ لِلنَّفَقَة''. (۲)

راقم کہتا ہے کہ معراج الدرایۃ شرح ہدایہ (مخطوط) میں علامہ کاکی کی عبارت یہ ہے کہ

" فَإنَّ كُلّ وَاحِدٍ سَبَبٌ باعْتِبَار أنّه لِلنَّمَاء خلقةً ، و تَجِبُ الزَّكَاةُ كيفَ مَا أمْسَكه لِلنَّمَاء أو لِلنَّفَقَة " . (۳)

اور علامہ شیخ ابوبکر الحدادیؒ نے بھی ''السراج الوھاج'' (مخطوط) میں یہی لکھا ہے:

---

(۱) التاتارخانية ، بہ تحقیق مفتی شبیر احمد قاسمی:۳/۱۵۴-۱۵۵

(۲) البحر ،:۲/۳۶۱، النهر:۱/۴۱۵،حاشية الشرنبلالي على درر الحكام : ۱/۱۷۲

(۳) مخطوط معراج الدراية:۱/۲۴۵

" وأمَّا السَّبَبُ فَإنَّ الزكاةَ في الذَّهَب وَالفِضَّةِ تَجِبُ لِعَيْنِهِمَا، كيفما أمْسَكَهُمَا لِلتِّجَارَة أو لِلنَّفَقَة ؛ لأنَّهُمَا خُلِقَا رُؤسَ أمْوالِ التِّجَارَة". (۱)

اورعلامہ طحطاویؒ نے "درمختار" کے حاشیے میں نما کی قسموں: خلقی اور حکمی کی بحث میں لکھاہے کہ

" فالخلقي الذَّهَبُ والفِضَّةُ ؛ لأنَّهَا تَصْلَحُ للانتفاع بأعيانها ؛ أي في دفع الحَوَائج ، فلاحاجةَ إلى الإعداد من العبد لِلتِّجَارَة بالنية لتعينها لها بأصل الخلقة ، فتَجِبُ الزَّكاةُ فيهما نَوَى التِّجَارَةَ أو لَمْ يَنْو أصْلاً ، أو نَوَى النَّفَقَة ". (۲)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ درہم و دینار، یا روپیہ پیسہ کے حاجت میں داخل ہونے کے سلسلے میں دو قول حضرات فقہاء سے ملتے ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ داخل حاجت وضرورت ہے اور دوسرا یہ ہے کہ یہ داخل حاجت وضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد اب یہ ملاحظہ کیجیے کہ ان دو اقوال کے سلسلے میں بعد میں آنے والے فقہاء دو راہوں پر چلے ہیں: بعض حضرات نے ان میں ترجیح کو اختیار کرتے ہوئے دوسرے قول کو راجح قرار دیا ہے، جب کہ بعض حضرات نے دونوں میں تطبیق کی صورت اختیار کی ہے۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم اور بعض حضرات نے بدائع اور معراج الدرایہ کے قول پر اعتماد کیا ہے اور ابن ملک کے قول کو اس کے خلاف قرار دے کر اس کو رد کر دیا ہے۔

علامہ ابن نجیم ـ رحمہ اللہ ـ لکھتے ہیں کہ

" فَقَدْ صَرَّحَ بأنّ مَنْ مَعَه دَرَاهِمُ و أمْسَكَهَا بِنِيَّةِ صَرْفِهَا

(۱) السراج الوهاج ، مخطوط: ۱/۳۲۴

(۲) حاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۳/۱۵۹

إلى حَاجَتِه الأصْلِيَّة لاتَجِبُ الزَّكَاةُ إذَا حَالَ الحَوْلُ وهي عنده ، و يُخَالِفُه ما في معراج الدراية في فصل زكاةِ العُرُوْضِ : أنَّ الزّكاةَ تَجِبُ في النَّقْد كَيْفَمَا أمْسَكَه لِلنَّمَاء أو لِلنَّفَقةِ ، وكذا في البدائعِ في بحثِ النَّمَاءِ التقديريِّ " .(۱)

اسی طرح علامہ سراج الدین ابن نجیمؒ نے بھی لکھا ہے کہ:

" إنَّ نَفْيَ وُجُوبِهَا فِيْمَا إذَا كَانَ له دَرَاهِمُ مستحقةٌ لِلصَّرْفِ إلى تِلْكَ الحَوَائِجِ ، مُخَالِفٌ لِمَا في الدرايةِ والبدائعِ : تَجِبُ الزكاةُ في النَّقْد كَيْفَ مَا أمْسَكَه لِلنَّمَاءِ أو لِلنَّفَقةِ ".(۲)

اورعلامہ شرنبلالی – ﷫ – نے ’’حاشية درر الحكام شرح غرر الأحكام ‘‘ میں اورعلامہ طحطاوی – ﷫ – نے ’’الدر المختار ‘‘ کے حاشیے میں علامہ ابن نجیم – ﷫ – کے حوالے سے یہی بات ابن ملک کے قول کے رد میں لکھی ہے، جس سے ان حضرات کا بھی اس قول کو رد کرنا اور معراج اور بدائع کے قول کو راجح قرار دینا معلوم ہوتا ہے۔(۳)

معلوم ہوا کہ ان سب حضرات کے نزدیک علامہ ابن ملک کے قول کے مقابلے میں دیگر فقہاء کا قول لائق ترجیح ہے، جس میں حاجت اصلیہ کو سامان واسباب ضرورت تک محدود رکھا گیا ہے اور نقدی کو اس میں داخل نہیں کیا ہے اور یہ بات اس طور پر بھی سمجھ میں آتی ہے کہ انسانی ضرورتیں جو مستقبل میں پیش آتی یا آسکتی ہیں، ان کی کوئی حد ونہایت نہیں، تو اس کا کہاں تک لحاظ کیا جاسکے گا؟

---

(۱) البحر الرائق :۳۶۱/۲

(۲) النهر الفائق:۴۱۵/۱

(۳) دیکھو :حاشية درر الحكام :۱۷۲/۱۔حاشية الدر المختار للطحطاوي :۱۵۸/۳،۱۵۹

اور علامہ ابن عابدین شامی۔ ﷫۔کے نزدیک علامہ ابن ملک کے قول میں اور دوسرے حضرات کے قول میں فی الواقع کوئی تعارض نہیں ہے، لہذا ان دونوں میں تطبیق ہو سکتی ہے؛ اس لیے علامہ شامی کا رجحان اس طرف ہے کہ دونوں میں تطبیق دی جائے، ان کا کہنا ہے کہ علامہ ابن ملک کا قول ظاہر متون کے موافق ہونے اور پھر علامہ حلبی کے اس کو حق قرار دینے کی بنا پر بہتر یہ ہے کہ ان دونوں اقوال میں تطبیق دی جائے۔

انھوں نے جو تطبیق کی صورت پیدا کی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی نے اگر ضرورت کے لیے نقدی رکھی تھی، یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر گیا اور اس رقم اور نقدی میں سے خرچ ہوکر نصاب کے برابر رقم باقی رہ گئی ہو، تو اس باقی رقم پر زکات آئے گی، اگرچہ کہ اس کی نیت آئندہ کی ضروریات میں خرچ کرنے کی ہو؛ کیوں کہ سال گزر جانے پر حوائج اصلیہ میں اس کے خرچ کرنے کا استحقاق نہیں رہا، اس کے برخلاف جب سال گزر جائے اور اس کے ضروریات میں استعمال کا استحقاق بالفعل اور فی الفور موجود ہو، تو اس صورت میں اس رقم میں زکات نہیں آئے گی، جیسے رقم موجود ہے مگر قرض ادا کرنا ہے، تو زکات نہیں آئے گی، یا فی الحال گھر خریدنے کی ضرورت ہے، تو اس رقم پر زکات نہیں آئے گی۔ لہذا بدائع اور معراج الدرایہ کے قول میں پہلی صورت کا ذکر ہے اور ابن ملک کے کلام میں دوسری صورت کا بیان ہے، لہذا کوئی تعارض نہیں۔(۱)

علامہ شامی کی اس تحقیق یا تطبیق سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ رقم اور نقدی ضرورت کے لیے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرض یا دین (جو ذمے میں واجب ہوگیا ہو) میں ادا کرنے یا کسی فوری ضرورت میں خرچ کرنے کے لیے رکھی ہو، تو وہ ضرورت میں داخل ہے، اور اگر فوری ضرورت کے لیے نہیں ہے، تو وہ ضرورت وحاجت میں داخل نہیں ہے۔ اور بدائع اور معراج الدرایہ میں ایک صورت کا بیان ہے اور ابن ملک کے کلام میں دوسری صورت کا بیان ہے۔

(۱) دیکھو: شامی: ۳/۱۷۹

مگر خود علامہ شامی کو اس صورتِ تطبیق میں ایک اشکال ہوگیا، وہ یہ کہ اگر فوری طلب ضرورت میں خرچ کے لیے رقم رکھنے کی صورت میں زکات واجب نہ ہو، تو سوال یہ ہے کہ ایک شخص نذر یا کفارہ یا حج جو اس پر واجب ولازم ہو چکے ہیں، ان کے ادا کرنے کے لیے رقم رکھتا ہے، تو اس صورت میں بھی زکات اس رقم پر واجب نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ وہ شخص ان کو ادا کر کے اپنے ذمے سے فارغ ہونے کے لیے اس رقم کا محتاج ہے، حالاں کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ نذر یا کفارہ یا حج کی ادائیگی کے لیے رکھی رقم مانع زکات نہیں ہے، اس پر زکات دینی ہوگی۔ نیز شامی کہتے ہیں کہ حج کے مسائل میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ اگر کسی کے پاس مال ہو اور اس کو شادی کی ضرورت ہو اور دوسری جانب اس پر حج فرض ہو، تو وہ شادی سے پہلے حج کرے گا، اسی طرح کسی کو گھر کی یا خدمت کے لیے غلام کی ضرورت ہو، تو وہ بھی پہلے حج کرے گا، تو یہاں فوری ضرورت کو بھی مانع حج نہیں قرار دیا گیا۔ لہذا دونوں صورتوں میں فرق کیا ہوا؟ اس پر غور کر لینا چاہیے۔ (۱)

علامہ شامی کو اپنی پیش کردہ تطبیق پر دو مسئلوں سے اشکال ہوا ہے:

ایک نذر و کفارہ اور حج کی ادائیگی کے لیے رکھی ہوئی رقم سے کہ یہاں زکات اس پر واجب ہوتی ہے، حالانکہ یہ فوری حاجت ہے۔

دوسرے حج کے مسئلے سے کہ فوری طور پر شادی کی ضرورت ہو، تو بھی اس کا لحاظ نہیں کیا گیا، بل کہ یہاں حج کی ادائیگی کو مقدم رکھا گیا۔

علامہ شامی نے یہ اشکال کر کے چھوڑ دیا اور کوئی جواب نہیں دیا، مگر علامہ رافعی نے ان کے پہلے شبہے کا جواب یہ دیا ہے کہ: کفارہ، نذر وغیرہ کی ادائیگی حاجت اصلیہ میں داخل نہیں ہے، اس لیے اس صورت میں زکات واجب ہوگی، بہ خلاف ان چیزوں کے جو حقیقی طور پر یا حکمی طور پر ہلاکت سے بچانے والی ہیں، کہ یہ حاجت اصلیہ میں سے ہیں، اس لیے یہ

(۱) حاصل کلام علامہ شامی: ۳/۱۷۹

زیادہ قوی حاجت ہے؛ اس لیے اس کا تو لحاظ کیا گیا، لیکن نذر و کفارہ وغیرہ کی حاجت کا اعتبار نہیں کیا گیا؛ مگر دوسرے مسئلے سے پیدا ہونے والے اشکال کا جواب علامہ رافعی کو بھی سمجھ میں نہیں آیا، لہذا انھوں نے یہ کہہ دیا کہ حج کے مسئلے میں اور اس میں فرق کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر انھوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دونوں قولوں میں تطبیق کے بجائے یہ کہنا زیادہ ظاہر ہے کہ اس مسئلے میں روایات کا اختلاف ہے۔(۱)

اس تمام بحث سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ابن نجیمؒ وغیرہ حضرات کی رائے درست ہے کہ اس میں دو قول یا دو روایات ہیں، اور ان میں سے ایک راجح یا صحیح ہے اور دوسری مرجوح یا غیر صحیح، اور ان فقہاء کے مطابق نقدی حاجت اصلیہ میں داخل نہیں ہے، اور حاجت اصلیہ میں اس کا اعتبار صرف دین یا قرض ہونے کی صورت میں ہوگا، باقی کسی حاجت و ضرورت میں نہیں۔

چناں چہ علامہ بدرالدین عینی نے " البناية شرح الهداية "میں صاف لکھا ہے کہ

" والحاجةُ الأصلِيَّةُ فِيْ حَقِّ الدَّرَاهِم والدَّنَانِيْر أنْ يَكُوْنَ الدَّيْنُ مَشْغولاً بِهَا، وفِيْ غَيْرِهَا احتياجُهُ إليْهِ في الاسْتِعْمَال وأحْوَالِ المَعَاشِ". (۲)

الغرض حاجت اصلیہ سے وہ مال مراد ہے، جو استعمالی چیزوں اور سامان کی شکل میں ہوتا ہے، جن کی مثالیں اوپر دے چکا ہوں اور یہ سب مال، مال غیر نامی ہے، اور رہا مال نامی جیسے سونا چاندی، یا روپیہ پیسہ، تو اس میں حاجت اصلیہ سے زائد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مال قرض کی ادائیگی کے لیے نہ رکھا ہو، یا کسی فوری ضرورت کے لیے نہ ہو؛ لہذا اگر کوئی قرض دار ہے اور ایک رقم قرض ادا کرنے کے لیے رکھا ہے، یا کسی فوری ضرورت

(۱) تقریرات الرافعي:۱/۲/۱۷۱

(۲) البناية شرح الهداية:۳/۵۶۱

کے لیے رکھا ہے، تو وہ بھی حاجت اصلیہ میں داخل ہے۔

اور اگر کسی کے اوپر قرض نہیں ہے اور وہ روپیہ پیسہ، یا سونا چاندی رکھا ہے، تو یہ مال اس کے حق میں حاجت اصلیہ میں داخل نہیں ہے، بل کہ حاجت اصلیہ سے زائد ہے، اس لیے اس سونے یا چاندی اور رقم کی زکات اس پر عائد ہوگی۔

حج کمیٹی، یا کسی پرائیویٹ ٹور میں حج یا عمرے کے لیے جمع رقم کی زکات

اسی ضمن میں یہ مسئلہ بھی سمجھ لیجیے کہ اگر کسی نے حج کمیٹی میں حج کے لیے درخواست دی اور منظور ہوگئی اور پھر اس نے حسب قانون رقم جمع کر دی، اور اس کو حج کے لیے تاریخ بھی دے دی گئی ہے، یا کسی پرائیویٹ حج ٹور میں رقم جمع کی اور اس کی کارروائی مکمل ہوگئی ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس رقم پر زکات ہے یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ اس رقم پر زکات نہیں آئے گی؛ کیوں کہ یہ رقم خرچ میں آگئی اور حج کی کارروائی مکمل ہوگئی، لہذا اس رقم پر زکات نہیں آئے گی۔

یاد رہے کہ ایک مسئلہ اوپر عرض کیا تھا کہ اگر حج کے لیے رقم جمع کی ہو، تو اس پر زکات واجب ہے، یہ اس صورت میں ہے کہ خود اپنے پاس جمع کر کے رکھا ہو اور حج کمیٹی، یا کسی ٹور والے کے حوالے نہ کیا ہو۔ اس صورت میں اس کو ملک تام حاصل ہے اور رقم ابھی خرچ میں نہیں آئی ہے؛ لہذا اس صورت میں زکات واجب ہوگی، جب کہ اس پر سال گزر جائے اور یہاں جو مسئلہ ہے، وہ اس صورت میں ہے کہ حج کمیٹی، یا کسی ٹور کو وہ رقم دیدی گئی ہو، اور وہ حج کی کارروائی میں لگ چکا ہو؛ لہذا دونوں کا فرق اچھی طرح سمجھ لیں۔

(۵) مال قرض سے محفوظ ہو

زکاۃ واجب ہونے کی پانچویں شرط یہ ہے کہ مال والے پر قرض نہ ہو، اگر مال بھی ہے اور اس پر قرض بھی ہے، تو اب یہ دیکھنا چاہیے کہ قرض اور موجود مال دونوں برابر ہیں،

یا قرض مال سے زیادہ ہے، یا مال سے کم ہے؟ اگر موجودہ مال اور اس کا قرضہ دونوں برابر ہیں، یا قرض زیادہ ہے، تو اس پر زکات نہیں آئے گی اور اگر مال قرضے سے زیادہ ہے، تو جتنا قرض ہے، اس کو چھوڑ کر باقی مال پر زکات آئے گی۔

''الدر المختار'' میں وجوب زکات کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

" فَارِغٌ عَنْ دَيْنٍ لَه مُطَالِبٌ مِنْ جِهَةِ العِبَادِ ، سَوَاء كانَ لِلّٰهِ كَزَكَاةٍ وخِرَاجٍ ، أو لِلْعَبْد ". (۱)

اور''البحر الرائق''میں ہے کہ:

"وشُرِطَ فَرَاغُه عَن الدَّيْن ؛ لأنَّه مَعَه مَشْغُوْل بِحَاجَته الأصليةِ ، فَاعْتُبِرَ مَعْدُوْماً كَالمَاءِ المُسْتَحَقّ بِالعطشِ " . (۲)

اسی طرح''الهداية''اور''الجوهرة النيرة''میں ہے کہ:

" ومَنْ كانَ عليه دَينٌ يُحِيْطُ بِمَالِه فَلا زَكَاةَ عليهِ ، وإنْ كانَ مالُه أكْثرَ مِنْ دَيْنِه زَكّى الفَاضِلَ إذَا بَلَغَ نِصَاباً ". (۳)

اوپر جو کہا گیا کہ اگر قرض کم ہو، تو موجود مال پر زکات دینی ہوگی، اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجیے، کہ زید کے پاس ایک لاکھ روپئے ہیں، اور اس پر ایک لاکھ ہی کا قرضہ ہے، تو اس پر اس ایک لاکھ کی زکات نہیں آئے گی ؛ بل کہ اس کو چاہیے کہ جس کا قرضہ ہے، پہلے اس کو ادا کردے۔ اسی طرح اگر زید کے پاس ایک لاکھ روپئے ہیں اور قرضہ دو لاکھ کا ہے، تو بھی اس پر زکات نہیں آئے گی۔ اور اگر زید کے پاس ایک لاکھ روپئے ہیں، مگر قرضہ صرف پچاس ہزار کا ہے، تو اس کو پچاس میں زکات آئے گی، پچاس میں اس کو قرضہ ادا کرنا چاہیے۔

(۱) الدر المختار:۱۷۶/۳

(۲) البحر الرائق:۳۵۷/۲

(۳) الهداية:۱۶۵/۲، الجوهرة النيرة :۲۸۶/۱

جس تجارتی فلیٹ کی قسطیں مکمل ادا نہیں ہوئیں، اس کی زکات کا طریقہ

یہاں ایک صاحب کا سوال اور ہمارا جواب نقل کیا جاتا ہے، جو اسی سلسلے میں ہے۔

سوال: میں نے ایک فلیٹ خریدا اور اس میں نیت یہ تھی کہ اس کو بیچ کر نفع کماؤں گا، مگر میں نے یہ فلیٹ قسطوں پر خریدا ہے اور اس کی قیمت جو طے ہوئی تھی، وہ ایک کروڑ تھی، اس میں سے میں نے ابھی تک پچھتر لاکھ ادا کر دیا ہے اور پچیس لاکھ کی ادائیگی باقی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مکان کی زکات کس طرح ادا کرنا ہے اور کتنی ادا کرنا ہے؟ اب اس مکان کی قیمت بازار میں بڑھ گئی ہے، تو کونسی قیمت پر زکات نکالنی ہوگی؟

جواب: آپ اس مکان کی موجودہ ویلیو نکالیں اور جو رقم آپ پر واجب الادا ہے، اس کو اس میں سے نکال دیں اور اب جو بچے اس کی زکات نکالیں۔ مثلاً اب مکان کی قیمت بڑھ کر ایک کروڑ پچیس لاکھ ہوگئی ہے، تو اس میں سے جو آپ کو پچیس لاکھ ادا کرنا باقی ہے، وہ نکال دیں، تو ایک کروڑ باقی ہیں، آپ ایک کروڑ کی زکات نکالیں گے۔ اور اگر مکان کی قیمت ایک کروڑ دس لاکھ ہوگئی ہے، تو اس میں سے پچیس لاکھ جو واجب الادا ہے، اس کو نکال دیں، تو بچے پچاسی لاکھ؛ لہذا آپ کو پچاسی لاکھ کی زکات دینی ہوگی۔

ایک غلطی پر انتباہ

مگر یہاں ایک بات سمجھ لیجیے کہ قرض دار پر مال ہونے کے باوجود زکات کیوں نہیں ہے؟ بعض لوگ اس کو سمجھتے نہیں اور ایک غلط حرکت کر بیٹھتے ہیں، بات یہ ہے کہ قرض دار کو اس کے موجودہ مال میں زکات معاف کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ وہ شخص پہلے اپنا قرضہ چکائے اور جس کا قرضہ ہے، اس کو ادا کردے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا حق معاف کر دیا؛ تاکہ بندے کا حق ادا کیا جائے، مگر بعض لوگ جب یہ مسئلہ سنتے ہیں کہ قرض دار پر زکات نہیں ہے، تو وہ موجودہ رقم کو اپنے خرچ میں لے آتے ہیں، اور قرضہ نہیں

ادا کرتے، بل کہ ٹال مٹول کرتے ہتے ہیں۔ یہ کس قدر بڑی غلطی ہے! ارے اللہ کے بندو! اللہ تعالیٰ نے اس شخص سے زکات معاف ہی اس لیے کی ہے کہ وہ قرضہ ادا کردے۔

طویل المدت قرضوں کا حکم

اس کے بعد ایک اہم نیا مسئلہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ سرکار کی جانب سے بعض اسکیموں کے تحت لوگوں کو لاکھوں اور کروڑوں کی رقم بڑی لمبی مدت کے لیے قرض پر دی جاتی ہے، مثلاً تیس سال، یا چالیس سال کے لیے اور ان لوگوں سے ایک دم ادا کرنے کا مطالبہ نہیں ہوتا؛ بل کہ ماہانہ، یا سالانہ قسط کے طور پر ایک مقررہ رقم ادا کرنی پڑتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایک شخص بڑا سرمایہ دار اور کروڑ پتی ہے، مگر پھر بھی مقروض و قرض دار ہے؛ کیوں کہ اس نے تجارتی اغراض کے لیے، مثلاً کوئی فیکٹری لگانے کے لیے، یا کوئی پلانٹ لگانے کے لیے سرکار سے کروڑوں کا قرضہ لیا ہوا ہے، اس کے پاس خود کی فیکٹری ہے، کروڑوں کا مال ہے، اور اس پر قرضہ بھی ہے، تو اس پر زکات آئے گی یا نہیں؟

ظاہر ہے کہ یہ ایک نیا سوال ہے، جو پہلے دور میں غالباً پیش نہیں آیا؛ کیوں کہ پہلے دور میں قرض کی یہ صورت ہی موجود نہیں تھی، پہلے دور میں لوگ سخت حاجت و ضرورت میں قرض لیتے تھے اور آج محض تجارت کو فروغ دینے کے لیے بڑے بڑے تجارتی قرضوں کا رواج ہو گیا ہے، تو اس کا جواب پہلے فقہاء کے کلام میں ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا؛ لہٰذا اس مسئلے پر ماضی قریب اور عصر حاضر کے علماء نے غور و فکر کیا ہے اور ان کی مختلف آراء اس سلسلے میں سامنے آئی ہیں۔

چناں چہ ایسے طویل المیعاد قرضے جو تجارتی اور پیداواری مقاصد کے لئے لیے جاتے ہیں، بعض حضرات نے ان کو بھی عام قرضوں کے حکم میں رکھ کر ان کو بھی مانع زکات قرار دیا ہے؛ کیوں کہ فقہاء نے عموماً دین کو مانع زکات لکھا ہے اور پھر وہ معجّل (فوری طلب) ہو، یا موٴجل (دیر طلب)، دونوں صورتوں میں ایک ہی حکم بیان کیا ہے اور اسی کو ترجیح بھی دی ہے۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کے ایک فتوے سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ایسے قرضے بھی مانع زکات ہیں؛ چناں چہ آپ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے ایک زمین خریدی، جس کی قیمت اسے دس قسطوں میں ادا کرنا ہے اور ایک قسط ادا کر کے اس پر وہ قابض ہو چکا ہے اور اس کے پاس ایک رقم ہے، جس پر سال گزر چکا ہے، تو اس رقم پر زکات ہے یا نہیں؟ آپ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

> ''اس رقم پر زکات واجب نہیں، قرض بہ ہر حال مانع وجوب زکات ہے، خواہ زمین کی وجہ سے ہو، یا کسی اور وجہ سے اور خواہ اس کی ادا بالاقساط مشروط ہو، یا بلا اقساط، واللہ اعلم۔''(۱)

اور معاصر علماء میں سے حضرت مولانا مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی مفتی مدرسہ شاہی مرادآباد نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ وہ اپنے ایک فتوے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''طویل الاجل قرض کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ مقدار قرض منہا کرنے کے بعد مابقیہ مال اگر نصاب کو پہنچ جاتا ہو، تو اس کی زکات ادا کرنا واجب ہوگا اور اگر نصاب کو نہیں پہنچتا، تو زکات ہی اس مدیون پر واجب نہ ہوگی، نیز اگر ایک کروڑ روپیہ قرض میں لے رکھا ہے اور سالانہ پانچ لاکھ کے حساب سے بیس سال میں ادا کرنا ہے، تو سالانہ قسط کے لحاظ سے مجری نہ ہوگا، بلکہ پورے ایک کروڑ کو منہا کیا جائے گا۔(۲)

اس کے برخلاف بعض حضرات نے دیر طلب قرضوں کو مانع زکات ہی نہیں مانا ہے؛ بل کہ ان قرضوں کے ہوتے ہوئے بھی زکات کو واجب قرار دیا ہے؛ کیوں کہ متعدد فقہاء نے دین موجل کو مانع زکات نہیں مانا ہے اور انھوں نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

---

(۱) امداد الاحکام: ۳/ ۲۸

(۲) فتاوی قاسمیہ: ۱۰/ ۳۷۸

شامی نے ''الدر المختار'' کے قول'' أوْ مُؤجَّلاً'' پر لکھا ہے کہ:

"عَزَاهُ في المعراج إلى شرح الطحاوي وقال: وعن أبي حَنِيْفَةَ : لا يَمْنَعُ . وقال الصدرُ الشهيدُ : لا روايةَ فيه، ولِكُلٍّ مِنَ المَنْعِ وعَدَمِهِ وَجْهٌ . زاد القهستاني عن الجواهر : و الصحيحُ أنّه غَيْرُ مَانِعٍ ". (۱)

قریب کے علماء میں سے پاکستان کے حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے، وہ اپنے فتاوی ''فتاوی حقانیہ'' میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس مسئلے میں فقہاء کرام کی دو رائیں ہیں، لیکن قاعدہ اور ظاہر کے لحاظ سے جس کو متاخرین فقہاء نے راجح بھی قرار دیا ہے، وہ یہ کہ ایسے قرضہ جات مانع زکات نہیں۔(۲)

اوران دونظریات کے علاوہ اس مسئلے میں ایک تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ طویل المیعاد قرضوں کی جو قسط سال حاضر میں واجب الادا ہے، اس قدر منہا کر کے باقی پورے مال پر زکات واجب ہے۔اس کو متعدد معاصر علماء نے اختیار کیا ہے۔

شیخ دکتور محمد شبیر عثمان نے اپنے مقالے "مدى تاثير الديون الاستثمارية و الإسكانية في تحديد وعاء الزكاة " میں بھی فی الجملہ اس کو اختیار کیا ہے، جیسا کہ شیخ عبداللہ بن منصور العقیلی نے ''نوازل الزکاۃ'' میں بیان کیا ہے۔(۳)

دکتور شیخ علی احمد السائس نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، کہ سالانہ قسط قرض میں سے منھا کرنے کے بعد باقی تمام مال پر زکات عائد ہوگی۔

---

(۱) شامي:۳/۱۷۷

(۲) فتاوی حقانیه:۳/۵۱۱

(۳) نوازل الزكاة :۷۲

آپ نے اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تجارتی قرض کو منہا کیا جائے گا یانہیں؟ اگر ہم کہتے ہیں کہ منہا نہ کیا جائے، تو بہت سے کروڑ پتی لوگوں کو زکات نہ نکالنی پڑے گی، ایک شخص کے پاس بینک میں تین ملین ہیں اور اس نے قسط وار ادائیگی پر کسی اور منصوبے کے لیے چار ملین قرض لیا، تو گویا اس کے پاس تو تین ملین ہیں اور اس کے ذمے چار ملین کا قرض ہے، تو اس پر زکات ہی نہ ہوگی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے زمانے کے بہت سے تاجروں پر زکات ہی نہ آئے۔

پھر انھوں نے لکھا ہے کہ

> زکات کے سلسلے میں منعقد ''مؤتمر أول ''میں یہ مسئلہ پیش ہوا اور یہ رائے طے ہوئی کہ بعض فقہاء جیسے شوافع کا قول اس میں لیا جائے کہ اگر قرض فوری واجب الاداء نہیں ہے، تو اس سے زکات ساقط نہیں ہوتی۔
>
> (وہ لکھتے ہیں کہ)
>
> ''اگر قرض بیس سالوں میں بالاقساط ادا کرنا ہو، تو اس میں سے جو قسط اس سال ادا کرنی ہے، اس میں اس کو چھوٹ دی جائے گی، لیکن باقی سالوں کی قسطوں میں چھوٹ نہیں ہوگی، لہذا اس سال کی قسط کو چھوڑ کر باقی مال کی زکات دینی ہوگی۔ (۱)

یہی رائے بہت سے معاصرین علماء نے اپنائی ہے اور اسی میں اسلامی نقطۂ نظر سے اعتدال اور توسط معلوم ہوتا۔

چناں چہ شیخ دکتور وھبہ الزحیلی نے ذکر کیا ہے کہ " مؤتمر الزكاة الثانية " نے بھی اپنی قرارداد میں یہی منظور کیا ہے کہ تجارتی وترقیاتی منصوبوں کے لیے قرضوں میں

---

(۱) خلاصہ:الاقتصاد الإسلامي والقضايا الفقهية المعاصرة:٦٣٦

سے صرف سالانہ قسط منہا کی جائے گی اور باقی کی زکات دی جائے گی۔ (۱)

ہمارے معاصر علماء میں سے فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے بھی یہی نقطۂ نظر پیش کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

> ''صنعتی وترقیاتی قرضے جو سرکاری اداروں سے حاصل کیے جاتے ہیں اور انھیں طویل مدت یعنی دس بارہ سال میں ادا کرنا ہوتا ہے، اس میں اصول یہ ہے کہ ہر سال قرض کی جتنی قسط ادا کرنی ہے، اس سال اتنی رقم منہا کر کے زکات کا حساب کیا جائے گا، نہ کہ پورے قرض کا۔ (۲)

اسی طرح جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹون، کراچی کا بھی یہی فتوی، جیسا کہ ان کے ویب سائیٹ پر موجود ہے، اس میں لکھا ہے کہ:

> ''اگر کوئی شخص طویل المیعاد قرض لیتا ہے، جیسے حکومتی قرض، یا بینکوں سے قرض لے کر قسطیں ادا کرتا ہے، تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ ہر سال دیگر قابل زکات اموال کی زکات کی ادائیگی کے وقت اس سال واجب الادا قرضہ (یعنی مکمل قرضے میں سے جتنی مقدار ادا کرنا اسی سال اس کے ذمے پر ہو اس) کے بقدر منہا کر کے باقی رقم اور اموال تجارت کی زکات ادا کی جائے گی، بشرط یہ کہ باقی مال نامی نصاب تک پہنچ رہا ہو۔'' (۳)

احقر کی رائے بھی یہی ہے کہ طویل المدتی قرضہ جات میں سے ہر سال کی قسط کو چھوڑ کر باقی مال پر زکات عائد ہوگی، مثلاً ایک سرمایہ دار نے سرکار سے ایک کروڑ کا قرضہ لیا ہے اور اسے سال میں سے صرف دس لاکھ ادا کرنے ہیں، تو اس سال زکات نکالتے وقت

(۱) ملحق الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۱۰/۷۹۳۶

(۲) کتاب الفتاوی: ۳/۲۶۰

(۳) فتاوی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹون، فتوی نمبر: ۱۴۴۰۰۷۲۰۰۴۳۰

وہ صرف دس لاکھ کو چھوڑ کر اپنے باقی مال کی زکات دے گا۔

شریعت کے عمومی مزاج کے لحاظ سے یہی رائے مناسب معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ پیداواری وترقیاتی قرضے جو لیے جاتے ہیں، وہ عموماً معمولی لوگ بھی نہیں لیتے، بل کہ اس کو لینے والے خود اپنی جگہ کروڑ پتی لوگ ہوتے ہیں اور اکثر سامان تعیش ان کے پاس ہوتا ہے اور یہ لوگ محض اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے یہ قرضے لیتے ہیں، تو اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ان پر زکات نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ مقروض ہیں، تو یہ شخص کروڑوں کا مالک ہوتے ہوئے بھی فقیروں اور محتاجوں کے درجے میں آجائے گا اور اس کے برخلاف ایک شخص جو معمولی درجے کا تاجر ہے، جو محض نصاب کے برابر مال رکھتا ہے؛ مگر اس پر کوئی قرض نہیں ہے، وہ ان کے مقابلے میں مال دار شمار ہوگا اور اس پر زکات واجب ہوگی۔ بظاہر یہ بات اسلامی مزاج سے ہم آہنگ نظر نہیں آتی ؛ اس لیے معتدل رائے یہی ہے کہ طویل المدۃ قرضوں میں سے سالانہ قسط کو وضع کر کے باقی مال پر زکات کو واجب قرار دیا جائے۔

کیا مماطل دین پر دین کی زکات واجب قرار دی جاسکتی ہے؟

یہ بات معلوم ہے کہ دین کے سلسلے میں زکات دائن پر ہوتی ہے، نہ کہ مدیون پر؛ مگر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مدیون باوجود اقرار کے ٹال مٹول کرتا ہے اور باوجود قدرت کے ادائے قرض میں غیر معمولی تاخیر کرتا ہے اور خود اس دین سے تجارت کر کے منافع حاصل کرتا رہتا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں بھی کیا دائن پر وجوبِ زکات کا حکم ہوگا، یا مماطل دین پر دین کی زکات واجب قرار دی جائے گی؟

جہاں تک اس صورت میں دائن پر زکات کا مسئلہ ہے، تو احقر کا خیال ہے کہ اس پر زکات نہ ہونا چاہیے، بہ شرطے کہ وہ دین کے وصول کرنے میں عاجز وغیر قادر ہو اور اس کی نظیر یہ جزئیہ ہے کہ والی وحاکم اگر کسی کے دین کا اقرار تو کرتا ہو؛ مگر دیتا نہ ہو، تو فقہا نے لکھا ہے کہ اس میں زکات نہیں، اسی طرح اگر قرض دار بھاگ گیا اور دائن طلب کرنے

سے عاجز ہو، تو زکات نہ ہونا امام محمد – رحمہ اللہ – سے منقول ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”وفي المحيط عن المُنتَقٰى عن محمد : لَوْ كانَ له دَينٌ على والٍ و هو مقرٌّ به إلّا أنّه لا يُعْطِيْهِ و قَدْ طَالَبَه بباب الخَلِيفَةِ ، فَلَمْ يُعْطِه ، فلا زَكاةَ فيه ، و لو هَرَبَ غَرِيْمُه وهو يَقْدِرُ على طَلَبِه أو التوكيلِ بِذلک فَعَلَيْه الزكاةُ وإنْ لَمْ يَقْدِرْ على ذلک فَلا زَكاةَ عليه .(۱)

امام احمد – رحمہ اللہ – کے مسلک میں بھی دائن پر زکات نہ ہونے کی ایک روایت نقل کی گئی ہے، جیسا کہ المغني لابن قدامة:(۲/۳۴۵)، المحرر في الفقه :(۱/۲۱۹) الفروع :(۲/۲۵۱) اور الإنصاف:(۳/۲۲) میں بیان کیا گیا ہے۔

اور ”الإنصاف “میں یہ بھی ہے کہ بعض نے اس روایت کی تصحیح بھی کی ہے، اور شوافع کے نزدیک اگر چہ اصح یہ ہے کہ اس کی زکات دائن پر ہے، تاہم شوافع کے یہاں بھی ایک روایت یہ ملتی ہے کہ اس کی زکات دائن پر نہیں ہے جیسا کہ ”التنبیہ“(۱/۵۵) میں نقل کی گئی ہے۔

رہا مدیون پر زکات کے عائد کرنے کا مسئلہ تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس کی وجہ ظاہر ہے، اور وہ یہ کہ اس مال کا وہ مالک نہیں ہے، نیز اس کے ذمے تو کل رقم دین کو واپس لوٹانا واجب ہے، لہذا اس کے لیے بعض حصے کا صدقہ (زکات) میں دینا کیا مفید ہوسکتا ہے؟ جیسے کوئی کسی کا مال غصب کرلے، تو اس مال مغصوب میں زکات کو واجب قرار دینا کیا مفید ہوسکتا ہے، جب کہ اس کے اوپر تو کل مال مغصوب کا مغصوب منہ کو اور اگر وہ نہ ہو، تو فقرا کو دینا واجب ہے؟ چناں چہ اسی دلیل سے اموال غیر طیبہ پر زکات نہ ہونا حضرات فقہا کرام نے لکھا ہے۔

(۱) الشامي:۳/۱۸۴

علامہ شامی -رحمہ اللہ- نے لکھا ہے:

" في القُنية: لَوْ كانَ الخَبِيثُ نِصَاباً لا يَلْزَمُه الزكاةُ؛ لأنّ الكُلَّ واجبُ التَّصَدُّق عليه، فلا يُفِيْدُ إيجابُ التَّصَدُّق بِبَعْضِه ." (۱)

غرض یہ کہ مدیون کو دین واپس کرنے کا ذمے دار قرار دینا چاہیے، نہ کہ دین کی زکات کا (واللہ اعلم)۔

جمہور کا یہی مسلک ہے؛ البتہ مماطل پر زکات کا وجوب بعض ائمہ سے چوں کہ منقول ہے، اس لیے اگر کوئی مصلحت اس کی داعی ہو، تو اس قول کو بھی اختیار کیا جا سکتا ہے، جیسے امام نخعی -رحمہ اللہ- و امام عطا -رحمہ اللہ- سے ایک روایت ہے۔ (۲)

(٦) مال پر ایک سال گزرا ہو

زکات کے واجب ہونے کی چھٹی شرط یہ ہے کہ مال نصاب پر ایک سال گزر جائے، جس کو فقہاء حولان حول کہتے ہیں، لہذا جب نصاب کے برابر مال پر ایک سال گزر جائے گا، تو اس پر زکات واجب ہوگی۔

چناں چہ حضرت عائشہ -رضی اللہ عنہا- سے روایت ہے کہ رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا کہ

« لا زَكَاةَ عَلَى مَالٍ حَتَّى يَحُوْلَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ. »

(مال پر زکات نہیں؛ یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے۔)(۳)

علامہ مرغینانی -رحمہ اللہ- نے "الهداية" میں لکھا ہے کہ

(۱) الشامي: ۳/۲۱۸

(۲) كما في فقه الزكاة للقرضاوي: ۱/۱۸۲، عن الأموال

(۳) ابن ماجة: الزكاة / باب من استفاد مالاً، ح: ۱۷۹۲

”الزكاةُ وَاجِبةٌ على الحُرِّ العَاقِلِ البَالِغِ المُسْلِمِ إذَا مَلَكَ نِصَاباً مِلْكاً تامّاً ، وحَالَ عليه الحَوْلُ “.(۱)

اور یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ سال سے مراد ”قمری سال“ یعنی چاند کے حساب سے سال گزرنا ہے، جب مال پر ایک سال گزر جائے گا، تو اس پر زکات واجب ہو جائے گی، مثلاً کسی کا سال شروع ہوا ماہِ رجب کی ایک تاریخ کو تو جب دوبارہ رجب کی پہلی تاریخ ہوگی، اس پر زکات واجب ہو جائے گی، خواہ شمسی لحاظ سے ابھی سال پورا نہ ہوا ہو۔

علامہ ابن نجیم ۔رحمہ اللہ۔ نے ”البحر الرائق“ میں اور ”درر الحکام“ کے حاشیے میں علامہ شرنبلالی ۔رحمہ اللہ۔ نے لکھا ہے کہ

”وفي القُنية : العبرةُ في الزكاةِ لِلحَوْل القَمَرِي“ . (۲)

مال مستفاد (درمیان سال میں حاصل ہونے والے مال) کا حکم

یہاں ایک اور بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ایک سال گزرنے کی جو شرط بیان کی گئی ہے، یہ اس مالِ نصاب کے لیے شرط ہے، جو آدمی کی ملکیت میں پہلی دفعہ آیا ہو، مثلاً ایک شخص تھا، اس کے پاس نصاب کے برابر مال نہیں تھا، اس لیے اس پر زکات بھی نہیں تھی، پھر کمائی سے ،یا کسی اور ذریعے سے اس کے پاس اتنا مال جمع ہو گیا، جس پر زکات آتی ہے، تو اب اس مال پر ایک سال گزرنے کے بعد زکات واجب ہوگی؛ لیکن مالک نصاب ہو جانے کے بعد جو مال درمیان میں اس کو ملتا رہا، جیسے کبھی درمیان میں پچیس ہزار آ گئے، یا ایک لاکھ آ گئے، تو اس میں سے ہر ایک مال پر سال گزرنا شرط نہیں ہے؛ بل کہ جب پہلے سے موجود مال کی زکات کا وقت آجائے، تو اس درمیان میں ملنے والے مال کی زکات بھی ادا کرنی ہوگی۔

(۱) الهداية:۲/۱٦۱

(۲) البحر الرائق:۲/۳٥٦۔حاشية درر الحكام:۱/۱۷٤

مال مستفاد کی صورتیں اور ان کا حکم

درمیان سال میں ملنے والے اس مال کو حضراتِ فقہاء کی زبان میں ''مالِ مستفاد'' کہتے ہیں۔اس کے بارے میں یہاں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مال مستفاد (جو مال درمیان سال میں حاصل ہو) کی کئی شکلیں ہیں:

(۱) ایک یہ کہ اگر درمیان میں ملنے والا مال پہلے سے موجود مال کی جنس یعنی اسی قسم میں سے نہیں ہے، بل کہ دوسری قسم میں سے ہے، جیسے پہلے سے روپے پیسے موجود تھے اور بعد میں اس کو اونٹ، یا بکریاں مل گئیں، تو اس کو پہلے مال سے ملایا نہیں جائے گا؛ بل کہ اس بعد والے مال کا سال الگ سے شمار کیا جائے گا۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ درمیان سال میں ملنے والا مال اسی جنس یعنی اسی قسم کا ہو جو پہلے سے موجود تھا، جیسے کسی کے پاس کرنسی نوٹ، یا سونا، یا چاندی تھا اور بعد میں مزید روپے، پیسے یا سونا یا چاندی درمیان سال میں حاصل ہو جائے۔

پھر اس کی (یعنی اسی جنس سے مال ملنے کی) دو صورتیں ہیں:

(۱) ایک یہ کہ جو مال پہلے سے موجود تھا، اسی مال کے نفع کے طور پر، یا اسی کی پیداوار کے طور پر درمیان میں مال حاصل ہو۔اس صورت میں درمیان میں حاصل ہونے والے اس مال پر بھی پہلے سے موجود مال کے ساتھ زکات واجب ہو گی۔

مثال کے طور پر ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپے تھے، اس نے اس مال سے تجارت کی اور اس کو درمیان سال میں بیس ہزار نفع میں ملے، تو اس بیس ہزار پر الگ سے سال گزرنے کی شرط نہیں ہے؛ بل کہ ایک لاکھ کی زکات کا سال جب پورا ہو، تو اس کے ساتھ اس بیس ہزار کی بھی زکات دینا لازم ہو گا۔ظاہر ہے کہ یہ بیس ہزار جو اس کو حاصل ہوئے، وہ پہلے سے موجود ایک لاکھ کا نفع ہے، یعنی اسی پہلے مال کا نتیجہ و ثمرہ ہے۔

دوسری مثال اس کی یہ ہے کہ ایک آدمی کے پاس سات، یا آٹھ اونٹ تھے، پھر

درمیان سال میں ان کے تین بچے ہوگئے اور اب کل دس یا گیارہ اونٹ ہوگئے، تو جب وہ اپنے پہلے کے آٹھ اونٹوں کی زکات دے گا، تو اسی کے ساتھ یہ بیچ سال میں پیدا ہونے والے تین اونٹوں کی بھی زکات دے گا۔ یہاں جو اونٹ مزید حاصل ہوئے، وہ پہلے ہی اونٹوں سے حاصل ہوئے ہیں۔

اوپر کی بیان کردہ تینوں صورتوں کے حکم میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔

(۲) اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کے پاس سونا یا چاندی یا روپیہ پیسہ اتنا تھا، جس پر زکات واجب ہوتی ہے، پھر درمیان سال میں کسی نے اس کو اسی قسم کی چیزیں ہدیے میں دے دیں، یا اس کو میراث میں مل گئیں، تو اس میں بھی امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہی ہے کہ اس درمیان میں حاصل ہونے والے مال کو پہلے مال سے ملا دیا جائے گا اور اس کی زکات پہلے مال کی زکات کے ساتھ دی جائے گی۔ مگر اس مسئلے میں بعض ائمہ کا اختلاف ہے اور وہ حضرات کہتے ہیں کہ اس میں بیچ میں ملنے والے مال کو پہلے مال سے نہیں ملایا جائے گا، بل کہ ان کا سال الگ سے شمار ہوگا۔

بدائع الصنائع میں علامہ کاسانی -رحمہ اللہ- فرماتے ہیں کہ

" جُمْلَةُ الكَلامِ في المُسْتَفَادِ أَنَّه لا يَخلُو: إمَّا إن كانَ مُسْتفاداً في الحَوْل، وإمَّا إن كانَ مُسْتفاداً بعد الحَوْل. والمُسْتَفادُ في الحَوْل لا يخلُوْ: إما إن كانَ مِنْ جِنْسِ الأَصْل ، وإمّا إن كانَ مِنْ خِلافِ جِنْسِه. فإن كان مِنْ خلافِ جِنْسِه كالإبِلِ مَعَ البَقَر والبَقَر مع الغَنَم؛ فإنّه لا يُضَمُّ إلى نصاب الأَصْل ، بَلْ يُسْتَأنَفُ له الحَوْلُ بلا خِلافٍ ، وإن كان من جِنْسِه، فإما إنْ كانَ مُتَفَرِّعاً مِنَ الأَصْل ، أو حَاصِلاً بِسَبَبِه كالوَلَد والرِّبْح ، وإمّا لَمْ يَكُنْ مُتَفرِّعاً مِنَ الأَصْل ولا حَاصِلاً

بِسَبَبِه كالمُشْتَرى، والمَوْرُوْث، والمَوْهُوْب، والمُوْصٰى بِه، فإنْ كَانَ مُتَفَرّعاً مِنَ الأصل أو حَاصِلاً بِسَبَبِه يُضَمُّ إلى الأصْلِ وَيُزَكّٰى بِحَوْلِ الأصْل بالإجْمَاع . وإن لَمْ يَكُنْ مُتَفرّعاً من الأصل ولا حَاصِلاً بِسَبَبِه ، فإنَّه يُضَمُّ إلى الأصْل عِنْدَنا ".(1)

علامہ سمرقندی ۔ رحمہ اللہ ۔ لکھتے ہیں کہ

" ثُمّ المُسْتَفادُ على ضَرْبَيْن: مُتَوَلّدٌ مِن الأصْل حَاصِلٌ بِسَبَبِه كالأوْلادِ والأرْبَاحِ، وَغَيْرُ مُتَوَلّدٍ منه ولاحَاصِلٌ بِسَبَبِه، بل حاصلٌ بِسَبَبٍ مَقْصُوْدٍ في نَفْسِه كالمَوْرُوْث والمَوْهُوْب والمُشْتَرىٰ ونحو ذلک، وكُلُّ ذلک على نَوْعَيْن : أحَدُهُما أنْ يكونَ مُسْتفاداً بعد الحَوْل ، والثاني : أنْ يكونَ مُسْتَفَاداً في الحَوْل . والأصْلُ في الباب أنَّ الحَوْل المَوْجُوْد في حَقِّ الأصْل كالمَوْجُوْد في حَقِّ التّبع ، فَكُلُّ مستفادٍ هو تبعٌ للأصْل تَجِبُ فيه الزكاةُ وإلّا فَلاَ . إذَا ثَبَتَ هٰذا فَنَقُوْلُ : أمّا المُسْتَفادُ بعدَ الحَوْل فَلاَ يُضَمُّ بالإجماع في حَقِّ السَّنَةِ المَاضِيَةِ ، وإنّمَا يُضَمُّ فِيْ حَقِّ الحَوْلِ الّذي اسْتُفِيْدَ فيه. .... وأما المُسْتَفادُ فِيْ الحَوْلِ ، فإنْ كانَ مِنْ خِلافِ جِنْسِه كالإبِلِ مَعَ الشّاةِ و نحوها لا يُضَمُّ بالإجْمَاع . ... وأمّا إذَا كانَ مِنْ جِنْسِه إنْ كانَ حاصِلاً بِسَبَبِ التَّفَرُّع والاسْتِرْبَاح ، فَيُضَمُّ بالإجْمَاع كالأوْلادِ والأرْبَاحِ .... وأمّا إذا لَمْ يَكُنْ مُتَوَلّداً حاصِلاً بِسَبَبِه

(1) بدائع الصنائع:۲/۳۹۹-۴۴۰

كالمَوْرُوْث والمَوْهُوْب والمَبِيْعِ ونَحْوِها ؛ فإنَّه يُضَمُّ عِنْدَنَا ".(۱)

سال کے درمیان مال کم ہوجائے تو؟

یہاں ایک اہم بات یہ جان لینی چاہیے کہ درمیان سال جس طرح مال بڑھ جاتا ہے جیسا کہ ابھی گزرا، اسی طرح ایسا بھی ہوسکتا اور ہوتا ہے کہ درمیان سال میں مال میں کمی ہوجائے، مگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، بل کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سال کے شروع اور سال کے اخیر میں نصاب کے برابر مال رہے۔ باقی درمیان سال میں کمی بیشی ہوتی رہے، تب بھی یہی سمجھا جائے گا کہ اس پورے مال پر سال گزر گیا۔ جیسے زید کے پاس رمضان میں ایک لاکھ روپئے تھے، اس نے اس کی زکات دے دی، پھر رمضان کے بعد اس مال میں کمی ہوگئی، یہاں تک کہ نصاب کے برابر بھی اس کے پاس مال نہ رہا، لیکن پھر دو چار ماہ، یا چھ سات ماہ کے بعد دوبارہ مال بڑھتا رہا، یہاں تک کہ رمضان سے پہلے پہلے پھر وہ نصاب کے برابر مال کا مالک ہوگیا، تو امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ اس کو زکات دینی پڑے گی۔ ہاں اگر کسی کا مال پورے کا پورا ہی چلا گیا اور کچھ بھی باقی نہ رہا، تو زکات ساقط ہوجائے گی۔ اب پھر دوبارہ جب اس کو مال ملے گا اور ایک سال اس پر گزرے گا، تب اس پر زکات آئے گی۔

"بدائع الصنائع" میں علامہ کاسانی فرماتے ہیں کہ

" ولكن هٰذا الشَّرْط يُعْتَبَرُ في أوَّلِ الحَوْلِ وَفِيْ آخِرِهٖ ، لا في خِلالِه ؛ حَتّٰى لَو انْتَقَصَ النِّصَابُ في أثْنَاءِ الحَوْل ، ثُمَّ كَمُلَ فِيْ آخِرِه تَجِبُ الزكاةُ ، سَوَاء كانَ مِنَ السَّوَائِم أوْ منَ الذَّهَب والفِضَّةِ أو مَالِ التِّجَارةِ ، وهٰذا قَوْلُ أصْحَابِنَا الثلاثة . (۲)

اسی طرح علامہ سمرقندی - رحمہ اللہ - نے "تحفة الفقهاء" میں لکھا ہے کہ

---

(۱) تحفة الفقهاء: ۱/۲۷۷-۲۷۸

(۲) بدائع الصنائع: ۲/۴۰۴

"ثُمَّ مالُ الزَّكاةِ يُعْتَبَرُ فيه كَمَالُ النِّصَاب فِيْ أوَّلِ الحَوْلِ و آخِرِه . ونُقْصَانُ النِّصَاب بَيْنَ طَرفَي الحَوْلِ لا يَمْنَعُ وُجُوبَ الزَّكاةِ ، سواءٌ كانَ مَالُ التِّجارةِ أو الذهبُ والفِضَّةُ أو السَّوَائِمُ . (۱)

سال گزرنے سے پہلے زکات دینا جائز ہے

یہاں ایک مسئلہ یہ قابلِ ذکر ہے کہ ابھی یہ بات معلوم ہوئی کہ مال پر زکات ایک سال گزرنے پر واجب ہوتی ہے؛ لیکن اگر کسی صاحبِ نصاب نے سال گزرنے سے پہلے زکات نکال کر دے دی، تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اس سے زکات ادا ہو جاتی ہے۔

"الهداية" اور "الجوهرة النيرة" میں لکھا ہے کہ

"وَإنْ قَدَّمَ الزَّكاةَ على الحَوْل وهُوَ مَالِكٌ لِلنِّصَابِ جَازَ ؛ لأنَّه أدَّى بَعْدَ سَبَبِ الوُجُوْب ، فَيَجُوْز ." (۲)

اور حدیث میں بھی ہے کہ حضرت عباس –رضی اللہ عنہ– نے رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– سے دریافت کیا کہ کیا میں سال ہونے سے پہلے ہی اپنی زکات دے سکتا ہوں، تو آپ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے اس کی اجازت دی۔ (۳)

لیکن ایک بات ذہن میں رہے کہ اگر سال ہونے سے پہلے زکات دے دی اور اس کے بعد دوسرے سال میں اس کا مال پہلے سے بڑھ گیا، تو جتنا مال بڑھ گیا ہے، اتنے کی زکات بعد میں دینی ہوگی۔

---

(۱) تحفة الفقهاء:۱/۲۷۲

(۲) الهداية :۲/۱۸۹، باب صدقة السوائم .الجوهرة النيرة:۱/۲۹۹

(۳) الترمذي : الزكاة/ باب ماجاء في تعجيل الزكاة ،ح :۶۸۵

زکات زیادہ دے دی، تو اگلے سال کی شمار کر سکتے ہیں؟

سوال: گزشتہ سال کی زکات غلطی سے زیادہ دے دی، تو کیا اس کو اگلے سال کی زکات میں شمار کر سکتے ہیں؟

جواب: گزشتہ سال کی زکات اگر غلطی سے زیادہ دے دی ہے، تو اس کی اجازت ہے کہ اس رقم کو بعد کے سال میں شمار کر لے، بہ شرطے کہ زکات دیتے وقت زکات کی نیت کی ہو۔

''المحیط البرهاني''میں ہے کہ:

" وَلَوْ مَرَّ بِأَصْحَابِ الصَّدَقَات فَأخَذُوْا منهُ أكثرَ مِمَّا عليه ظَنّاً مِنْهُمْ أنَّ ذلک عَلَيهِ لِمَا أنَّ مَالَه أكثرُ يَحْتَسِبُ الزيادةَ لِلسَّنَةِ الثَّانية ". (۱)



(۱) المحيط البرهاني:۲/۲۹۳

بحث ہفتم

زکات کیسے اور کتنی نکالنی ہے؟

بحث هفتم
زکات کیسے اور کتنی نکالنی ہے؟

اب لیجیے چھٹی قسم کا مسئلہ، اور وہ یہ ہے کہ زکات کیسے نکالنا ہے اور کتنی نکالنا ہے؟
اس سلسلے میں چند مسائل پر گفتگو ہوگی:

زکات میں نیت کرنا ضروری ہے

زکات نکالنے میں نیت ضروری ہے، یعنی جب زکات نکالنا ہو، تو زکات نکالنے کی نیت کرنا بھی لازم ہے، کہ میں زکات میں یہ رقم نکال رہا ہوں۔ اگر کسی شخص نے کسی غریب کو ایک رقم دی، مگر زکات کی نیت سے نہیں دی، تو زکات ادا نہیں ہوگی؛ کیوں کہ ہر عبادت میں نیت کرنا ضروری ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ – صلی اللہ علیہ وسلم – نے فرمایا کہ

« إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ »

(اعمال کا مدار نیتوں پر ہے)(۱)

لیکن یاد رہے کہ یہ نیت یا تو اس وقت ہونی چاہیے، جب زکات فقیر کو دیتے ہیں، یا اس وقت ہونا چاہیے، جب زکات کا حساب کر کے زکات کی رقم کو الگ کرتے ہیں؛ لہذا دیتے

(۱) البخاري، ح:۱. مسلم، ح:۱۹۰۷

وقت یا زکات کی رقم الگ کرتے وقت نیت کرلی،تو زکات ادا ہوگئی؛لہذا اگر کسی نے فقیر کو دیتے وقت زکات دینے کی نیت کی ، نہ زکات کی رقم الگ کرتے وقت نیت کی،تو زکات ادا نہ ہوگی۔ہاں !اگر نیت کے بغیر فقیر کو زکات کی رقم دے دی،اور وہ رقم اس فقیر نے ابھی خرچ نہیں کی ہے،تو اب بھی نیت کرلینا درست ہے۔

''الھدایة'' میں ہے کہ

"وَلا یَجُوْزُ أدَاءُ الزَّکاۃِ إلَّا بِنِیَّۃٍ مُقَارِنَۃٍ لِلأدَاءِ ، أوْ مُقَارِنَۃٍ لِعَزْلِ مِقْدَارِ الوَاجِبِ ؛ لأنَّ الزکاۃَ عِبَادَۃٌ ، فَکَانَ مِنْ شَرْطِھَا النِّیَّۃُ". (۱)

اور''الاختیار لتعلیل المختار''میں ہے کہ

"ولایَجُوْزُ أدَاءُ الزکاۃِ إلَّا بِنِیَّۃٍ مُقَارنۃٍ للأدَاءِ ، أوْ مُقَارنَۃٍ لِعَزْلِ مِقْدَار الوَاجِب ؛ لأنَّ النِّیَّۃ لا بُدَّ منھا لأدَاءِ العِبَادَات". (۲)

علامہ بدرالدین عینی-رحمہ اللہ-نے''البنایة شرح الھدایة''میں لکھا ہے کہ:

"وفي الروضۃ :دَفَعَ إلٰی فَقِیْرٍ بلا نِیَّۃٍ ثُمَّ نَوَاہُ عَنِ الزَّکاۃِ ، إنْ کانَ قَائِماً فِيْ یَدِ الفَقِیْرِ أجْزَأَہُ وإلَّا لاَ". (۳)

اور علامہ ابن نجیم-رحمہ اللہ-نے "البحر الرائق" میں صاحبِ''کنز الدقائق" کے قول'' مقارنة'' پر لکھا ہے کہ

''أطْلَقَ المُقَارَنَۃَ، فَشَمَلَ المُقَارَنَۃَ الحَقِیْقِیَّۃَ وھو ظاھرٌ، والحُکْمِیَّۃَ کَمَا إذَا دَفَعَ بلا نِیَّۃٍ ثُمَّ حَضَرَتْہ النِّیَّۃُ والمَالُ قَائمٌ في یَدِ الفَقِیْر ؛ فإنَّہ یُجْزِئُہ" .

(۱) الھدایة:۱۷۰/۲

(۲) الاختیار لتعلیل المختار:۱۰۱/۱

(۳) البنایة:۳۷۰/۳

(۴) البحر الرائق:۳۶۸/۲

وقت ہونے کے بعد زکات نکالنے میں جلدی کرنا چاہیے

زکات نکالنے میں جلدی کرنا چاہیے، وقت ہونے کے بعد تاخیر کرنا اچھا نہیں ہے اور زکات کا وقت مال پر سال گزرنے پر ہوجاتا ہے؛ لہذا اگر کسی کا وقتِ زکات، ربیع الاول کا مہینہ ہے، یا رجب، یا شعبان کا مہینہ ہے، تو اس کو اسی وقت زکات نکال دینا چاہیے، رمضان تک تاخیر نہیں کرنا چاہیے؛ کیوں کہ بلا وجہ تاخیر کراہت سے خالی نہیں۔ ہاں! اگر کسی کو اپنے مالک نصاب ہونے کی تاریخ ہی یاد نہیں تھی، اس لیے اس نے آسانی کے لیے رمضان کی ایک تاریخ مقرر کر لی، تو اس کی گنجائش ہے، اور اگر کسی نے رمضان میں ایک تاریخ مقرر کر لی، تو پھر اس کو ہر سال اسی تاریخ کو یا اس سے پہلے زکات نکالنی چاہیے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رمضان میں زکات نکالنے کا ثواب زیاہ ہے، اس لیے وہ رمضان تک انتظار کرتے ہیں، حالاں کہ ان کی تاریخ اس سے بہت پہلے ہوجاتی ہے، مگر یاد رکھیے کہ وقت پر زکات نکالنا اور دینا رمضان تک موخر کرنے سے بہتر ہے، لہذا وقت پر نکالنے کی کوشش کی جائے۔

زکات واجب ہونے کے بعد اگر کوئی شخص ادا نہیں کیا اور انتقال کر گیا؟

زکات واجب ہونے کے باوجود اگر کسی شخص نے ادا نہیں کیا اور انتقال کر گیا، تو اس میں فقہائے حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زکات واجب ہونے کے بعد ادائیگی سے پہلے انتقال ہوجائے، تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے زکات ادا کرنے کی وصیت کی ہے، یا نہیں؟ اگر وصیت کی ہے، تو اس کے ترکے میں سے ایک ثلث (تہائی) مال سے اس کی زکات ادا کی جائے گی اور اگر اس نے کوئی وصیت نہیں کی ہے، تو اس کے چھوڑے ہوئے مال سے یہ زکات ادا نہیں کی جائے گی، نہ اس کے وصی اور وارث کو ادائیگی کا حکم دیا جائے

گا؛ کیوں کہ زکات ایک عبادت ہے،جس کی ادائیگی زندہ انسان کی جانب سے ہوتی ہے، نہ کہ کسی میت کی جانب سے، الّا یہ کہ وہ وصیت کر جائے،تو اس صورت میں اس کی نیابت میں اس کی زکات ادا کی جاسکتی ہے۔

علامہ سمرقندیؒ نے ''تحفة الفقهاء'' میں اور ذرا سے فرق کے ساتھ علامہ کاسانیؒ نے ''بدائع الصنائع'' میں لکھا ہے کہ

''وَلَوْ مَاتَ مَنْ عَلَيْهِ الزكاةُ قَبْلَ الأدَاءِ ، فَلاَ يَخْلُوْ إمّا إن أوْصٰى بِالأدَاءِ ، أوْ لَمْ يُوْصِ ، فإنْ لَمْ يُوْصِ فَإنَّهُ تَسْقُطُ عَنْه الزَّكَاةُ فِيْ أحْكَامِ الدُّنْيَا ،حَتّٰى لاتُؤْخَذَ مِنْ تَركَتِه ، ولا يُؤْمَرُ الوَصِيُّ وَالوَارِثُ بِالأدَاءِ مِنْ مَالِه عِنْدَنا .... وأمّا إذَا أوْصٰى فإنَّه يُؤَدِّيْ مِنْ ثُلُثِ مَالِه الخ ''۔ (۱)

یہاں ایک بات خاص طور پر قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ زکات واجب ہونے کے بعد ادا نہ کرنے کی صورت میں موت سے ساقط ہوجانے کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے آخرت میں گناہ نہ ہوگا، یہ سقوط زکات کا حکم حکمِ دنیوی ہے، جیسا کہ اوپر کی عبارت میں علامہ کاسانیؒ نے صراحت کی ہے، باقی رہا حکم آخرت،تو اگر موت سے پہلے اس قدر موقعہ تھا کہ زکات ادا کرسکتا تھا، پھر بھی نہیں ادا کی،تو گناہ ہوگا؛ کیوں کہ بلا عذر تاخیر کرنا گناہ ہے۔

زکات تھوڑی تھوڑی کر کے سال بھر میں ادا کرنا کیسا ہے؟

اگر کوئی شخص اپنی زکات سال بھر میں تھوڑی تھوڑی کر کے ادا کرے،تو کیا اس کی اجازت ہے؟ جواب سے پہلے ایک بات سمجھنا چاہیے کہ فقہاء کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ زکات علی الفور واجب ہے، یا علی التراخی واجب ہے؛ یعنی واجب ہوتے ہی فوراً ادا کر دینا واجب ہے، یا کچھ تاخیر سے بھی ادا کرنے کی گنجائش ہے؟ امام محمد فرماتے ہیں کہ واجب علی

(۱) تحفة الفقهاء:۱/۳۱۱، بدائع الصنائع:۲/۴۹۲

الفور ہے یعنی واجب ہوتے ہی فوراً ادا کر دینا چاہیے اور تاخیر کرنے سے گناہ گار ہوگا۔ اور امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ فوراً واجب نہیں ہے؛ بل کہ تاخیر سے ادا کی جائے، تو بھی گنجائش ہے اور پوری عمر میں کبھی بھی ادا کر دیا تو اس کا فرض ادا ہو جائے گا؛ لہذا ان کے نزدیک کچھ تاخیر ہو جائے، تو گناہ گار نہ ہوگا۔ اور اس مسئلے میں فتوے میں بھی اختلاف ہے کہ بعض فقہاء نے امام محمد کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے اور بعض نے امام ابو یوسف کے قول پر فتوی دیا ہے۔ (۱)

دوسری بات یہ سمجھ لیں کہ امام ابو یوسف جو کہتے ہیں کہ تاخیر کر سکتے ہیں، اس کا مطلب یہی ہے کہ آدمی پر جو زکات واجب ہوگئی، اس کی ادائیگی میں تاخیر کر سکتے ہیں۔

اور امام محمد جو یہ کہتے ہیں کہ فوراً دینا چاہیے، تاخیر سے گناہ گار ہوگا، تو اس کے بارے میں بھی فقہاء کی دو رائیں ہیں کہ تاخیر سے کیا مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ امکانی وقت کے بعد ایک دن بھی تاخیر نہیں کر سکتا، ورنہ گناہ گار ہو جائے گا اور بعض کہتے ہیں کہ تاخیر سے مراد آئندہ سال تک تاخیر کرنا ہے کہ اس سے گناہ گار ہوگا اور اگر اگلے سال سے پہلے پہلے ادا کر دیا، تو گناہ گار نہ ہوگا۔ (۲)

مگر دھیان میں رہے کہ زندگی کا کیا بھروسہ؟ موت کسی کو پوچھ کر نہیں آتی، اس لیے بلا وجہ تاخیر کرنا اچھی بات نہیں، اس لیے بلا وجہ تاخیر نہ کرنا چاہیے۔

زکات تحفے کے نام سے بھی دی جا سکتی ہے

زکات دینے کے سلسلے میں یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے رشتہ داروں میں بعض لوگ محتاج و غریب ہیں، اور ہم ان کو زکات کی رقم دینا چاہتے ہیں؛ مگر ان کو زکات میں سے دیں گے، تو وہ برا سمجھیں گے، ایسی صورت میں ہم کیا کریں، ان کو دیں، یا نہ دیں؟

(۱) الدر المختار مع الشامي:۳/۱۹۱، وغیرہ

(۲) الشامي:۲/۱۹۲

جواب: یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زکات دیتے وقت مستحق کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ زکات کی رقم ہے؛ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ یاد رکھیں کہ زکات کو زکات کہہ کر دینا ضروری نہیں؛ بل کہ زکات کو تحفہ کہہ کر کسی کو دیں، تو بھی جائز ہے اور زکات ادا ہو جائے گی؛ مگر شرط یہ ہے کہ زکات دینے کی نیت ہونا چاہیے؛ لہذا اپنے رشتہ داروں کو زکات کے عنوان سے دینا ضروری نہیں؛ بل کہ تحفہ کہہ کر دی جا سکتی ہے۔

چناں چہ فقہائے کرام نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اگر فقیر و مسکین کو زکات کی رقم زکات کی نیت سے تحفہ یا ہبہ کہہ کر دی جائے، تو زکات ادا ہو جاتی ہے اور فقیر کو یہ بتانا، یا اس کو یہ معلوم ہونا کہ یہ زکات کی رقم ہے ضروری نہیں ہے۔

"البحر الرائق" میں ہے کہ:

"وَالأَصَحُّ كَمَا في المُجْتَبىٰ والقُنية : أنَّ مَنْ أعْطٰى مِسْكِيْناً دَرَاهِمَ ، وَسَمَّاهَا هِبَةً أو قَرْضاً وَنَوَى الزَّكَاةَ ، فإنَّهَا تُجْزِئُه". (۱)

اور "دُرَر الحُكّام شرح غُرَر الأحكام" میں اور "مجمعُ الأنهُر شرح مُلْتَقَى الأبْحُر" میں ہے کہ:

" ولا يُشْتَرَطُ عِلْمُ الفقير بأنَّهَا زكاةٌ على الأصَحِّ لِمَا في البحر عن القُنية و المُجْتَبٰى : الأصَحُّ أنَّ مَنْ أعْطٰى مِسْكِيْناً دَرَاهِمَ ، وسَمَّاهَا هِبَةً أو قَرْضاً ونَوَى الزَّكَاةَ ، فإنَّهَا تُجْزِئُه" (۲)

ٹیکس کی ادائیگی سے زکات ادا نہیں ہوتی

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومتوں کو جو ٹیکس دیا جاتا ہے، اس سے زکات کی ادائیگی

(۱) البحر الرائق:۲/۳۷۰

(۲) درر الحُکّام:۱/۱۷۲، مجمع الأنهر:۱/۲۹۰

ہو جاتی ہے، مگر یہ بات بالکل غلط ہے اور تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ٹیکس میں جو رقم دی جاتی ہے، اس سے زکات ادا نہیں ہو سکتی۔

وجہ یہ ہے کہ زکات اور ٹیکس میں کئی طرح کے فرق پائے جاتے ہیں اور فی الواقع ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان فروق کا ذکر علامہ دکتور یوسف القرضاوی نے ''فقہ الزکاۃ'' میں بڑی تفصیل سے کیا ہے، ہم یہاں ان میں سے چند اہم امور کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

(۱) یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ زکات ایک عبادت ہے، جس طرح نماز و روزہ وغیرہ عبادات ہیں، جو محض اللہ کی جانب سے بندوں پر لاگو ہوتی ہیں اور ان کا مقصد محض اللہ کی خوشنودی ہوا کرتی ہے، جب کہ ٹیکس تو محض دنیوی حکومتوں کی جانب سے عائد کردہ ایک قانونی حق ہے، جس میں کسی قسم کی عبادت کا تصور نہیں ہے؛ لہٰذا ٹیکس میں رقم دینے سے زکات میں محسوب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(۲) دوسرا فرق اس میں یہ ہے کہ زکات عبادت ہونے کی وجہ سے صرف اہل اسلام پر لاگو ہوتی ہے اور اسلامی حکومت بھی صرف اہل اسلام ہی سے اس کو وصول کر سکتی ہے اور یہ غیر مسلموں پر نہ لاگو ہوتی ہے اور نہ ان سے وصول کی جاتی ہے، جب کہ ٹیکس ہر ایک پر عائد ہوتا ہے، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، اس سے معلوم ہوا کہ ٹیکس اور زکات میں بڑا فرق ہے۔

(۳) پھر یہ بھی غور کیجیے کہ زکات کے شرائط و احکام میں اور ٹیکس کے اصول و ضوابط میں زمین و آسمان کا فرق ہے، شریعت میں زکات کا نصاب مقرر ہے، اس کے شرائط بیان کیے گئے ہیں، اس کے اموال بتائے گئے ہیں، اس کے برخلاف ٹیکس کا نظام اور اس کے اصول و شرائط بالکل دوسرے ہیں۔

(۴) نیز زکات کے اصول و شرائط، اس کے احکام و قواعد ساری دنیا کے اہل اسلام کے لیے ایک ہیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ ٹیکس کے اصول و قواعد ہر حکومت کے الگ

الگ ہوا کرتے ہیں۔

(۵) ایک اور فرق یہ ہے کہ ٹیکس کے اصول ونظام میں حسب موقعہ حکومتیں تغیر وتبدیلی کی مجاز ہوتی ہیں اور اس میں کوئی اشکال کی بات بھی نہیں ہے؛ لیکن زکات کے اصول واحکام میں تغیر وتبدیلی کا کسی کو اختیار نہیں؛ کیوں کہ یہ اللہ کی جانب سے قطعی طور پر مقرر ہیں۔

(۶) نیز زکات کے خاص مصارف مقرر ہیں، جیسا کہ آگے آئے گا اور زکات کا ان ہی مصارف میں خرچ کرنا لازم ہے، اس کے برخلاف ٹیکس کے مصارف بالکل دوسرے ہیں اور ان مصارف میں زکات کا خرچ کرنا صحیح نہیں ہے۔ (۱)

الغرض زکات ایک عبادت ہے اور اس کو اللہ کے حکم کے مطابق نکالنا اور خرچ کرنا لازم ہے، اپنی مرضی سے جیسا چاہے اور جہاں چاہے اور جتنا چاہے، خرچ نہیں کر سکتے، لہذا ٹیکس میں زکات دینا جائز نہیں ہے اور اس سے زکات ادا نہیں ہوتی۔

زکات حساب کے ساتھ نکالیں

زکات نکالنے میں اپنے مال کا حساب کر کے زکات نکالنا چاہیے، محض اندازے سے زکات نکالنا درست نہیں ہے؛ اسی لیے احادیث میں جہاں زکات کا نصاب بیان کیا گیا ہے، وہیں اس کا حساب بھی بیان کیا گیا ہے۔

مثلاً حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

«فَهَاتُوا صَدَقَةَ الرِّقَةِ مِنْ كُلِّ أَرْبَعِينَ دِرْهَمًا دِرْهَمٌ ، وَلَيْسَ فِي تِسْعِينَ وَمِئَةٍ شَيْءٌ ، فَإِذَا بَلَغَتْ مِئَتَيْنِ فَفِيهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ » (۲)

(چاندی کی زکات میں سے ہر چالیس درہم میں سے ایک درہم لاؤ، اور ایک سو نوے درہم میں کچھ نہیں، پس جب وہ دو سو کو پہنچ جائیں، تو ان

(۱) تفصیل دیکھیے: فقه الزكاة: ۲/۹۹۹-۱۰۰۵

(۲) الترمذي: ۶۲۵، باب ماجاء في زكاة الذهب والورق

میں پانچ درہم ہیں)۔

اس حدیث میں غور کیجیے کہ ایک تو یہ فرمایا کہ ہر چالیس درہم میں سے ایک درہم لاؤ، یہ حساب بتایا ہے کہ کتنے مال پر کس قدر زکات نکالنی ہے اور جو یہ فرمایا کہ ایک سو نوے میں کچھ نہیں، بل کہ جب دو سو درہم ہو جائیں، تو پانچ درہم ہیں، یہ نصاب کا بیان ہے۔

اس میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ احادیث کی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ جو نصاب بیان کیا گیا ہے، اس میں سے ایک پائی بھی کم ہو، تو زکات واجب نہیں ہوتی اور اس سے زائد ہو، تو زکات فرض ہو جاتی ہے۔ علامہ خطابیؒ اسی سلسلے کی ایک حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر مال نصاب کے پورا ہونے سے ذرا بھی کم ہو، تو اس میں زکات واجب نہیں ہوتی۔ (۱)

اگر کوئی حساب ہی نہ کرے اور محض اندازے سے زکات نکالے، تو کم و بیش ہونے کا شدید خطرہ ہے؛ لہذا حساب کرنا متعین ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر محض اندازے سے زکات نکالنا درست ہوتا، تو احادیث میں اس کا حساب ہی کیوں بیان کیا جاتا کہ اتنے مال میں اس قدر نکالو، سونے میں سے اتنا اور چاندی میں سے اتنا نکالو؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکات نکالنے کے لیے پہلے اپنے مال کا حساب کرنا چاہیے۔

بہت سے لوگ زکات تو نکالتے ہیں اور پابندی سے بھی نکالتے ہیں، مگر پوری طرح اپنے مال کا حساب نہیں کرتے، کچھ کا حساب لگاتے ہیں اور کچھ کا نہیں لگاتے، یا ایک اندازے سے نکالتے ہیں، ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مال زیادہ ہو اور زکات کم نکالی گئی ہو، تو اللہ کے یہاں پکڑ ہوگی، لہذا حساب کر کے نکالنا چاہیے اور احتیاطاً زیادہ ہی نکال دینا چاہیے۔

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب -رحمہ اللہ- سے کسی نے سوال کیا ہے کہ زید کی دکان جب سے قائم ہوئی ہے، اس وقت تک کوئی ایسا حساب کتاب مرتب نہیں ہوا، جس سے اس

---

(۱) معالم السنن: ۳۰/۲

کی مالیت کا صحیح اندازہ ہو سکے، ایسی حالت میں زکات ادا کرنے کی کونسی صورت اختیار کرے؟

آپ نے اس کے جواب میں لکھا ہے کہ "حساب کر کے ہی زکات ادا کرنی چاہیے۔"(۱)

ہاں! بعض کاروبار ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں تمام کے تمام سامان تجارت کا شمار کرنا نہایت مشکل کام ہوتا ہے، لاکھوں کا مال پڑا ہوا ہے، مگر کتنا ہے؟ اس کو معلوم کرنا بڑا مشکل ہے، لہذا ایسے لوگ دو باتوں کا اہتمام کریں: ایک تو یہ کہ جہاں تک ممکن ہو اور اپنے بس میں ہو، اس کا حساب لگانے کی کوشش مختلف طریقوں اور وسائل سے کر لیں اور اندازہ وتخمینہ لگانے میں کوئی کسر اپنی حد تک نہ چھوڑیں، لیکن چوں کہ یہ محض ایک اندازہ ہوگا، جس میں کمی بیشی کا امکان ہے، لہذا وہ لوگ دوسرا اہتمام یہ کریں کہ جو بھی اندازہ ہوا، اس سے کچھ زیادہ ہی زکات میں دے دیں، ان شاء اللہ العزیز اگر اتنا اہتمام کر لیں گے، تو امید ہے کہ وہ بری الذمہ ہو جائیں گے۔

زکات کا حساب کیسے کریں؟

زکات نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے مال کا جائزہ لیں اور حساب لگائیں، اس کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ پہلے قابل زکات اموال کی فہرست بنائیں اور قابل زکات اموال کون کونسے ہوتے ہیں، اس کو سمجھ لیجیے اور اس کے مطابق لسٹ تیار کیجیے:

(۱) آپ کی ملکیت میں جو بھی کرنسی، روپیہ پیسہ ہو، اس کو لکھ لیں، خواہ وہ اپنے پاس موجود ہو یا بینک میں رکھا ہو۔ اور اگر غیر ملکی کرنسی ہو، تو اس کی بھی موجودہ ویلیو کو جمع کر لیں۔

(۲) کسی بزنس وتجارت میں کوئی رقم لگائی ہو، خواہ اپنے ذاتی بزنس میں یا کسی کے ساتھ پارٹنرشپ میں مضاربت کے طور پر، یا مشارکت کے طور پر، اس کو نوٹ کر لیں۔

(۳) اپنے گودام، یا فیکٹری یا دکان میں جو بھی تجارت کا مال اسٹاک موجود ہو، اور جو خام مال Raw Meteriel موجود ہو، اس کی موجودہ بازاری قیمت لکھ لیں۔

---

(۱) فتاوی دار العلوم: ۶/ ۱۴۸

(۴) تجارت کے لیے کوئی پلاٹ یا مکان، دکان، فلیٹ، خریدا ہو، تو اس کی موجودہ قیمت کو لکھ لیں۔

(۵) لائف انشورنس میں لگی ہوئی رقم، شیئرز، فینانشیل سرٹیفیکیٹس، سیونگ سرٹیفیکیٹس، اور بانڈز کی رقم جمع کر لیں۔

(۶) اختیاری طور پر آپشنل پی یف میں جو رقم جمع کی گئی، اس کو نوٹ کر لیں۔

(۷) غیر اختیاری پی یف میں سے جو رقم وصول ہوگئی ہو، اس کو درج کر لیں۔

(۸) اگر آپ کو کسی بھی جگہ سے کوئی رقم وصول ہونا باقی ہو، جیسے آپ نے کسی کو قرض دیا ہو، یا کوئی چیز آپ نے کسی کو بیچی تھی، جس کی قیمت ابھی آنا باقی ہے، تو اس کو بھی لکھیں۔

(۹) اگر بچوں کی شادی کے لیے یا گھر بنانے کے لیے، یا حج کے لیے، یا کسی اور کام کے لیے کوئی رقم جمع کی ہو، تو اس کو بھی اس فہرست میں لکھ لیں۔

(۱۰) سونا، چاندی، کسی بھی شکل میں ہو، خواہ زیور کی شکل میں، یا بسکیٹ کی شکل میں یا سکے کی شکل میں، اس کی وہ قیمت نکالیں، جو ان کو اب بیچنے سے آپ کو ملے گی، اور اس کو بھی لکھ لیں، مگر زیور میں اگر کنکر و نگینے ہوں، تو ان کو حساب میں نہ لیں؛ کیوں کہ ان پر زکات نہیں ہے۔

ان تمام کو جوڑ کر ان کی قیمت نکالیں، اور جوڑ کر رکھ لیں۔

پھر ایک اور حساب یہ تیار کریں کہ آپ کے ذمے کیا کیا واجب الادا ہے، یعنی آپ پر دوسروں کو کتنا دینا باقی ہے، مثلاً کسی شخص کو یا بینک کو، یا کسی ادارے کو قرض دینا ہے، یا کوئی چیز خریدی تھی، اس کی قیمت ادا کرنا باقی ہے، یا زکات کے وقت سے پہلے تک کوئی لائٹ بل، پانی بل، دکان، مکان کا کرایہ، یا آپ کے پاس کام کرنے والے ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنا باقی ہے، تو ان سب کو بھی جوڑ لیں اور پھر پہلی لسٹ جو قابل زکات مالوں کی تیار کی تھی، اس کی کل قیمت میں سے اس دوسری لسٹ کی مالیت کو نکال دیں، اب جو

بھی بچے، آپ کو اس کی زکات دینی ہے۔ مثلاً پہلی لسٹ کے مطابق آپ کا قابل زکات مال دس لاکھ کا نکلا اور آپ کو دوسروں کو دینا ہے، دو لاکھ، تو دس میں سے دو لاکھ نکال دیں، لہذا آپ کو آٹھ لاکھ کی زکات دینی ہوگی۔

۞ زکات میں چالیسواں حصہ دینا ہے

سونے، یا چاندی اور اسی طرح روپیہ، پیسہ، کرنسی اور مال تجارت کی زکات میں جو مقدار واجب ہے، وہ ان کا چالیس واں حصہ ہے، لہذا تمام مذکورہ قابل زکات اموال کو جمع کر کے اس میں سے چالیس واں حصہ زکات میں نکالنا چاہیے اور اس کو ڈھائی فی صد بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ ڈھائی فی صد بھی چالیس واں حصہ ہی ہوتا ہے۔

اور یہ مقدار شریعت میں مقرر کر دی گئی ہے اور احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے، چناں چہ سونے و چاندی کے نصاب کے بیان میں ہم نے حضرت علی –رضی اللہ عنہ– کی حدیث ذکر کی تھی کہ حضرت رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے فرمایا کہ

« فَإِذَا كَانَتْ لَكَ مِئَتَا دِرْهَمٍ ، وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ ، فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ ، وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ يَعْنِيْ فِي الذَّهَبِ حَتَّى يَكُوْنَ لَكَ عِشْرُوْنَ دِيْنَاراً ، فَإِذَا كَانَ لَكَ عِشْرُوْنَ دِيْنَاراً ، وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ فَفِيْهَا نِصْفُ دِيْنَارٍ ، وَمَا زَادَ فَبِحِسَابِ ذٰلِكَ » (۱)

اور "الهداية" میں علامہ مرغینانی –رحمہ اللہ– نے لکھا ہے کہ

"لَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ مِائَتَيْ دِرْهَمٍ صَدَقَةٌ .... فَإِذَا كَانَتْ مِائَتَيْن وَحَالَ عَلَيْهَا الحَوْلُ فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ............، لَيْسَ

(۱) سنن أبي داود : الزكاة / باب في زكاة السائمة ، ح : ۱۵۷۳

فِيْمَا دُوْنَ عِشْرِيْنَ مِثْقالاً مِنَ الذَّهَبِ صَدَقَةٌ ، فَإِذَا كَانَتْ عِشْرِيْن مِثْقالاً فَفِيْهَا نِصْفُ مِثْقَالٍ ."(۱)

اور"بدائع الصنائع" میں علامہ کاسانی –رحمہ اللہ– لکھتے ہیں کہ

"وأمّا مِقْدَارُ الواجبِ فيها (الفِضَّة) فَرُبْعُ العُشْر ، وهو خَمْسَةٌ مِنْ مِائَتَيْن ؛ لِلْأَحَادِيْث الَّتِي روينا ، إذ المَقَادِيْرُ لا تُعْرَفُ إلَّا تَوْقِيْفاً.......................وأما مِقْدَارُ الواجب فيه (الذَّهَب) فَرُبْعُ العُشْر ؛ بِحَدِيْث عَمْرو بن حَزم وحديث عَلِيّ ؛ لأنّ نِصْفَ مِثْقَالٍ مِنْ عِشْرِيْن مِثْقَالاً رُبْعُ عُشْرِه. ....وأمّا مِقْدَارُ الوَاجِب مِنْ هٰذا النِّصَاب (نصاب التجارة)، فمَا هُوَ مِقْدَارُ الوَاجِبِ مِنْ نِصَابِ الذَّهَب، و الفَضَّةِ وهُو رُبْعُ العُشْر ". (۲)

الغرض سونے، چاندی اور روپیہ، پیسہ، کرنسی اور مال تجارت میں زکات کی مقدار چالیسواں حصہ ہے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس قابل زکات مالوں کی قیمت"دس ہزار روپئے" نکلی تو اس کا چالیسواں حصہ"دوسو پچاس روپئے" ہوگا، اگر کسی کے پاس ایک لاکھ روپئے ہوں تو اس کی زکات دو ہزار پانچ سو روپئے نکلے گی، دو لاکھ ہوں، تو پانچ ہزار روپئے، تین لاکھ میں سات ہزار پانچ سو، اور چار لاکھ میں دس ہزار روپئے ہوں گے۔

زکات میں اصل اور نفع دونوں کا حساب لگانا چاہیے

زکات کا حساب لگاتے ہوئے اصل سرمایے کے ساتھ اس سے حاصل ہونے والے موجودہ نفع کو بھی شامل کرنا لازم ہے، بعض لوگوں کے درمیان یہ غلط فہمی دیکھی گئی کہ اصل

---

(۱) الهداية :۱۸۸/۲

(۲) بدائع الصنائع:۴۱۰/۲، ۴۱۱-۴۱۷

سرمایے کی زکات دیتے ہیں اور نفع کی نہیں، اور بعض لوگوں میں اس سے بڑی غلط فہمی یہ دیکھی گئی کہ صرف نفع کی زکات نکالتے ہیں اور اصل کی نہیں، حکم یہ ہے کہ اصل سرمایے کے ساتھ اس کا نفع بھی اگر بچا ہوا موجود ہو، تو اس کی بھی زکات نکالنی ہے۔

زکات میں اشیاء بھی دے سکتے ہیں اور ان کی قیمت بھی دے سکتے ہیں

زکات کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی یاد رکھیں کہ زکات میں رقم بھی دی جا سکتی ہے اور اشیاء جیسے کپڑے، یا اناج وغلہ، یا کوئی ضرورت کی چیزیں بھی دی جاسکتی ہیں۔

حضرت عمر اپنے دور خلافت میں اور صحابہ جو حکومت کی جانب سے لوگوں کی زکات وصول کرتے تھے، وہ چاندی، یا دوسرا سامان بھی وصول کرلیا کرتے تھے۔

چنانچہ امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے اپنے "مُصَنَّف" میں حضرت عطا رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ

"إِنَّ عُمَرَ –رضي الله عنه– كَانَ يَأْخُذُ الْعُرُوْضَ فِيْ الصَّدَقَةِ مِنَ الْوَرَقِ وَغَيْرِهَا". (۱)

(حضرت عمر زکات میں چیزیں جیسے چاندی وغیرہ بھی لے لیتے تھے)

اسی طرح حضرت معاذ بن جبل –رضي الله عنه– سے بھی نقل کیا ہے؛ بل کہ ایک روایت میں حضرت طاوس –رحمہ اللہ– سے مرسلاً یہ نقل کیا ہے کہ

"بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ –صلى الله عليه وسلم– مُعَاذاً إِلَى الْيَمَنِ فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ الصَّدَقَةَ مِنَ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ، فَأَخَذَ مِنَ الْعُرُوْضِ وَالثِّيَابِ مِنَ الْحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ". (۲)

الغرض اس میں کوئی حرج نہیں کہ سامان، خواہ وہ کپڑا ہو یا اناج وغلہ ہو یا اور کوئی چیز، زکات میں ان کو دیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) المصنف لابن أبي شيبة، رقم: ۱۰۵۳۹

(۲) المصنف لابن أبي شيبة، رقم: ۱۰۵۳۸

اوراگرکوئی چاہے کہ زکات میں ان اشیاء کی قیمت ادا کرے،تواس کی بھی اجازت ہے۔

چناں چہ''الدر المختار''میں ہے کہ:

''وجَازَ دَفْعُ القِيمَةِ فِيْ زَكَاةٍ وَعُشْرٍوَخِرَاجٍ وفِطْرَةٍ ونَذْرٍ ، وكَفَّارَةٍ غيرِ الإعْتَاقِ''.(۱)

اور''الاختيار لتعليل المختار''میں ہے کہ:

''ويَجُوْزُ فِيْهَا دَفْعُ القِيْمَةِ، وَكَذا فِيْ الكَفّارَاتِ والنُّذُوْرِ، وصَدَقَةِ الفِطْرِ ، والعُشُوْرِ''.(۲)

لہذا جس میں سہولت محسوس ہواس کواختیار کرے،یا جس میں فقراء کی سہولت ہو، اس کواختیار کرےاور غالباً عام حالات میں رقم دینے میں سہولت ہے۔

زکات کی ادائیگی میں کونسی قیمت کالحاظ ہوگا؟

ایک سوال اس سلسلے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ زکات نکالنے میں چیزوں کی کونسی قیمت کا اعتبار ہوگا؟ کیوں کہ قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے،کل ایک قیمت ہے،تو آج ایک قیمت ہے،خصوصاً سونے اور چاندی کی قیمتوں میں یہ قصہ بہت ہوتا ہے؛لہذا زکات دینے والا کونسی قیمت کالحاظ کر کے زکات نکالے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض فقہائے حنفیہ نے ذکر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جس دن زکات واجب ہوئی، اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا،خواہ خریدتے وقت اس کی قیمت اس سے کم ہو،یازیادہ ہو،اورامام ابو یوسف اورامام محمد کے نزدیک اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا،جس دن زکات ادا کی جارہی ہے۔

مثلاً ایک شخص کے پاس ایک سوگرام سونا ہے،اوراس پرایک سال گزرگیا اور جب

---

(۱) الدر المختار:۳/۲۱۰، باب زكاة الغنم

(۲) الاختيار لتعليل المختار:۱/۱۰۲

سال گزرا، تو اس کی قیمت مثال کے طور پر دو لاکھ روپے تھی، مگر وہ ابھی ادا نہیں کیا تھا کہ اس کی قیمت بڑھ کر دو لاکھ پچیس ہزار ہوگئی، تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک وہ جب بھی ادا کرے گا، تو وہی دو لاکھ کی زکات دے گا؛ لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک ادائیگی کے دن کا اعتبار کرتے ہوئے اس کو دو لاکھ پچیس ہزار کی زکات ادا کرنی ہوگی۔

چناں چہ "المحيط البرهاني" میں ہے کہ:

" فالحَاصِلُ : أنَّ أبَا حنيفةَ يَعْتَبِرُ القِيْمَةَ يَوْمَ الوُجُوْب في جِنْسِ هٰذِه المَسَائِل ، وهُمَا يَعْتَبِرَانِ القِيْمَةَ يَوْمَ الأَدَاءِ". (۱)

اسی طرح "الجوهرة النيرة" میں ہے کہ:

" ثُمَّ المُعْتَبَرُ عند أبي حنيفةَ يَوْمَ الحَوْلِ ولا يُلْتَفَتُ بعدَ ذٰلک إلى زِيَادَةِ القِيْمَةِ ونُقْصَانِها ، وعندهما يومَ الأَدَاءِ إلى الفُقَرَاءِ " . (۲)

لیکن اس مسئلے میں فتوی صاحبین کے قول پر ہے کہ ادائیگی کے دن کا اعتبار ہے، جیسا کہ علامہ شرنبلالی -رحمہ اللہ- اور علامہ شامی -رحمہ اللہ- نے تحریر کیا ہے۔

چناں چہ شامی -رحمہ اللہ- نے "رد المحتار" میں لکھا ہے کہ

" إنَّ المُعْتَبَر عندَه فِيْهَا يَوْمُ الوُجُوْبِ. وقِيْلَ: يَوْمُ الأَدَاءِ. وفِيْ المُحِيْط : يُعْتَبَرُ يومُ الأداء بالإِجْمَاع وهو الأَصَحُّ. فهو تَصْحِيْحٌ لِلقَوْلِ الثَّاني المُوافِق لِقَوْلِهِمَا ، وعليه فاعْتِبارُ يومِ الأَدَاءِ يكونُ مُتَّفَقاً عليه عندَه و عندهما " . (۳)

---

(۱) المحيط البرهاني: ۲/۲۴۹

(۲) الجوهرة النيرة: ۱/۳۰۵، باب زكاة العروض

(۳) الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۳۱۲

اورعلامہ شرنبلالی-رحمہ اللہ-نے ''درر الحکام'' کے حاشیے میں لکھا ہے کہ

''والخِلافُ فِي زَكاةِ المَالِ ، فَتُعْتَبَرُ القِيْمَةُ وقتَ الأدَاءِ فِيْ زَكَاةِ المَالِ عَلَى قَوْلِهِمَا وهو الأَظْهَرُ ''.(۱)

بلکہ صاحب ''بدائع الصنائع'' کی تحقیق یہ ہے کہ یوم الاداء کا معتبر ہونا یہ ہمارے تمام اصحاب کا مذہب ہے۔ چناں چہ وہ تصریح کرتے ہیں کہ

''والصَّحِيْحُ أنَّ هٰذا مَذهبُ جَمِيْعِ أصْحَابِنَا ''.(۲)

لہذا جس چیز کی زکات میں قیمت دینا ہو، اس کی قیمت ادائیگی کے دن معلوم کرنا چاہیے اور اسی کے حساب سے زکات نکالنا چاہیے۔

سونے وچاندی کے زیورات کی زکات میں خریدنے کی قیمت کا اعتبار ہے یا بیچنے کی قیمت کا؟

یہاں ایک مسئلہ قابل ذکر یہ بھی ہے کہ زیورات کے کاروبار میں تقریباً ہر جگہ یہ اصول ہے کہ زیورات کے تاجرین جب کوئی زیور بیچتے ہیں، تو اس کی قیمت الگ رکھتے ہیں اور جب وہ عام لوگوں سے خریدتے ہیں، تو اس کی قیمت الگ رکھتے ہیں؛ حتی کہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک دکان سے زیور خریدا گیا اور دکان سے باہر نکل کر کسی وجہ سے وہی زیور اسی دکان دار کو واپس کرنا چاہیں، تو وہ اسے کم قیمت میں لے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ زیورات کی زکات میں کونسی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا؟ اسی طرح یہ تاجرین جب بیچتے ہیں، تو زیورات میں بنائی یعنی اس کو ڈھالنے اور اس کی ڈیزائننگ کی اجرت بھی لگاتے ہیں، لیکن جب وہ دوسروں سے خریدتے ہیں، تو اس کی قیمت نہیں دیتے۔ لہذا سوال یہ ہے کہ زیورات میں

(۱) دُرَرُ الحُکّام:۱/۱۸۱

(۲) بدائع الصنائع :۲/۲۱۸،فصلٌ في صفة الواجب في مال التجارة

زکات کس قیمت کے حساب سے دی جائے؟

جواب یہ ہے کہ اپنے زیورات جس قیمت پر بازار میں فروخت ہوں گے، اسی قیمت کا اعتبار ہوگا، اور اسی کے حساب سے زکات دینی ہوگی؛ کیوں کہ زکات اس مالیت پر لازم ہوتی ہے، جس کا آدمی مالک ہے اور مالیت وہ ہے، جو اس کو فروخت کرنے پر ملتی ہے؛لہذا فروختگی کی قیمت کا لحاظ کر کے زکات دینا چاہیے۔

مثلاً زید کے پاس سو گرام سونے کا زیور ہے، جس کی قیمت بازار میں تین ہزار روپئے پر گرام کے لحاظ سے تین لاکھ روپئے ہے؛لیکن جب زید اس کو بازار میں فروخت کرنے جاتا ہے، تو اس کو اس کی قیمت پر گرام دو ہزار سات سو روپئے کے حساب سے ہی ملتی ہے اور وہ ہوتی ہے: دو لاکھ ستر ہزار روپئے، تو اب زید کو زکات دو لاکھ ستر ہزار کی نکالنی ہے۔ اسی طرح بنائی اور ڈیزائننگ کی قیمت جو کم ہو گئی ہے، اس کو بھی زکات کے حساب میں نہیں لیا جائے گا۔

حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہی - رحمہ اللہ - سے ایک سوال کیا گیا کہ

”میں چاندی کو لے کر دکان پر جاؤں، تو اس کی آدھی قیمت کے حساب سے خریدیں گے۔ اگر لینے جاؤں، تو اصل بھاؤ میں دیں گے، تو اب کس حساب سے زکات دیں گے؟“

اس کا جواب آپ نے تحریر کیا کہ

”اگر زکات میں آپ چاندی نہیں دیتے، بل کہ اس کی قیمت دیتے ہیں، تو جس قیمت پر وہ بازار میں فروخت ہوگی، اس قیمت کا اعتبار ہوگا“۔(۱)

لیکن یاد رہے کہ یہ حکم ان لوگوں کا ہے، جو اپنے زیورات تاجروں کو بیچتے ہیں؛لیکن خود تاجر لوگوں کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ جس قیمت پر فروخت کرتے ہیں، اس کے حساب سے ان کو زکات نکالنی ہوگی؛ کیوں کہ ان کے پاس جو تجارتی زیورات ہیں، ان کی وہی قیمت مقرر ہے؛لہذا زکات بھی اسی کے لحاظ سے نکالی جائے گی۔

---

(۱) فتاوی محمودیہ، مطبوعہ پاکستان: ۹/۳۷۹-۳۸۰

حضرت حکیم الامت تھانوی -رحمہ اللہ- کے ایک فتوے سے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے، اور وہ یہ ہے:

"پس اس بنا پر مقتضی قاعدہ کا یہ ہے کہ ایسے دیار میں مالک زیورات کا اگر تاجر زیورات کا ہے، تب تو وہ زکات میں بنوائی بھی لگاوے، اگر تاجر نہیں ہے، محض استعمال میں لانے والا ہے، تو وہ نہ لگاوے۔(۱)

ہول سیل اور ریٹیل کا فرق

کاروبار کرنے والے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن کی تجارت تھوک فروشی (ہول سیل) ہوتی ہے اور وہ چیزوں کا ہول سیل کاروبار کرتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں، جن کا کاروبار پھٹکر (ریٹیل) ہوتا ہے، تو زکات کس قیمت کے حساب سے نکالی جائے گی، ہول سیل قیمت کے لحاظ سے نکالی جائے، یا ریٹیل قیمت کا لحاظ کیا جائے گا؟

اس سلسلے میں کوئی تصریح قدیم فقہاء کے کلام میں میری نظر سے نہیں گزری، ہاں! شیخ یوسف القرضاوی نے اپنی رائے یہ دی ہے کہ تاجر لوگ ہول سیل کی قیمت کے لحاظ سے زکات نکالیں گے۔ چناں چہ آپ اپنی کتاب "فقه الزكاة" میں کہتے ہیں کہ

"وَلِهٰذَا كَانَ الْقَوْلُ الرَّاجِحُ هُوَ مَا عَلَيْهِ الْجُمْهُوْرِ مِنْ تَقْوِيْم السِّلْعَةِ عندَ الحَوْلِ بِسِعْرِ السُّوْق . والمُرَادُ : سِعْرُ الجُمْلَة ؛ لأنّه الَّذِيْ يُمْكِنُ أَنْ تُبَاعَ بِه عِنْدَ الحَاجَةِ بِيُسْرٍ ، فِيْمَا أرى " .(۲)

لیکن احقر کو اصول سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کاروبار جس قسم کا ہو، زکات اسی کے لحاظ سے نکالی جائے، اگر ہول سیل تجارت ہے، تو ہول سیل کی قیمت سے اور اگر ریٹیل تجارت

(۱) امداد الفتاوی، مطبوعہ کراچی: ۲/۷۹

(۲) فقه الزكاة : ۳۳۷

ہے تو ریٹیل کے حساب سے۔ مثلاً کوئی ہول سیل کا روبار کرتا ہے، تو وہ ہول سیل قیمت کے مطابق زکات دے اور جو ریٹیل کا روبار کرتا ہے، وہ ریٹیل قیمت کا لحاظ کرے۔

یہی فتوی شیخ محمد بن صالح العثیمین نے اپنے فتاوی میں دیا ہے، چناں چہ کسی نے ان سے یہی سوال کیا، تو انھوں نے جواب میں فرمایا کہ:

" أَمَّا إِذَا كَانَ التَّاجِرُ مِنْ أَصْحَابِ الْبَيْعِ بِالْجُمْلَةِ فَيَعْتَبِرُهَا بِالْجُمْلَةِ و إِذَا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْبَيْعِ بِالْإِفْرَادِ فَيَعْتَبِرُها بالإِفْرَادِ ".(۱)

ہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگ دونوں طرح کا کاروبار کرتے ہیں، تو وہ کس قیمت کا اعتبار کریں؟ اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ ریٹیل کے حساب سے زکات دے؛ کیوں کہ فقہاء نے ایک اصول بیان کیا ہے کہ جو" أنفع للفقراء" ہے یعنی جس میں فقراء کا زیادہ فائدہ ہے، اس کا لحاظ کرنا چاہیے، اس کا لحاظ کرتے ہوئے ریٹیل کی قیمت پر زکات دینا چاہیے؛ کیوں کہ اس میں فقراء کا زیادہ فائدہ ہے۔

صاحب مال ایک ملک میں ہو اور مال دوسرے میں تو کہاں کی قیمت کا اعتبار ہوگا؟

ایک شخص ایک ملک میں رہتا ہے اور اس کا مال دوسرے کسی ملک میں ہے، تو زکات میں وہ کس ملک کی قیمت کا اعتبار کرے گا؟ جواب یہ ہے کہ اس صورت میں زکات کے لیے اُس ملک کی قیمت کا لحاظ کیا جائے گا، جس میں وہ مال موجود ہے، خواہ مالکِ مال وہاں نہ ہو، دوسری جگہ ہو۔ مثلاً ایک شخص ہندوستان میں اپنا مال رکھتا ہے، سونا یا چاندی، یا کچھ اور، مگر وہ خود امریکہ، یا برطانیہ میں رہتا ہو، تو زکات میں ان چیزوں کی ہندوستانی قیمت کا لحاظ ہوگا، اس کے برخلاف ایک شخص ہندوستان میں رہتا ہو اور اس نے امریکہ، یا سعودیہ،

(۱) مجموع فتاوی ورسائل الشیخ العثیمین :۲۳۳/۱۸

یا برطانیہ میں کوئی زمین یا مکان یا دکان بیچنے کے لیے خریدا ہو، یا کوئی تجارت وہاں قائم کی ہو، تو اس کو زکات نکالنے میں وہاں کی قیمت کا اعتبار کرنا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ مال جہاں ہو، وہاں کی قیمت کا لحاظ ہوگا۔

چناں چہ ''مَجمَعُ الانُھر'' میں ہے کہ

'' وَتُقَوَّمُ فِيْ المِصْرِ الَّذِي هُو فِيْه أو مَفازَتِه القَرِيْبَةِ ، وإِنْ كانَ لَهُ عَبْدٌ فِيْ بَلَدٍ آخَرَ يُقَوَّمُ فِيْ ذٰلک البَلَدِ الَّذِيْ هُو فِيْهِ ''. (۱)

اور ''الدر المختار'' اور اس کے حاشیے'' رد المحتار'' میں ہے کہ:

''وَيُقَوَّمُ في البَلَد الَّذِي المَالُ فِيْهِ ، فَلَوْ بَعَثَ عَبْداً لِلتِّجارَةِ فِيْ بَلَدٍ آخَرَ يُقَوَّمُ فِيْ البَلَدِ الَّذِيْ فِيْهِ العَبْدُ ''. (۲)

شیئرز کی زکات اور اس میں کونسی ویلیو کا اعتبار ہوگا؟

شیئرز کی زکات کا مسئلہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، سوال یہاں یہ ہے کہ زکات دینے میں شیئر کی کونسی قیمت کا لحاظ کیا جائے گا؟ شیئر کی ایک قیمت وہ ہے، جس کو (Face Value) کہتے ہیں، یہ شیئر کی وہ قیمت ہے، جو اس کی دستاویز پر لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ دوسری قیمت ہے: (Book Value) اور یہ وہ قیمت ہے، جو کمپنی کے دستاویزات سے معلوم ہوتی ہے کہ اس کی کیا ویلیو ہے۔ اور تیسری قیمت کو (Market Value) کہتے ہیں، اور یہ وہ قیمت ہے، جو اس شیئر کے شیئر بازار میں فروخت کرنے پر ملے گی۔

زکات میں کونسی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا؟ اس کے جواب میں علماء کے مختلف نظریات ہیں:

---

(۱) مجمع الأنهر: ۱/۳۰۷

(۲) الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۲۱۱، باب زکات الغنم

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اگر کمپنی تجارتی ہے اور اسی مقصد سے شیئر ہولڈر نے شیئر خریدا ہے، تو اس کی زکات میں (Book Value) کا اعتبار ہوگا، یہ قول شیخ علامہ الصدیق الضریر کا ہے؛ لیکن اس میں اکثر معاصرین علماء کی رائے یہ ہے کہ اس میں موجودہ بازاری قیمت یعنی (Market Value) کے لحاظ سے زکات دی جائے گی۔

اسی قول کو شیخ وھبہ الزحیلی ، شیخ عبد الرحمٰن الحلو ، دکتور احمد کردی ، دکتور رفیق المصری ، شیخ عبداللہ بن منیع ، شیخ عبداللہ البسام ، شیخ رجب بیوض تمیمی اور شیخ محمد عبدہ عمر وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔

اور اگر شیئر ہولڈر نے شیئر تجارتی مقصد سے نہیں؛ بل کہ اپنی روزمرہ کی ضروریات پورا کرنے کے لیے اور محض نفع کھانے کے لیے خریدا ہے، تو اس میں اکثر کی رائے یہ ہے کہ یہ مال شرکت کی طرح ہے؛ لہٰذا اس میں بک ویلیو (Book Value) کا اعتبار کیا جائے گا، شیخ عبداللہ بن منیع کی رائے یہی ہے؛ کیوں کہ یہی اس کی حقیقی قیمت ہوتی ہے، جب کہ بعض علماء کی رائے اس میں بھی یہی ہے کہ موجودہ بازاری قیمت یعنی (Market Value) کے لحاظ سے زکات دی جائے گی، یہی رائے دکتور احمد الکردی کی مختار ہے۔[1]

زمین اور مکان کی قیمت (ویلیو) کونسی لگائی جائے؟

یہاں ایک اور مسئلہ بھی جان لیجیے کہ تجارتی زمینوں اور مکانوں کی زکات میں اس قیمت کا اعتبار ہوگا، جو بازار میں اب چل رہی ہے، خریدتے وقت کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا، اگر خریدتے وقت ایک زمین دس لاکھ کی تھی اور اب زکات دیتے وقت اس کی قیمت بارہ لاکھ ہے، تو زکات بارہ لاکھ کے حساب سے دی جائے گی اور اگر زکات دیتے وقت زمین کی قیمت گھٹ گئی ہو، تو بھی اسی گھٹی ہوئی قیمت کے مطابق زکات دی جائے گی ، مثلاً ایک زمین دس لاکھ میں ایک

(۱) الأسهم والسندات و أحكامها : ۲۸۰-۲۸۱

سال پہلے خریدی تھی اور اب ایک سال کے بعد اس کی قیمت آٹھ لاکھ ہوگئی، تو زکات آٹھ لاکھ کی دی جائے گی۔

زکات میں استعمال شدہ اشیاء دینے کا حکم

کیا استعمال شدہ چیزیں جیسے کپڑے یا برتن وغیرہ زکات میں دینا جائز ہے اور اس سے زکات ادا ہو جاتی ہے؟ جاننا چاہیے کہ اس میں مسئلے کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ مستحب اور افضل کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ کے راستے میں اسی چیز کا دینا پسندیدہ ہے جو عمدہ سے عمدہ ہو، کیوں کہ ہم بھی اپنے لیے استعمال شدہ چیزوں کو پسند نہیں کرتے تو اللہ کے راستے میں دوسروں کو بھی عمدہ سے عمدہ ہی دینا چاہیے۔

قرآن کریم میں ہے کہ:

﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴾ (آل عمران: ۹۲)

(تم اس وقت تک بھلائی کو نہیں پہنچ سکتے، جب تک کہ وہ چیز خیرات نہ کرو، جو تم کو پسند ہے اور جو بھی تم خرچ کرتے ہو، تو بلا شبہ اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں۔)

علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مالوں میں سے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہوں، ان کو اللہ کے نام پر خرچ کرو؛ تاکہ تم کو وہ بلند مقام میسر آئے۔ لہٰذا افضل یہی ہے کہ پرانی چیزوں کے بجائے اللہ کے لیے نیا مال ہی زکات میں بھی دیا جائے۔

اور اگر زکات میں ایسی چیزیں دی جائیں، جو نا قابل استعمال اور ردی قسم کی ہوں جن کو ہم خود اپنے لیے رکھنا نہیں چاہتے، تو یہ نا جائز ہوگا۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کے رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے حضرت معاذ –رضی اللہ عنہ– کو جب ملک یمن قاضی بنا کر بھیجا تھا، تو انھیں چند نصیحتیں کیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ:

« إِيَّاکَ وَ كَرَائِمَ أَمْوَالِ النَّاسِ »
(لوگوں کے عمدہ مالوں کو زکات میں وصول نہ کرنا)(۱)

اس کی شرح میں متعدد حضرات شراح نے لکھا ہے کہ:

" وَفِيْه أَنَّه يَحْرُمُ على السَّاعِيْ أَخْذُ كَرَائِمِ المَالِ في أَدَاءِ الزَّكَاةِ ، بَلْ يأخُذُ مِنَ الوَسَطِ ، وَيَحْرُمُ عَلٰى رَبِّ المَالِ إِخْرَاجُ شَرِّ المَال " (۲)

(یعنی اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زکات وصول کرنے والے عاملین کے لیے یہ حرام ہے کہ وہ لوگوں کے عمدہ عمدہ مالوں کو زکات میں وصول کریں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مال والے کو بدترین مال زکات میں دینا بھی حرام ہے)

اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زکات کی ادائیگی کے لیے کم از کم کیسا مال ہونا چاہیے جس سے زکات ادا ہو جائے گی؟ تو اس کے لیے کم از کم درمیانی درجے کی چیزیں ہوں اور اگر استعمالی چیزیں بھی ہوں، تو ایسی گھٹیا نہ ہوں کہ استعمال ہی میں نہ لائی جاسکیں، جیسے پھٹے پرانے کپڑے، یا ٹوٹے ہوئے برتن وغیرہ؛ لہٰذا اگر استعمالی اشیاء قابلِ استعمال ہوں اور اتنی گھٹیا نہ ہوں کہ استعمال ہی میں لائی نہ جاسکتی ہوں، تو ان کو زکات میں دیا جاسکتا ہے ،اور اس سے زکات ادا ہو جاتی ہے۔

ایک حدیث میں حضرت عبد اللہ بن معاویہ –رضی اللہ عنہ– سے مروی ہے کہ رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے فرمایا کہ

(۱) البخاري : الزكاة/بابٌ لا تؤخذ كرائم أموال الناس، ح:۱۴۵۸. مسلم : الإيمان/ باب الدعاء إلى الشهادتين ، ح : ۱۹

(۲) شرح مسلم للنووي:۱/۱۹۷، العدة شرح العمدة لابن العطار: ۲/۸۰۱، الكوكب الوهاج شرح مسلم للهروي: ۲/۱۸۴، شرح أبي داود للعيني: ۶/۲۷۸

”ثَلاثٌ مَنْ فَعَلَهُنَّ فَقَدْ طَعِمَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ : مَنْ عَبَدَ اللّٰهَ وَحْدَهُ وَأَنَّهُ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللّٰهُ ، وَ أَعْطَى زَكَاةَ مَالِهِ طَيِّبَةً بِهَا نَفْسُهُ، رَافِدَةً عَلَيْهِ كُلَّ عَامٍ ، وَلاَ يُعْطِي الْهَرِمَةَ وَلَا الدَّرِنَةَ وَلَا الْمَرِيْضَةَ ، وَلاَ الشَّرَطَ اللَّئِيْمَةَ ؛ وَلٰكِنْ مِنْ وَسَطِ أَمْوَالِكُمْ ، فَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَسْئَلْكُمْ خَيْرَهُ وَلَمْ يَأْمُرْكُمْ بِشَرِّهِ“.(۱)

(یعنی جس نے تین کام کیے اس نے ایمان کا مزا چکھ لیا: جس نے ایک اللہ کی عبادت کی اور جس نے یہ اقرار کیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور جس نے خوشی خوشی ہر سال اپنے مال کی زکات دی، کوئی بوڑھا جانور، یا خارش زدہ، یا بیمار، یا ردی قسم کا نہیں دیا، بل کہ درمیانی قسم کا دیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے نہ تو تمہارے عمدہ مالوں کا مطالبہ کیا ہے اور نہ گھٹیا کا حکم دیا ہے)

اور اگر پرانی چیزیں زکات میں نکالی جائیں، تو اس صورت میں ان کی قیمت کا حساب پرانی چیز کا لگانا چاہیے، مثلاً ایک چیز نئی خریدیں، تو اس کی قیمت دوسو روپے ہے اور وہی چیز پرانی ہوجائے، تو اس کی قیمت پچاس روپے ہوجائے، تو اس کو زکات میں دیتے ہوئے پچاس کی شمار کریں گے۔

دکان پر پرانا مال پڑا ہوا ہے، اس کو زکات میں کس قیمت سے دیں؟

یہاں ایک سوال اسی سلسلے کا یہ پیش آتا ہے کہ دکان پر پرانا مال پڑا ہوا ہے، اور اس کے بکنے کی کوئی امید بھی نہیں ہوتی، تو کیا اس کو زکات میں محتاجوں کو دیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہ مال ایسا گیا گزرا ہو، جو کام ہی میں نہ آتا ہو، تب تو اس کا زکات میں دینا درست نہیں، جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے؛ لیکن اگر وہ قابل استعمال ہے، اگر چہ تجارتی لحاظ سے

(۱) أبو داود: الزكاة/ باب زكاة السائمة ، ح:۱۵۸۲

وہ بکنے کے قابل نہیں اور اس کا کوئی گاہک نہ ملتا ہو، تو اس کو زکات میں دینا جائز ہے؛ مگر اس کی قیمت وہ لگانا چاہیے، جو اس مال کی موجودہ صورت حال میں ہو سکتی ہے، مثلاً ایک مال ہے جو اگر عام حالات میں بکتا، تو اس کی قیمت سو روپئے ہوتی؛ لیکن اب کی صورت حال میں جب کہ وہ پرانا ہو چکا ہے اور اس کا کوئی گاہک نہیں ہے، اس کی قیمت بیس روپئے ہوگی، تو اس کو زکات میں شمار کرتے ہوئے بیس روپئے کا حساب لگایا جائے گا۔

زکات کی رقم بطورِ تملیک دینا چاہیے

زکات دینے کے سلسلے میں ایک مسئلہ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ زکات کی رقم غریبوں اور محتاجوں کو دینے میں یہ بھی ضروری ہے کہ اس رقم کا ان کو مالک بنا دیا جائے، اگر مالک نہیں بنایا؛ بل کہ صرف ان کی ضروریات میں خرچ کر دیا، تو زکات ادا نہیں ہوتی۔ جیسے کسی غریب کو کھانا کھلا دیا، یا اس کے ہسپتال کا بل ادا کر دیا، یا کسی یتیم یا غریب بچی کی شادی میں خرچ کر دیا، یا کسی غریب میت کے کفن دفن کا انتظام کر دیا، تو اس سے زکات ادا نہیں ہوتی؛ کیوں کہ ان صورتوں میں رقم کی تملیک نہیں ہوئی۔

اسی طرح وہ کام جس میں کسی غریب محتاج کو مالک نہیں بنایا جاتا، جیسے رفاہی کام، مسجد اور مدرسے کی تعمیر، یا کوئی ہسپتال غریبوں کے لیے چلانا، وغیرہ، تو اس سے بھی زکات ادا نہیں ہوتی؛ کیوں کہ یہاں بھی کسی غریب محتاج کو مالک نہیں بنایا جاتا۔

حضرات فقہائے کرام نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ

”وَيُشْتَرَطُ أَنْ يَكُوْنَ الصَّرْفُ تَمْلِيْكاً لاَ إِبَاحَةً ، وَلَا يُصْرَفُ إِلٰى بِنَاءِ نَحْوِ مَسْجِدٍ“. (۱)

(زکات میں یہ شرط ہے کہ یہ دینا تملیکاً ہو، نہ کہ محض اباحت کے طور پر، اور مسجد وغیرہ بنانے میں اس کو خرچ نہیں کیا جا سکتا)

(۱) الدر المختار:۲/۳۴۴، باب المصرف

اور ''بدائع الصنائع'' میں ہے کہ

" وَعَلٰی هٰذا يَخْرُجُ صَرْفُ الزكاةِ إلٰی وُجُوْهِ البِرِّ؛ مِنْ بِنَاءِ المَسَاجِد، والرِّبَاطاتِ، والسِّقَايَات ، وإصْلاحِ القَنَاطِرِ، وتَكْفِيْنِ المَوْتٰی وَدَفْنِهِمْ ؛ أنَّه لا يَجُوْزُ ؛ لأنَّه لَمْ يُوْجَدِ التَّمْلِيْكُ أصْلاً ، وكَذٰلِکَ إذا اشْتَرٰی بِالزَّكَاةِ طَعَاماً ، فَأطْعَمَ الفُقَرَاءَ غَدَاءً وعَشَاءً ، ولَمْ يَدْفَع عَيْنَ الطَّعَام إلَيْهِمْ ، لا يَجُوْزُ لِعَدَمِ التَّمْلِيْک ". (۱)

زکات کی رقم سے ہسپتال چلانا کیسا ہے؟

ایک سوال اسی سلسلے کا آیا تھا، جس کا جواب ہم نے دیا تھا، وہ سول و جواب یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: ہم چند ساتھی ڈاکٹر ہیں، ہم سب مل کر ایک ہسپتال چلاتے ہیں، اور اس میں غریبوں کا مفت علاج کرتے ہیں اور بعض بڑے علاج میں ان کی بہت رعایت کی جاتی ہے۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ ہماری جو زکات نکلتی ہے، ہم اس زکات کو ہسپتال چلانے میں لگادیں، تو زکات ادا ہوجائے گی یا نہیں؟ جب کہ اس ہسپتال سے غریبوں کو ہی نفع ملتا ہے؟

جواب: زکات کا ایک اصول یہ ہے کہ اس میں تملیک کرنا یعنی غریبوں اور محتاجوں کو اس کا مالک بنادینا ضروری ہے، اگر ان کو مالک بنائے بغیر ان ہی پر زکات خرچ کردی، تو اس سے زکات ادا نہیں ہوتی؛ لہذا ہسپتال چلانے میں خرچ کرنے سے چوں کہ غریبوں کو مالک بنانا پایا نہیں جاتا، اس لیے زکات ادا نہیں ہوتی۔

ہاں! آپ لوگ ایسا کرسکتے ہیں کہ زکات کی رقم کا فنڈ قائم کردیں اور ہسپتال میں اس

(۱) بدائع الصنائع: ۲/۴۵۶، فصلٌ في ركن الزكاة

کا ایک کاونٹر کھول دیں اور جو بھی غریب محتاج علاج کے لیے آتا ہے، اس کو اس کاونٹر پر بھیج دیں اور وہاں ایک وکالت نامہ اس سے پُر کرائیں کہ میں "فلاں" ہوں اور اپنے علاج کے لیے جو بھی اخراجات ہوتے ہیں، اس کا میں فلاں کو وکیل بناتا ہوں؛ لہذا وہ میرے لیے رقم کو وصول کر کے میرا علاج کرادیں۔ اور "فلاں" کی جگہ آپ لوگ جسے مناسب سمجھتے ہیں، اس کا نام لکھدیں، جیسے کسی مخصوص ڈاکٹر کا، یا ذمہ دار کا، اس طرح وہ غریب جب وکیل بنادے گا، تو اب اس وکیل کو اجازت ہوگی کہ وہ اس زکات کی رقم سے اس غریب کا علاج کرادے۔ اس طرح آپ کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

زکات سے مکان بنا کر غریبوں کو صرف رہنے کے لیے دیا جائے تو؟

جب یہ معلوم ہوگیا کہ زکات میں یہ ضروری ہے کہ جس کو زکات دی جائے، اسے مالکانہ طور پر دیا جائے، تو یہاں سے ایک اور سوال کا جواب بھی نکل آیا، جو مجھ سے بعض حضرات نے پہلے پوچھا تھا، وہ یہ کہ "ایک برادری کے لوگوں نے مل کر اپنی زکات کی رقم جمع کی اور ایک بڑی جگہ خرید کر اس پر ایک اپارٹ منٹ بنایا، جس میں متعدد گھر ہیں، یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان گھروں کو اپنی ہی برادری کے غریب لوگوں کو رہنے کے لیے دیا جائے، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی بعد میں غریب نہ رہے، تو اس کو وہاں سے ہٹا کر، کسی دوسرے غریب کو رہنے دیا جائے، اس طرح وہ مکانات ہمیشہ غریب طبقے کے لیے کام آتے رہیں گے"۔

اس کا حکم اوپر کی تفصیل سے سمجھ میں آ گیا کہ یہ صورت زکات کی ادائیگی کے لیے صحیح نہیں ہے اور اس سے ان لوگوں کی زکات ادا نہیں ہوسکتی؛ کیوں کہ یہاں وہی بنیادی غلطی ہورہی ہے کہ غریبوں کو اس کا مالک نہیں بنایا جارہا ہے؛ بل کہ ان کو صرف استعمال کے لیے دیا جارہا ہے؛ حالاں کہ زکات میں ضروری ہے کہ غرباء و مساکین کو زکات کی چیز (جس کو فقہاء عین سے تعبیر کرتے ہیں) کا مالک بنادیا جائے، جیسے اگر کوئی زکات کی رقم سے گھر بنا کر کسی غریب کو بطور تملیک دیدے اور اس کے تمام مالکانہ حقوق اس کو دیدے، تو یہ جائز

ہے، لیکن گھر تو نہ دیا، بل کہ گھر میں رہنے کا موقعہ فراہم کردیا، تو یہ عین کی تملیک نہ ہوئی؛ بل کہ منافع کی تملیک ہے اور اس سے زکات ادا نہیں ہوتی۔

علامہ ابن نجیم –رحمہ اللہ– نے "البحر" میں اور علامہ سراج الدین –رحمہ اللہ– نے "النھر" میں، علامہ حصکفی –رحمہ اللہ– نے "الدر المختار" میں اور علامہ طحطاوی –رحمہ اللہ– نے "حاشیة مراقی الفلاح" میں تصریح کی ہے کہ

"وَخَرَجَ (بِالمَال) تَمْلِيْكُ المَنَافِعِ ، فَلَوْ أسْكَنَ فَقِيْراً دَارَہ سَنَةً نَاوِياً لا يُجْزِئه ؛ لأنَّ المَنْفَعَةَ لَيْسَ بِعَيْنٍ مَتَقَوِّمَةٍ". (۱)

تبلیغ دین کے لیے زکات خرچ کرنا

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تبلیغ دین و اشاعت دین کے لیے زکات کا خرچ کرنا بھی درست نہیں؛ کیوں کہ اس میں بھی کسی کو مالک نہیں بنایا جاتا، بل کہ دین کا ایک کام انجام دیا جاتا ہے، زکات کے مصارف میں یہ کام داخل نہیں ہے، زکات کا مصرف غرباء و مساکین محتاج و بے کس لوگوں کی مدد ہے، لہذا ہر قسم کے دینی کام میں زکات خرچ کرنا جائز و درست نہیں ہے۔

کیا زکات کے اجتماعی نظام سے ملی مقاصد کی تکمیل نہیں کی جاسکتی؟

احکام شریعت کے مقاصد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آجکل بہت سے لوگ دین و شریعت کے مسائل و احکام میں خود ہی کوئی رائے قائم کرلیتے ہیں کہ یہ بات ایسی ہونی چاہیے، یا یہ حکم ایسا ہونا چاہیے، یا کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ وہ علماء کو دین کے مسائل میں مشورہ دیتے ہیں کہ اس مسئلے کو ایسا کردیا جائے اور یہ حکم یوں ہوجائے، مگر یہ سب باتیں دینی احکام کے مقاصد سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔

---

(۱) البحر الرائق : ۳۵۳/۲، النھر الفائق :۴۱۲/۱، الدر المختار:۱۷۲/۳، طحطاوي علی مراقي الفلاح :۱۴۷/۱

ایسا ہی ایک سوال زکات کے مصارف کے سلسلے میں بعض جدت پسند طبقات کی جانب سے یہ پیش آتا ہے کہ زکات کی رقومات کو جمع کر کے بہت سے بڑے بڑے اور اہم ترین ملی مفادات و مقاصد کی تکمیل میں ان کو کیوں نہ خرچ کیا جائے، جیسے کالج کا قیام، ہسپتال کا قیام، پڑھنے والے طلبہ و طالبات کو اعلی تعلیم جیسے میڈیکل، انجینئرنگ، وغیرہ کے لیے مواقع فراہم کرنا، ان کی فیس ادا کرنا یا ان کے لیے ڈونیشن فراہم کرنا، غرباء کا مفت علاج و معالجہ، غریب لڑکیوں کی شادی کا انتظام، یا کوئی نیشنل اخبار جاری کرنا، یا کوئی ٹی وی چینل قائم کرنا وغیرہ۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ زکات کی مد سے اگر یہ تمام کام انجام دیے جائیں، تو ملت کے بڑے بڑے اور اہم ترین مقاصد پورے ہوں گے اور ملت میں خوش حالی پیدا ہوگی اور اعلی تعلیم پا کر یہ طلبہ و طالبات ملت کے مستقبل کا سرمایہ بنیں گے اور دینی و تبلیغی مشن اخبار اور ٹی وی سے چلے گا۔

اس قسم کا سوال مجھ سے بہت سے لوگوں نے مختلف اوقات میں کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ملت کے اہم اور بڑے مقاصد کو پورا کرنے کا جذبہ اور اس سلسلے میں کوئی مضبوط اقدام قابل تعریف ہے، مگر یہ کیا ضروری ہے کہ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے زکات کی رقومات ہی استعمال کی جائیں؟

یہاں دو باتیں سمجھنے کی ضرورت ہے: ایک تو یہ کہ ایک ہوتا ہے ملی کام جس کا فائدہ بلا کسی فرق و امتیاز کے پوری ملت کو پہنچتا ہے، جیسے کالج کا قیام، ہسپتال کا قیام، ٹی وی چینل یا اخبار کا اجراء وغیرہ؛ مگر اس کام کی انجام دہی کے لیے شریعت نے عام عطیہ اور نفلی تعاون کی صورتوں کی جانب توجہ دلائی ہے۔

ایک ضعیف حدیث میں حضرت فاطمہ بنت قیس - رضی اللہ عنہا - سے مروی ہے کہ رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم - نے فرمایا کہ

« إِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ »

(یعنی: مال میں زکات کے علاوہ بھی حق ہے)

پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾(۱)

یہ حدیث اگر چہ کہ ضعیف ہے، مگر امام قرطبی کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت کا معنی ومفہوم اس حدیث کی صحت پر دلالت کر رہا ہے؛ کیوں کہ اس آیت میں نماز اور زکات کا حکم الگ سے دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ رشتہ داروں کو مسافرین کو یتیموں اور مساکین کو دینے کا ذکر کیا گیا ہے اور ان دونوں کو عطف کے ذریعے بیان کیا گیا ہے، جو ان میں مغایرت کی دلیل ہے، لہذا معلوم ہوا کہ زکات کے علاوہ بھی مال میں سے دینے کا حکم ہے۔(۲)

الغرض اس حدیث میں جو ارشاد فرمایا گیا کہ مال میں زکات کے علاوہ بھی حق ہے، یہ لفظ ''حق'' وجوب کی جانب اشارہ ہے کہ مال میں زکات کے علاوہ بھی کچھ حقوق رکھے گئے ہیں، اور یہ بہت سارے ہیں اور ان کی کوئی تفصیل وتوضیح شریعت نے بیان نہیں کی ہے؛ کیوں کہ یہ کام مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں اور زمانے کے لحاظ سے ان میں تنوع وتوسع پیدا ہو سکتا ہے،

---

(۱) الترمذي: الزكاة/باب ماجاء أن في المال حقاً سوى الزكاة، ح: ٦٦٦، الدارقطني: الزكاة/باب زكاة الحلي، ح: ١٩٥٣

(۲) تفسير القرطبي: ٦٠/٣، البقرة: ١٧٧

اور یہ ظاہر ہے کہ ان حقوق میں ''ملی مقاصد'' سے متعلق حقوق بھی ضرور داخل وشامل ہیں، لہذا ان حقوق کو زکات کے علاوہ دوسرے مدات سے پورا کرنا چاہیے۔

چناں چہ متعدد حضرات صحابہ وتابعین سے یہ مروی ہے کہ زکات کے علاوہ بھی مال میں حق ہے ۔ صحابہ میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کا یہی مسلک نقل کیا گیا ہے اور تابعین میں سے حضرت شعبی رحمہ اللہ، حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت طاوس رحمہ اللہ، حضرت عطاء رحمہ اللہ وغیرہ کا نام اس سلسلے میں ذکر کیا گیا ہے۔ (۱)

دوسرے یہ سمجھنا ہے کہ زکات مطلقاً ہر قسم کے کاموں کی انجام دہی کے لیے مشروع نہیں ہوئی ہے؛ بل کہ اس کا مقصد متعین بھی ہے اور اسی لحاظ سے اس کے مصارف بھی متعین ہیں ۔زکات کا مقصد ناداروں اور غریبوں کی مدد وتعاون ہے؛ تا کہ ان کی بنیادی ضروریات پوری ہوسکیں، اس کا مقصد ملی مسائل ومقاصد کی تکمیل نہیں ہے، اسی لیے تمام مصارف زکات میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے، کہ وہ کسی نہ کسی ضرورت وحاجت سے دوچار ہوں، اگر کوئی حاجت وضرورت لاحق نہیں ہے، تو ایسے لوگوں کو زکات دینے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر مصارف زکات کے بیان میں اس کی توضیح وتفصیل کریں گے۔

الغرض ملی مقاصد کو پوری اہمیت کے ساتھ پورا کرنا چاہیے؛ لیکن زکات کے بجائے دوسرے مدات سے ان کو پورا کرنا چاہیے۔ اور شریعت نے اس کی جانب بھی توجہ دلائی ہے اور اس کی اہمیت کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے؛ لیکن جہاں تک زکات کا تعلق ہے، اس کو اسی کے مصارف میں خرچ کرنا چاہیے اور یہ لازم ہے کہ زکات بطور تملیک محتاجوں کو دی جائے اور جہاں تملیک نہیں ہوتی، وہاں زکات کا استعمال جائز نہیں۔

(۱) فقه الزكاة :۲/۹۶۸

ریلیف فنڈ میں زکات کا مسئلہ

یہاں ایک مسئلہ اسی ضمن میں یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ بسا اوقات قدرتی حوادث، جیسے سیلاب، طوفان، زلزلہ، وغیرہ کی وجہ سے، یا فرقے وارانہ فسادات وتشدد کی وجہ سے لوگوں کی آبادکاری اور ان کی دیکھ ریکھ اور امداد وتعاون کی سخت ضرورت پیش آتی ہے، اور اس موقعے سے مختلف ادارے، جماعتیں اور انجمنیں ریلیف فنڈ جمع کرتی اور ان فسادزدہ لوگوں اور مظلومین کی امداد وتعاون کا کام انجام دیتی ہیں، اس پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فنڈ میں زکات کا دینا جائز ہے، یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ ریلیف فنڈ میں زکات دینا دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے: ایک یہ کہ فنڈ وصول کرنے والے ذمے دار لوگ قابل اعتماد ہوں اور غالب گمان اور امید ہو کہ وہ شرعی ضوابط اور اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس کو خرچ کریں گے، اور دوسری شرط یہ ہے کہ یہ لوگ زکات کو اس کے مستحقین میں بطور تملیک دے دیتے ہوں۔

اگر وہ لوگ قابل اعتماد نہ ہوں، یا ہمیں اس کا علم ہی نہ ہو کہ کون لوگ ہیں، یا مستحق اور غیر مستحق کا فرق نہ کرتے ہوں، یا بطور تملیک نہ دیتے ہوں، مثلاً زکات کی رقم سے لوگوں کو کھانا کھلا دیتے ہوں، اس کا مالک نہ بناتے ہوں، تو ایسے فنڈ میں زکات دینا جائز نہ ہوگا؛ لہذا ریلیف فنڈ وصول کرنے والوں کا حال دیکھ لینا چاہیے کہ وہ دینی اعتبار سے قابل اعتبار ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ وہ لوگ مسائل کی رعایت بھی کرتے ہیں یا نہیں؟

زکات کی رقم نکال کر خود کے پاس رکھ لینا کافی نہیں

تملیک کے مسئلے کے ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر کسی نے اپنی زکات کی رقم نکال کر خود اپنے پاس رکھ لی اور فقراء وغرباء کو نہیں دی، تو اس سے زکات ادا نہیں ہوتی، اگرچہ

کہ نیت میں یہ ہو کہ فقراء کو دینا ہے اور دینے ہی کے لیے نکال کر رکھا ہو۔ بعض لوگ زکات نکال کر اپنے پاس اس خیال سے رکھ لیتے ہیں کہ جب کوئی محتاج وفقیر سامنے آئے گا تو اس کو دے دیں گے؛ مگر اس سلسلے میں یہ بات جان لینا چاہیے کہ جب تک وہ رقم زکات فقراء و مساکین کو نہیں دے دی جاتی، اس وقت تک اس کی ادائیگی متصور نہیں ہوتی، بل کہ ایسا سمجھا جائے گا جیسے زکات نہیں دی، لہذا زکات نکال کر خود رکھ لینے کا مطلب یہ ہے کہ زکات نہیں دی۔ لہذا جلد سے جلد زکات غرباء و مساکین کو دے دینا چاہیے۔ کس کو معلوم کہ موت کب آجائے؟ اگر دینے سے پہلے موت آگئی، تو اللہ کے نزدیک گناہ گار بن کر جائیں گے۔

ہاں! اگر کسی مصلحت سے کسی خاص شخص کو فوری طور پر دینا نہیں چاہتے، مثلاً ایک شخص محتاج ہے اور اس کی لڑکی کی شادی کا مسئلہ درپیش ہے اور زکات دینے والا اس کو زکات اس لیے دینا چاہتا ہے کہ وہ اپنی بچی کی شادی میں اس سے مدد لے سکے اور ابھی زکات اس کو دینے میں اندیشہ ہے کہ وہ ابھی خرچ کر دے اور بعد میں پریشانی اٹھائے، تو اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ زکات کی رقم نکال کر اوّلاً اس کو دیدے کہ یہ رقم لے لو، مگر شادی کی ضروریات میں خرچ کرنے کے لیے یہ رقم میرے پاس ہی یا فلاں کے پاس رکھ دو، جب ضرورت ہوگی، لے لینا۔ اس طریقے سے زکات ادا بھی ہو جائے گی اور وہ شخص اس کا مالک بن جائے گا اور جو حکمت و مصلحت پیش نظر ہے، وہ بھی حاصل ہو جائے گی۔

زکات کسی کام اور چیز کے عوض میں نہیں دی جاسکتی

ایک مسئلہ اس سلسلے میں یہ جان لینا چاہیے کہ زکات کسی کام یا چیز کے عوض میں نہیں دی جاسکتی؛ بل کہ بلا کسی عوض کے محض حِسبۃً للہ محتاجوں اور مسکینوں کو دینا ضروری ہے، مثلاً کسی فقیر سے اپنا کوئی کام لے کر اس کے عوض میں اس کو زکات دیا، تو یہ جائز نہیں ہے اور اس سے زکات ادا نہ ہوگی۔ اسی طرح استاد کی تنخواہ میں زکات نہیں دے سکتے، اسی طرح

گھر میں کام کرنے والی ماما کی تنخواہ میں زکات نہیں دے سکتے؛ کیوں کہ یہ استاد کی تعلیمی خدمت کا عوض ہے اور ماما کے کام کی اجرت ہے، لہذا یہاں زکات نہیں دی جاسکتی۔

حضرات فقہاء کرام نے اس کی صراحت فرمائی ہے، اسی لیے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی معلم اپنے جانشین کو زکات دے، تو اگر وہ کام کرنے والا اسی کی وجہ سے کام کرتا ہے، تو یہ زکات دینا جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ عوض ہو جائے گی۔

''الدر المختار'' میں ہے کہ

" وَلَوْ دَفَعَهَا الْمُعَلِّمُ لِخَلِيْفَتِهِ إِنْ كَانَ بِحَيْثُ يَعْمَلُ لَهُ لَوْ لَمْ يُعْطِهِ وإِلَّا لَا " .

اور اسی کے تحت شامی نے لکھا ہے کہ

"لأَنَّ الْمَدْفُوْعَ يَكُوْنُ بِمَنْزِلَةِ الْعِوَضِ". (۱)

کارخانے اور فیکٹری کے ملازمین کو بونس میں زکات دینے کا حکم

یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ کارخانوں اور فیکٹریوں میں جو لوگ ملازمت کرتے ہیں، ان کو جو تنخواہ دی جاتی ہے، وہ تو ان کا حق الخدمت ہے، اس میں زکات نہیں دی جاسکتی؛ لیکن سوال یہ ہے کہ تنخواہ کے علاوہ ان کو جو سالانہ بونس دیا جاتا ہے، اس میں زکات کی رقم دے سکتے ہیں، یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بونس کا دینا قانونی طور پر لازم ہو یا ملازمت پر رکھتے ہوئے ان سے اس کا معاملہ کیا گیا ہو، تو اس میں زکات دینا جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ بھی ان کا حق الخدمت اور تنخواہ کا ایک حصہ شمار ہوگا اور اگر یہ بونس کا دینا، نہ قانونی طور پر لازم ہوا اور نہ آپسی معاملے میں طے ہوا ہو، تو اس صورت میں یہ محض انعام ہے اور اس میں ملازم کو زکات کی رقم سے دی جاسکتی ہے۔

---

(۱) الدر المختار مع الشامي:۳/۳۰۸، باب المصرف

مدارس میں حیلۂ تملیک اور اس کا صحیح طریقہ

ہم نے اوپر یہ بتایا ہے کہ زکات کے مال میں ضروری ہے کہ وہ فقراء وغرباء کو بطور تملیک دی جائے اور یہ بھی بتایا تھا کہ زکات کے مصارف مقرر ومتعین ہیں، ان کے علاوہ میں زکات کا خرچ کرنا درست وجائز نہیں ہے۔

اس سلسلے میں یہاں ایک بحث کا ذکر کر دینا مناسب ہے کہ بعض وقت بعض مختلف قسم کی دینی وشرعی ضرورتوں کو پورا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جو مصارفِ زکات کے علاوہ ہوتے ہیں اور جن کو عام عطیہ جات سے پورا کرنا ہوتا ہے؛ مگر ان کے لیے عام عطیہ جات فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ضیق وتنگی پیش آتی ہے، تو ایسی صورت میں اہل مدارس وغیرہ حیلۂ تملیک کر کے زکات کی رقم کو ان دینی وشرعی مقاصد کی تکمیل میں لگا دیتے ہیں۔ مثلاً کسی فقیر کو زکات کی رقم دے کر اس کو کہہ دیتے ہیں کہ تم اس کو اپنی طرف سے مدرسے میں بطور چندہ دے دو، یا مسجد کی تعمیر میں دے دو، اور وہ فقیر اس رقم کو اپنے ہاتھ میں لے کر مدرسہ یا مسجد کو دے دیتا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ یہ حیلہ کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ اور یہ کہ اس طرح حیلہ کر کے زکات کی رقومات کو مصارف زکات کے علاوہ دیگر مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلے میں ذرا تفصیل ہے، ایک تو یہ کہ تملیک واقعی طور پر پائی جائے، تو یہ حیلہ جائز ہوگا، ورنہ نہیں، دوسرے یہ کہ حیلۂ تملیک ضرورت کی مواقع کے ساتھ خاص ہے، لہذا جہاں ضرورت نہیں، وہاں اس سے کام نہیں لینا چاہیے۔

پہلی بات کی تفصیل یہ ہے کہ تملیک کے معنی ہیں کسی کو مالک بنا دینا، یہ مالک بنا دینا اگر واقعتاً پایا جائے، تو تملیک متحقق ہوگی اور اگر تملیک کی حقیقت نہ پائی گئی، بل کہ محض ایک رسم کے طور پر کسی کو زکات دی اور اس کو کہہ دیا کہ یہ رقم لے کر فلاں مدرسے یا مسجد میں دے دو، تو تملیک کا تحقق نہ ہوگا۔

چناں چہ بعض جگہوں پر حیلۂ تملیک میں ایسا کیا جاتا ہے کہ کسی فقیر و مستحق کو کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم تم کو ایک رقم دیں گے، تم اس کو لے کر مدرسے میں یا مسجد میں دے دینا، وہ شخص اس کو اپنے ہاتھ میں لے کر مدرسے یا مسجد میں دے دیتا ہے۔

اس طریقے سے زکات کی تملیک نہیں ہوتی؛ کیوں کہ یہ زکات دینے والا بھی فقیر کو یہ سمجھ کر نہیں دیتا کہ میں اس کو واقعتاً مالک بنا رہا ہوں؛ بل کہ محض ایک کھیل کی طرح اس کو دیتا ہے اور وہ لینے والا فقیر بھی یہ نہیں سمجھتا کہ مجھے یہ رقم بطور مالک دے دی گئی ہے اور میں اس میں تصرف کا حق دار ہوں۔ لہذا محض اس لینے اور دینے سے تملیک کا تحقق نہیں ہوتا۔

اسی لیے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی - رحمہ اللہ - نے ایک سوال کے جواب میں یہی بات بیان کی ہے کہ اس سے تملیک ہی نہیں ہوتی۔ چناں چہ آپ سے ایک سوال کیا گیا کہ:

> ”تملیک کرانے کا حیلہ جو اکثر مدارس اسلامیہ وغیرہ میں کیا جاتا ہے، اس میں نیت یقیناً اچھی نہیں ہوتی، گو از روئے فقہ صورۃً جائز ہی کیوں نہ ہو۔ کیا اللہ تعالیٰ جو نیت اور دلوں کے ارادہ کو دیکھتا ہے، ایسا کرنے سے راضی ہوگا اور حیلہ کرنے والا مؤاخذہ آخرت سے بری سمجھا جائے گا؟“

اس کا جواب حضرت تھانوی - رحمہ اللہ - نے یہ دیا ہے کہ

> ”قطع نظر ورع سے میرے نزدیک قاعدۂ فقہیہ کی رو سے بھی یہ زکات ادا نہیں ہوتی؛ کیوں کہ تملیک رکن زکات ہے اور تملیک میں جب عاقدین ہازل ہوں، تملیک نہیں ہوتی اور صورت متعارفہ میں دونوں بہ شہادت قرائن قویہ معترف ہیں کہ تملیک مقصود نہیں۔“(۱)

(۱) امداد الفتاوی: ۳/ ۴۴

اس میں متعارف طریقے سے مراد وہی ہے، جو ہم نے ذکر کیا کہ لینے والا اور دینے والا کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ اس میں واقعتاً وحقیقتاً مالک بنایا جا رہا ہے، اس لیے حضرت نے اس کو ہزل سے تعبیر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس سے تملیک واقع ہی نہیں ہوتی۔

اسی طرح حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی۔ رحمہ اللہ ۔ کے ''فتاوی محمودیہ'' میں ایک سوال ہے کہ:

''کسی صاحبِ مال کو کسی اسلامی ادارے میں کثیر رقم خرچ کرنی ہے، صاحب مال یہ حیلہ کرتا ہے کہ کسی مستحق زکات کو وہ رقم اس شرط پر دیتا ہے کہ وہ مستحق زکات وہ رقم اسلامی ادارہ میں واپس کرے۔ تو یہ حیلہ کیسا ہے؟ زکات ادا ہوگی یا نہیں؟ اور وہ مستحق زکات جس نے مال اسلامی ادارہ میں واپس کیا ہے، اس کو کار خیر میں خرچ کرنے کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

اس کا جواب حضرت مفتی صاحب۔ رحمہ اللہ ۔ نے یہ دیا ہے کہ

''یہ شرط قطعاً ناجائز ہے، صاحب مال کو کسی طرح جائز نہیں کہ مستحق زکات کو اس اسلامی ادارے میں اس رقم کے دینے پر مجبور کرے۔ اگر باوجود شرط کے مستحق زکات وہ رقم اسلامی ادارے میں واپس نہ دے، اب بھی صاحب مال کو واپس لینے کا حق نہیں رہا۔ جب مستحق زکات کو رقم کا مالک بنا دیا اور اس کے حوالے کر دی، تو زکات ادا ہوگئی، اب اس کو اختیار ہے کہ وہ رقم جہاں چاہے، صرف کرے۔ ایسی صورت میں شرط یا جبر کا تو حق نہیں ہے، صرف تلقین کر سکتا ہے کہ اس ادارے میں ضرورت زیادہ ہے اور اس میں دینے میں ثواب زیادہ ہے''۔ (۱)

(۱) فتاوی محمودیہ: ۹/۵۰۱-۵۰۲

اب رہا یہ سوال کہ تملیک کی صحیح صورت کیا ہے؟ اس کی متعدد صورتیں ہیں اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ دینے والا بھی یہ سمجھ کر دے کہ میں فقیر محتاج کو یہ رقم دے رہا ہوں، اس لیے وہ اس رقمِ زکات کا مالک ہوگیا اور لینے والا بھی یہ سمجھے کہ میں اس کا مالک ہوں اور مجھے اس میں تصرف کا اختیار ہے۔

☐ تملیک کی ایک صورت وہ ہے، جس کو متعدد فقہائے کرام نے ذکر کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

”والحيلةُ لِمَنْ أرَادَ ذلکَ أنْ يَتَصَدَّق يَنْوِي الزكاةَ على فَقِيرٍ، ثُمَّ يأمُرُهُ بعدَ ذلکَ بالصَّرْفِ إلَى هٰذِه الوُجُوْه، فَيَكُوْنُ لِصَاحب المَالِ ثَوَابُ الصَّدَقةِ، وَ لِذٰلکَ الفَقِيْرِ ثَوَابُ هٰذا الصَّرْفِ“. (١)

حاصل اس کا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مصارف زکات کے علاوہ کسی کار خیر میں زکات لگانا چاہے، تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ زکات کی رقم پہلے کسی فقیر محتاج کو دی جائے، پھر اس سے کہا جائے کہ اس کو فلاں کار خیر میں خرچ کرو، تو اس سے اس زکات دینے والے کو بھی اور اس فقیر کو بھی ثواب مل جائے گا۔

یہاں چوں کہ زکات کی رقم اولاً فقیر کو دے دی گئی اور اسے اس کا مالک بنا دیا گیا، اس لیے بعد میں اس کو کسی نیک کام میں خرچ کرنے کی ترغیب دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ لہٰذا یہاں فی الواقع تملیک پائی گئی۔ اسی لیے اگر وہ فقیر محتاج شخص بعد میں واپس نہ کرے اور مدرسے میں دینے سے انکار کر دے، تو اسے اس کا حق ہوگا اور اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ (٢)

(١) التاتارخانية: ٣/٢٠٨، الدر المختار: ١/١٣٧، المحيط البرهاني: ٢/٢٨٢، البحر الرائق: ٢/٢٦١.

(٢) الدر المختار مع الشامي: ٣/٣٤٥

□ تملیک کی ایک صحیح صورت یہ ہے، جس کو فتاوی محمودیہ میں حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی - رحمہ اللہ - نے بیان کیا ہے کہ:

''کسی مستحق زکات سے کہا جائے کہ ہمارے مدرسے میں تعمیر یا تنخواہ یا خریداری مال و کتب وغیرہ کی ضرورت ہے، پیسہ موجود نہیں ہے، تو مدرسے کی امداد کردو۔ وہ کہے گا کہ میں خود غریب مستحق زکات ہوں، میرے پاس پیسہ نہیں ہے، میں کہاں سے دوں گا؟ اس سے کہا جائے کہ تم کسی سے مثلاً زید سے قرض لے کر دے دو، اللہ تعالیٰ قرض ادا کر دے گا، اس کی ذات سے امید ہے۔ وہ شخص زید سے قرض لے کر مدرسے میں دے دے، اس سے تنخواہ و تعمیر وغیرہ کی ضرورت پوری کر لی جائے، پھر اس کو مذکورہ رقم (زکات کی) دی جائے، جس سے وہ قرض ادا کر دے''۔(1)

□ تملیک کی ایک تیسری صورت جو ہمارے نزدیک سب سے بہتر و بے غبار ہے، یہ ہے کہ مستحق زکات طلبہ کو بطور وظیفہ دی جائے اور ان کو کہہ دیا جائے کہ یہ تمہارا وظیفہ ہے، اس کو آپ لوگ لے لیں؛ لیکن اگر آپ مدرسے میں قیام وطعام چاہتے ہیں اور یہاں کی تعلیم و تربیت سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں، تو آپ اپنی فیس مدرسے کو ادا کریں، جیسے اگر آپ کسی ہوٹل میں کھانا چاہتے ہیں، یا رہنا چاہتے ہیں، تو اس کی قیمت و اجرت ادا کرتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی ادا کریں اور استفادہ کریں۔

اس کے بعد جو رقم طلبہ مدرسے کو بطور فیس دیتے ہیں، وہ رقم زکات کی نہیں رہے گی، بل کہ عام عطیے میں تبدیل ہو جائے گی، اور اس کو کسی بھی کار خیر میں استعمال کیا جا سکتا ہے، جیسے تعمیر مدرسے میں، یا اساتذہ کے مشاہروں میں، یا مدرسے کے لیے کسی چیز کے خریدنے میں؛ کیوں کہ اب یہ رقم زکات کی نہیں رہی۔

---

(1) فتاوی محمودیہ: ۹/۵۰۲-۵۰۳

ہمارے جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور میں برسہا برس سے اسی طریقے پر عمل ہے اور ہم لوگ طلبہ کو پہلے پوری بات سمجھا دیتے ہیں اور پھر ان سے فیس وصول کرتے ہیں۔

الغرض اگر صحیح طریقے پر تملیک ہو جائے، تو تملیک کے تحقق میں کوئی اشکال نہیں اور پھر اس تملیک شدہ رقم کو دیگر مصارف خیر، جیسے تعمیر مدرسہ یا مسجد، یا مدرسین کے مشاہروں، یا مسجد و مدرسے کے لیے کسی چیز کی خریداری میں لگانے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے؛ لہذا جہاں تملیک کی حقیقت پائی جائے، وہاں اس کو جائز و درست کہا جائے گا اور اسی لیے جہاں یہ حقیقت پائی گئی۔ تو علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی – رحمہ اللہ – لکھتے ہیں کہ:

> ''زکات کا روپیہ بغیر حیلہ شرعی مسجد میں لگادیں گے، تو مسجد میں کسی قسم کا نقصان نہیں آتا، مگر زکات ادا نہ ہوگی اور حیلہ شرعی سے لگادیں، تو زکات ادا ہو جاتی ہے اور حیلہ یہ ہے کہ کسی محتاج فقیر کو وہ زکات دی جائے اور اس کو مالک بنادیا جائے اور وہ اپنی خواہش سے اور اپنی طرف سے مسجد میں لگادے، تو یہ درست ہے''۔ (۱)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب – رحمہ اللہ – سے حیلۂ تملیک کے بارے میں ایک سوال ہوا کہ:

> سوال: اکثر مدارس میں چندہ دوامی بہت کم ہے اور مد زکات و صدقہ واجبہ مثل کفارہ و چرم قربانی وغیرہ وغیرہ جمع ہوتا ہے۔ چوں کہ چندہ دوامی سے مدرسین کی تنخواہ پوری نہیں ہوتی اور زکات کا روپیہ جمع رہتا ہے، اس لیے اراکین مدرسہ نائب مہتمم سے اس طرح حیلہ کراتے ہیں کہ کسی غریب شخص کو وہ روپیہ دے کر مالک بنادیتے ہیں اور اس سے یہ کہہ دیتے

---

(۱) فتاوی رشیدیہ: ۴۳۹

ہیں کہ تم اپنی طرف سے مدرسے میں دے دو۔ اس طرح حیلہ کر کے زکات کا روپیہ مدرسین کی تنخواہ میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب- رحمۃ اللہ - نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے:

''یہ حیلہ درست ہے اور بعد اس حیلے کے تنخواہ مدرسین میں خرچ کرنا اس روپے کا جائز ہے''۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حقیقتِ تملیک پائی جانے کے بعد زکات کی رقم کو کسی بھی کار خیر میں صرف کیا جا سکتا ہے۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حیلہ کر کے ایک ناجائز امر کو جائز کر لینا شرعاً درست ہے اور کیا اس پر وعید نہیں ہے؟ یہ سوال بعض اوقات اہل مدارس پر بہت سخت و شدید انداز سے بعض لوگوں کی جانب سے کیا جاتا ہے؛ اس لیے یہاں اس پر بھی کچھ روشنی ڈال لینا مناسب ہے۔

بات یہ ہے کہ یہ سوال دراصل اس سلسلے کا پورا علم نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اگر پوری بات سمجھ لی جائے، تو سوال ختم ہو جاتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ حیلہ دو قسم کا ہوتا ہے:

(۱) ایک وہ حیلہ جس کا مقصد کسی کا حق مار لینا یا اس میں کوئی شبہ پیدا کر دینا یا کسی باطل کی ملمع سازی کرنا ہوتا ہے، یہ حرام و ناجائز ہے۔

(۲) دوسرا وہ حیلہ ہے جس کا مقصد حکم خداوندی کو پورا کرنے کے لیے کوئی شرعی طریقہ ڈھونڈنا ہوتا ہے؛ تاکہ حرام سے نجات پائے، یا حلال تک رسائی حاصل کرے، یہ حیلہ حرام و ناجائز نہیں ہے؛ بل کہ جائز اور ضرورت پر اس کا اختیار کرنا اچھا بھی ہے۔

فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ

---

(۱) فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۸۲/۶

"إنَّ كُلَّ حِيلَةٍ يَحتَالُ بها الرَّجُلُ لإبطالِ حَقِّ الغيرِ ، أوْ إدخالِ شُبْهَةٍ فيه ، أوْ لِتمويهِ باطلٍ فهيَ مكروهةٌ . وكُلُّ حِيلَةٍ يحتالُ بها الرَّجُلُ لِيَتخَلَّصَ بها عن حَرَامٍ ، أو لِيَتوَصَّلَ بها إلى حَلالٍ فهيَ حَسَنَةٌ ." (1)

اس سے واضح ہوا کہ حیلے دو قسم کے ہوتے ہیں، ان میں سے جس کا مقصد حرام سے بچنا یا حلال تک پہنچنا ہو، وہ تو خود شریعت کا مطلوب ہے، اس لیے ایسا حیلہ جائز ہے۔

اور حضرات فقہاء نے اس کا جواز قرآن وحدیث سے پیش کیا ہے۔ قرآن کریم میں حضرت ایوب – عَلَیْہِ السَّلَامُ – کا واقعہ اجمالاً آیا ہے، کہ انھوں نے اپنی بیماری کے زمانے میں کسی وجہ سے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو سو کوڑے لگائیں گے، جب وہ شفایاب ہوگئے، تو اللہ تعالیٰ ان کو اس قسم کے پورا کرنے کا حیلہ بتایا کہ:

" وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثاً فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنَثْ "[سورۂ ص: ۴۴]

(اور تم اپنے ہاتھ میں سینکوں کا ایک مٹھا لو (جس میں سو سینکیں ہوں) اور اپنی بیوی کو اس سے مارو اور قسم نہ توڑو)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اسی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

"اس سے معلوم ہوا کہ کسی نامناسب یا مکروہ بات سے بچنے کے لیے کوئی شرعی حیلہ اختیار کیا جائے، تو وہ جائز ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت ایوب – عَلَیْہِ السَّلَامُ – کے واقعے میں قسم کا اصلی تقاضا تو ہے کہ آپ اپنی زوجۂ مطہرہ کو پوری سو قمچیاں ماریں؛ لیکن چوں کہ ان کی زوجۂ مطہرہ بے گناہ تھیں اور انھوں نے حضرت ایوب – عَلَیْہِ السَّلَامُ – کی بے مثال خدمت کی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود حضرت ایوب – عَلَیْہِ السَّلَامُ – کو ایک حیلے کی

(1) الفتاوى الهندية:۳۹۰/۶، فتاوى التاتارخانية: ۳۱۱/۱۰

تلقین فرمائی اور یہ تصریح کردی کہ اس طرح کرنے سے ان کی قسم نہیں ٹوٹے گی، اس لیے یہ واقعہ حیلہ کے جواز پر دلالت کرتا ہے؛ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے حیلے اسی وقت جائز ہوتے ہیں، جب کہ انھیں شرعی مقاصد کے ابطال کا ذریعہ نہ بنایا جائے اور اگر حیلہ کا مقصد یہ ہو کہ کسی حق دار کا حق باطل کیا جائے یا کسی صریح فعل حرام کو اس کی روح برقرار رکھتے ہوئے اپنے لیے حلال کرلیا جائے، تو ایسا حیلہ بالکل ناجائز ہے''۔ (۱)

اور حدیث سے بھی حیلہ کا جواز ثابت ہے۔ چناں چہ حدیث میں ہے کہ ایک صاحب کو رسول اللہ -ﷺ- نے خیبر کا عامل مقرر کیا اور انھوں نے آپ -ﷺ- کی خدمت میں جنیب کھجور (جو کھجور کی اعلیٰ قسم ہے) لائے۔ آپ -ﷺ- نے پوچھا کہ کیا خیبر کے تمام کھجور ایسے ہی عمدہ ہوتے ہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ نہیں، یا رسول اللہ! ہم عام کھجور کے دو صاع کے بدلے میں ایک صاع یہ عمدہ کھجور لے لیتے ہیں۔ آپ -ﷺ- نے ان سے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، بل کہ اپنے معمولی کھجور کو درہم میں بیچ دو اور ان درہموں سے عمدہ کھجور خرید لو۔ (۲)

حاصل اس کا یہ ہے کہ کھجور کو کھجور کے بدلے خریدنا ہو، تو کمی بیشی جائز نہیں، خواہ ایک جانب کے کھجور ردی اور دوسری جانب کے عمدہ ہوں، لہٰذا آپ نے اس حرام سے بچنے کا ایک شرعی حیلہ بتایا کہ اپنے معمولی کھجوروں کو درہم کے بدلے بیچ دو اور جو درہم ملیں، ان سے عمدہ کھجور خرید لو۔ یہ ایک شرعی حیلہ ہے، جس کا اس حدیث سے ثبوت ہوتا ہے۔

دوسری حدیث اس سلسلے میں یہ ہے کہ رسول اللہ -ﷺ- نے فرمایا کہ:

---

(۱) معارف القرآن: ۵۲۲/۷-۵۲۳

(۲) البخاري: البیوع: باب إذا أراد بیع تمر بتمر خیر منه :۲۲۰۱، مسلم : البیوع: باب بیع الطعام مثلا بمثل، ۱۵۹۳، الموطا لمالک: البیوع، باب ما یکره من بیع التمر:۲۳۱۱۔

" لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيّ إِلَّا لِخَمْسَةٍ : لِغَازٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ ، أو لِعَامِلٍ عَلَيْهَا ، أو لَغَارِمٍ ، أو لِرَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِه ، أو لِرَجُلٍ كَانَ لَه جار مِسْكِيْنٌ ، فَتُصُدِّقَ عَلَى المِسْكِيْن ، فَأَهْدَاهَا المِسْكِيْنُ لِلْغَنِيّ . (۱)

(پانچ مال داروں کے سوا کسی مال دار کے لیے صدقہ جائز نہیں ہے: ایک اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا، دوسرا زکات وصول کرنے والا، تیسرا قرض دار، چوتھا وہ شخص جو صدقے کو اپنے مال سے خرید لے، پانچواں وہ شخص جس کا پڑوسی مسکین ہو اور اس مسکین کو صدقہ دیا جائے اور وہ مسکین اس مال دار کو ہدیہ کر دے۔)

اس کے اخیر جملے میں جو آیا ہے کہ کوئی مال دار ہو اور اس کا پڑوسی مسکین ہو اور اس مسکین کو زکات دی جائے اور وہ مسکین اپنے مال دار پڑوسی کو وہ زکات کی رقم ہدیہ دے دے، تو اس طرح مال دار کے حق میں یہ زکات کی رقم حلال ہو جائے گی، یہ ایک حیلہ ہے جس کا مقصد کسی حرام کو حلال کرنا نہیں؛ بل کہ حرام سے بچنا اور حلال کا حاصل کرنا ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب –رحمہ اللہ– نے حیلۂ باطلہ کی ایک مثال بھی دی ہے کہ مثلاً زکات سے بچنے کے لیے بعض لوگ یہ حیلہ کرتے ہیں کہ سال ختم ہونے سے ذرا پہلے اپنا مال بیوی کی ملکیت میں دے دیا، پھر کچھ عرصے کے بعد بیوی نے شوہر کی ملکیت میں دے دیا اور جب اگلا سال ختم ہونے کے قریب ہوا، تو پھر شوہر نے بیوی کو ہبہ کر دیا، اس طرح کسی پر زکات واجب نہیں ہوتی، ایسا کرنا چوں کہ مقاصد شرعیہ کو باطل کرنے کی ایک کوشش ہے، اس لیے حرام ہے اور شاید اس کا وبال ترکِ زکات کے وبال سے زیادہ بڑا ہو۔

(۱) أبو داود: الزكاة ، باب من يجوز له أخذ الصدقة وهو غني : ۱۶۳۵، الموطا لمالک: الزكاة ، باب أخذ الصدقة : ۹۱۹، المستدرک للحاكم: الزكاة، ۱۴۸۰۔

دوسری بات یہ ہے کہ حیلۂ تملیک کو صرف ضرورت کے مواقع پر استعمال میں لانا چاہیے اور بلا ضرورت اس کا استعمال نہیں کرنا چاہیے؛ کیوں کہ یہ بہ ہر حال ایک حیلہ ہے، جو صرف شرعی ضرورت میں جائز العمل ہے، بلا ضرورت اس کا استعمال جائز نہ ہوگا۔

جیسے کسی مسلمانوں کے محلے میں مسجد ہی نہیں ہے، اور عام عطیہ جات اس قدر وصول نہیں ہوتے ہیں کہ اس ضرورت کو پورا کیا جا سکے، تو اس شرعی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اگر زکات کی رقم تملیک کرا کر اس میں لگا دیں، تو جائز ہوگا۔

اسی طرح کسی مدرسے میں مدرسین کے مشاہرے دینے کی کوئی سبیل نہ ہو، تو مجبوری کی وجہ سے زکات کو تملیک کرا کر اس مد میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے، تو یہ عمل جائز نہ ہوگا، مثال کے طور پر کسی مدرسے میں کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، تمام امور بحسن وخوبی جاری ہیں، ایسی صورت میں محض کسی عمارت کی مزید تعمیر کے لیے، یا کتب خانے کی کتابوں کی خریدی کے لیے زکات وصول کر کے اس کی تملیک کرانا جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہاں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جس کے بغیر کوئی کام رکا ہوا ہو۔

اسی طرح بعض چھوٹے بچوں کے مکتب میں جہاں زکات کا کوئی مصرف ہی سرے سے نہیں ہے، زکات کی مد سے وصول کر کے اس کی تملیک کرنا اور اس رقم کو دیگر مصارف میں خرچ کرنا جائز نہ ہوگا؛ وجہ یہ کہ یہاں اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کو دوسرے مدات سے وصول کر کے چلایا جا سکتا ہے۔

اسی طرح بعض رفاہی ادارے والے اپنا نام پیدا کرنے کے لیے رفاہی خدمات وملی ضروریات میں خرچ کرنا چاہتے ہیں؛ مگر اس کے لیے زکات وصول کرتے اور اس کی تملیک کرا کر رفاہی وملی خدمات میں لگاتے ہیں، حالاں کہ اگر وہ لوگ یہ کام نہ کریں، تو کوئی مسئلہ رکا ہوا نہیں ہوتا؛ مگر محض اپنے نام کی وجہ سے ایسا کیا جاتا ہے؛ لہذا یہ بھی ناجائز ہوگا۔

زکات کی ادائیگی کس طرح کی جا سکتی ہے؟

زکات فقراء و مساکین اور محتاجوں کو ایک تو عام طریقوں سے دی جاتی ہے، جیسے روپئے پیسے (سکوں کی شکل میں)، یا اشیاء اور چیزیں خود اپنے ہاتھ سے دئے جاتے ہیں، یا کسی اور شخص کے ذریعے دیے جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ آج کل متعدد طریقے نئے نئے ایسے آگئے ہیں، جن سے کسی کو کوئی رقم دی جا سکتی ہے، جیسے، کرنسی نوٹ سے زکات دینا، بینک ٹرانسفر کے ذریعے، یا چیک سے، یا ڈرافٹ سے زکات ادا کرنا، تو یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان نئے طریقوں سے کسی کو رقم دی جائے، تو وہ ادائیگی زکات کے لیے کافی ہے، یا نہیں؟ اس سلسلے میں یہاں ہم الگ الگ امور پر بحث کریں گے؛ تا کہ تفصیلی طور پر ان کے احکام معلوم ہو جائیں۔

(ا) کرنسی نوٹ سے زکات کی ادائیگی

زکات کی ادائیگی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کرنسی نوٹ سے زکات دی جائے اور آج عموماً یہی طریقہ اپنایا جاتا ہے۔

ماضی قریب میں اہل فتوی علماء کے مابین یہ بحث رہی کہ نوٹ سے زکات دینے پر زکات ادا ہوگی یا نہیں؟ علماء کی اکثریت نے نوٹ سے زکات کی ادائیگی کے سلسلے میں یہ کہا کہ اس سے اس وقت زکات ادا ہوگی، جب فقیر اس کو نقد کر لے یا اس سے کوئی چیز خرید لے، ورنہ زکات ادا نہ ہوگی؛ کیوں کہ نوٹ کی حیثیت محض مال کی سند کی تھی، جیسے چک ہوتا ہے اور جیسے چک دینے سے زکات اس وقت ادا سمجھی جائے گی، جب محتاج شخص نے اس کو کیش کرالیا ہو اور جب تک کیش نہ کرالے، اس وقت تک زکات ادا نہ ہوگی، اسی طرح زکات میں کرنسی نوٹ دینے سے بھی زکات اس وقت ادا ہوگی، جب فقیر و مسکین نے اس کو کیش کرالیا ہو۔

حضرت حکیم الامت تھانوی – رحمہ اللہ – نے لکھا ہے کہ

’’مسکین کو نوٹ دیا اور اس مسکین نے اس کو نقد یا کسی جنس کے بدلے فروخت کر کے اس نقد یا جنس پر قبضہ کر لیا، اب قبضہ کے وقت زکات ادا ہوگئی۔ اور اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوئیں، مثلاً اس مسکین کے پاس سے وہ نوٹ ضائع ہوگیا، یا اس نے اپنے قرض میں سے کسی کو دے دیا، ان صورتوں میں زکات ادا نہیں ہوئی‘‘۔(۱)

مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

’’نوٹوں کے ذریعے زکات ادا ہوسکتی ہے، مگر اس وقت ادائیگی کا حکم دیا جائے گا، جس وقت کہ ان نوٹوں کے بدلے کوئی مال حاصل کر لیا جائے‘‘۔(۲)

اسی طرح حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے پہلے اسی کی بنیاد پر یہ لکھا تھا کہ:

’’نوٹ خود چاندی یا سونے کا سکہ نہیں ہے؛ بل کہ یہ اس کی رسید ہے جو گورنمنٹ یا بینک کے ذمے بطور قرض موجود اور اس کی وصول یابی پر اس نوٹ کے ذریعے قدرت حاصل ہے۔ لہٰذا درحقیقت اس مال پر زکات واجب ہے، بہتر یہ ہے کہ اس کی یا اس کی قیمت کی کوئی شیء غلہ، کپڑا، وغیرہ زکات میں ادا کریں، اگر زکات میں نوٹ دیا اور مصرف زکات فقیر نے اس کے عوض سکہ غلہ وغیرہ کوئی مال حاصل کر لیا، تب بھی زکات ادا ہوگئی؛ لیکن اگر وہ نوٹ فقیر سے ضائع ہوگیا، مثلاً جل گیا، گم ہوگیا، یا اس نے کسی کرایہ، اجرت وغیرہ میں دے دیا، یا اس کے ذریعے سے اپنا قرض ادا کر دیا، تو زکات ادا نہیں ہوگی‘‘۔(۳)

---

(۱) امداد الفتاوی:۲/۳۰

(۲) کفایۃ المفتی:۴/۲۹۷

(۳) فتاوی محمودیہ:۹/۳۸۶

مگر یہ اس دور کی بات ہے، جب کہ نوٹ محض ایک دستاویز اور چک کی حیثیت رکھتی تھی؛ لیکن جب زمانے کے تغیرات نے نوٹ کی یہ حیثیت بھی بدل دی اور اب اس کی حیثیت خود مال کی ہوگئی، تو بعد کے علماء نے نوٹ سے زکات دینے کو بھی درست قرار دیا اور نوٹ فقیر محتاج کے حوالے کرتے ہی زکات کی ادائیگی ہوجانے کا فتوی دیا۔

چناں چہ خود حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ نے بعد میں یہ لکھا ہے کہ نوٹ سے زکات ادا ہوجاتی ہے۔ ایک فتوی میں آپ لکھتے ہیں کہ:

> ''نوٹ اپنی اصل کے اعتبار سے حوالہ اور سند ہے (مال نہیں)؛ لیکن اس دور میں تقریباً روپیہ معدوم ہے، سب کاروبار نوٹ سے ہی ہوتا ہے اور سب جگہ نوٹ ہی بلاتردد روپیہ کے قائم مقام؛ بل کہ روپیہ سے زیادہ قابل قدر شمار ہوتا ہے، اس لیے اب نوٹ کے ذریعے سے بھی زکات ادا ہوجاتی ہے''۔(۱)

اسی طرح حضرت شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی نے اپنے ''فقہی مقالات'' میں اولاً یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ دور میں کرنسی نوٹ کی حیثیت محض ایک سند کی نہیں، بل کہ فلوس نافقہ (رائج الوقت سکوں) کی ہے، پھر لکھتے ہیں کہ:

> ''جس طرح مروجہ سکے کسی غریب کو بطور زکات دیے جائیں، تو جس وقت وہ فقیر ان سکوں کو اپنے قبضے میں لے گا، اسی وقت اس کی زکات ادا ہوجائے گی، بعینہ یہی حکم کرنسی نوٹوں کا ہے کہ فقیر کے ان پر قبضہ کرنے سے زکات فی الفور ادا ہوجائے گی، ان نوٹوں کو استعمال میں لانے پر زکات کی ادائیگی موقوف نہ رہے گی''۔(۲)

---

(۱) فتاوی محمودیہ: ۳۹۱/۹

(۲) فقہی مقالات: ۳۰/۱

الغرض اب کرنسی نوٹوں کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے رائج الوقت سکے، جن کو مال تصور کیا جاتا ہے اور اس کے زکات میں ادا کرتے ہی اور فقیر کے قبضے میں آتے ہیں زکات ادا ہو جاتی ہے، اسی طرح نوٹ سے زکات کی ادائیگی بھی درست وصحیح ہے اور ان کے فقیر کے قبضے میں آتے ہی زکات ادا ہو جاتی ہے، خواہ اس نے اس کو نقد کرالیا ہو یا نہ کرایا ہو یا اس کو اپنے تصرف میں لایا ہو یا نہ لایا ہو۔

❖ منی آرڈر کے ذریعے زکات کی ادائیگی

ایک نسبتاً قدیم طریقہ رقم کی ادائیگی کا یہ ہے کہ منی آرڈر کے ذریعے رقم ادا کی جائے۔ زکات کی ادائیگی کے لیے بھی اس طریقے کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جمہور علماء کی یہی رائے اور اسی پر فتوی ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی - رحمہ اللہ - نے اپنے فتاوی میں اس کو جائز قرار دیا ہے۔ بعض حضرات علماء کو منی آرڈر سے زکات کی ادائیگی میں فقہی لحاظ سے کچھ خلجان و اشکال تھا، حضرت تھانویؒ نے اس خلجان و اشکال کا جواب دیا اور شرعی لحاظ سے منی آرڈر سے زکات کی ادائیگی کو درست قرار دیا ہے۔ (۱)

اسی طرح حضرت مولانا عبد الکریم صاحب - رحمہ اللہ - اور مولانا ظفر احمد عثمانی - رحمہ اللہ - وغیرہ علماء کی بھی رائے ہے کہ منی آرڈر کے ذریعے زکات کا ادا کرنا درست ہے۔ (۲)

مگر یہاں ایک بات کا خیال رکھنا چاہیے، وہ یہ کہ منی آرڈر کے لیے جو سروس چارج لگتا ہے، وہ زکات دینے والے کو ادا کرنا ہوگا۔

---

(۱) امداد الفتاوی: ۲/۵۴-۵۶

(۲) امداد الاحکام: ۳/۱۲

❖ بینک ٹرانسفر کے ذریعے زکات کی ادائیگی

رقم ادا کرنے کا ایک طریقہ ''بینک ٹرانسفر'' ہے، کہ ایک شخص بینک کے ذریعے اپنے اکاؤنٹ سے دوسرے شخص کے اکاؤنٹ کو رقم منتقل کر سکتا ہے، لہذا اس کے ذریعے بھی زکات دی جاسکتی ہے اور اس سے تملیک بھی واقع ہوجاتی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ بینک کے ذریعے جب رقم کو دوسرے کے اکاؤنٹ میں منتقل کیا جاتا ہے، تو وہ رقم دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے اور وہ اس کی تحویل وملکیت میں بھی داخل ہوجاتی ہے، اور اس کو اس پر تصرف کا مکمل اختیار بھی ہوتا ہے، لہذا زکات کی رقم اگر بینک ٹرانسفر کے ذریعے بھیجی گئی، تو زکات بلا تامل ادا ہوجاتی ہے۔

اس سلسلے میں تفصیلی بحث دلائل کے ساتھ دیکھنا ہو، تو احقر کی کتاب ''الکٹرانک کاروبار کے شرعی ضوابط واحکام'' دیکھیں۔

لیکن ایک بات ضرور یاد رکھیں کہ ٹرانسفر کرنے کے لیے جو کمیشن بینک لیتا ہے، وہ زکات میں سے نہیں ہوسکتا، بل کہ وہ اپنی رقم سے شمار کرنا چاہیے۔

❖ ڈرافٹ کے ذریعہ زکات کی ادائیگی

ایک طریقہ یہ ہے کہ بینک ڈرافٹ(Bank Draft): چیک کی ایک قسم ''بینک ڈرافٹ'' ہے، جس کو عربی میں ''الشیک المصرفي'' کہتے ہیں، بینک ڈرافٹ میں چوں کہ ڈرافٹ لینے والا بینک کو اولاً اس قدر رقم نقد، یا اپنے اکاؤنٹ سے ادا کر دیتا ہے اور پھر بینک اس کو اس رقم کا ڈرافٹ جاری کرتا ہے، اس لیے جس کے نام کا ڈرافٹ ہوتا ہے، اس کو اس قدر رقم کا ادا کرنا فوری طور پر بینک کے ذمے لازم ہوتا ہے اور بینک کسی بھی حال میں اس کو رد نہیں کر سکتا؛ کیوں کہ اتنی رقم کو بینک محفوظ کر دیتا ہے؛ لہذا ڈرافٹ کا حکم یہ ہے کہ اس پر قبضہ کر لینا رقم پر قبضے کے حکم میں ہے، لہذا زکات کی ادائیگی ڈرافٹ سے کی جائے، تو وہ صحیح ومعتبر ہے اور اس سے زکات ادا ہوجاتی ہے۔

❖ چیک کے ذریعے زکات کی ادائیگی

ایک طریقہ رقم کی ادائیگی کا یہ ہے کہ چیک کے ذریعے ادا کی جائے، لہذا سوال یہ ہے کہ چیک سے زکات ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟ اور اگر کسی محتاج کو کسی نے چیک سے زکات دی، تو وہ ادا سمجھی جائے گی یا نہیں؟ اس میں تفصیل ہے:

وہ یہ کہ چیک کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم چیک کی وہ ہے، جس کو مصدقہ چیک (Certified Cheque) کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی چیک پر بینک کی تصدیق ہوتی ہے کہ چیک پر درج رقم اس شخص کے اکاؤنٹ میں موجود ہے اور اس کو حامل چیک نکال سکتا ہے۔ اور عام طور پر بینک اس پر یہ لکھتا ہے: Accepted (یعنی مقبول)۔

ظاہر ہے کہ اس کا حکم بھی ڈرافٹ ہی کا حکم ہے کہ اس پر قبضہ اصل رقم پر قبضے کے حکم میں ہوگا؛ کیوں کہ یہاں بھی رقم محفوظ ہو جاتی ہے اور بلا کسی خطرے کے وہ حامل چیک کو مل جاتی ہے؛ لہذا اس قسم کا چیک دینے سے قبضہ ہو جائے گا اور زکات ادا ہو جائے گی۔

چیک کی دوسری قسم وہ ہے، جس کو ذاتی چیک (Personal Cheque) کہا جاتا ہے، جو آدمی کبھی خود کے لیے اور کبھی کسی کو دینے کے لیے بینک کے نام جاری کرتا ہے؛ لیکن اس میں اس بات کی کوئی توثیق نہیں ہوتی کہ چیک جاری کرنے والے کے اکاؤنٹ میں اس قدر رقم بھی موجود ہے، جو نکالی جا سکتی ہے اور نہ اس میں بینک کی جانب سے کوئی التزام ہوتا ہے کہ اس قدر رقم ادا کی جائے گی۔ ایسا چیک اگر جاری کیا گیا اور بینک کے سامنے پیش ہوا، تو اگر اس کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے، تو بینک رقم دینے کی پابند ہے، بہ شرطے کہ کوئی اور وجہ مانع نہ بنے، ورنہ بینک چیک کو واپس کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس چیک سے حامل چیک کو رقم مل جانا محتمل ہے اور یقینی نہیں، تو اس پر قبضے کو اصل رقم پر قبضہ نہیں قرار دیا جا سکتا؛ لہذا اس قسم کی چیک سے زکات ادا کی، تو جب تک وہ محتاج آدمی اس کو کیش نہیں کرا لیتا، اس وقت تک زکات ادا نہ ہوگی۔

❖ غیر ملکی کرنسی سے زکات ادا کرنا

اگر غیر ملکی کرنسی سے زکات دی جائے، تو ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ غیر ملکی کرنسی سے بھی زکات دی جا سکتی ہے؛ کیوں کہ وہ مال ہے اور قابل انتفاع ہے؛ مگر اس میں اعتبار اس کی موجودہ ویلیو کا ہوگا، جس پر وہ بازار میں فروخت ہوگی۔

"الدر المختار" میں ہے کہ

"وَيُقَوَّمُ فِي البَلَدِ الَّذِي المَالُ فِيْهِ ، فَلَوْ بَعَثَ عَبْداً لِلتِّجَارَةِ فِيْ بَلَدٍ آخَرَ يُقَوَّمُ فِيْ البَلَدِ الّذِيْ فِيْه العَبْدُ". (۱)

(چیز کی قیمت اس شہر کی لگائی جائے گی، جس میں مال ہے، لہذا اگر کسی نے اپنے غلام کو بیچنے کے لیے دوسرے شہر میں بھیجا، تو اسی شہر کی قیمت لگائی جائے گی، جہاں وہ غلام ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر دوسرے ملک کی کرنسی ہے، تو اسی ملک کے حساب سے اس کی قیمت لگائی جائے گی اور اس کو زکات کے حساب میں محسوب کیا جائے گا۔

یہاں ایک اہم سوال اس سلسلے کا یہ ہے کہ کرنسیوں کی قیمت میں بعض اوقات حکومت ایک نرخ مقرر کرتی ہے، جب کہ وہی کرنسی عام دوسری قیمت پر مل جاتی ہے، تو اس میں سے کونسی قیمت کا لحاظ کرنا چاہیے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کرنسی کی جو قیمت بین الاقوامی طور پر مقرر اور اپنے اپنے ملک کے قانون میں رائج ہوتی ہے، اعتبار و لحاظ اسی کا ہونا چاہیے؛ کیوں کہ اصل قیمت کسی بھی کرنسی کی وہی معتبر ہے، جو قانوناً مقرر ہو اور ملک میں رائج ہو، باقی جو کسی جگہ کم یا بیش قیمتیں

---

(۱) الدر المختار مع الرد المحتار :۲۱۲/۳، باب زکاۃ

کرنسی کی دی جاتی ہیں، یہ جائز ہونے کے باوجود اختلاف کے موقعے پر قابل لحاظ نہیں ہو سکتیں۔

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب ۔رحمہ اللہ۔ سابق مفتی دار العلوم دیوبند نے اس سوال کا جواب یہی دیا ہے کہ:

"ایک ملک کا سکہ دوسرے ملک میں جو قیمت بین الاقوامی اور حکومتی سطح پر مقرر ہو، وہی بنیاد اور معیار بنے گی، ادائیگی صحت اور ذمہ خداوندی سے عہدہ برآ ہونے کی، اور جو قیمت اس حکومت کی مقررہ قیمت سے زائد دوسرے لوگ دیتے ہیں یا کم دیتے ہیں، یہ قیمت کوئی قیمت رائجہ ونافقہ فی السوق نہیں ہوتی کہ کنٹرول نرخ اور بازار کے عام رائج بھاؤ پر قیاس کیا جاسکے اور اس کو بنیاد حکم بنایا جاسکے۔ لہذا جس سکے کی جس ملک میں حکومتی سطح کے مطابق قانوناً جو قیمت مقرر ہو، اسی کے اعتبار سے زکات نکالنی چاہیے، چاہے دوسرے ملک میں مقامی اور وقتی طور پر لوگوں کو کچھ زائد یا کم پیسے دیتے ہوں، ان کا اعتبار نہ کرنا چاہیے، بل کہ احتیاط اس میں ہے کہ جس ملک میں جتنے سرمایے پر ہمیں زکات نکالنی ہے، اپنے سرمایے کا چالیسواں حصہ اسی ملک کے اعتبار سے ادائیگی زکات کی نیت سے سال پورا ہوتے ہی الگ نکال دے اور پھر اس کی ادائیگی خود حسب موقعہ اس ملک یا کسی دوسرے ملک میں بھیجتا رہے"۔(۱)

الغرض دوسرے ملک کی کرنسیوں سے زکات تو دی جاسکتی ہے، اس میں کوئی بات قابل اشکال نہیں، البتہ ان کی قیمت میں ملک میں رائج قیمت یا قانون میں مقرر قیمت کا لحاظ کرتے ہوئے زکات کی ادائیگی ہونی چاہیے۔

(۱) منتخبات نظام الفتاوی: ۱/۳۹۲

بحث هشتم

مصارف زکات

بحث ہشتم
مصارف زکات

زکات وصدقات نکالنے کی ضرورت واہمیت

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو مال دیا ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت اور اس کا فضل وکرم ہے، اور اللہ تعالیٰ ان سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کے ان بندوں کو دیں، جو محتاج اور ضرورت مند ہیں اور یہ دینا نہ تو اللہ تعالیٰ پر ہمارا کوئی احسان ہے، اور نہ ان غریبوں پر کوئی احسان ہے؛ کیوں کہ یہ مال جب اللہ ہی کا دیا ہوا ہے تو اسی کے حکم پر کسی اللہ کے بندے کو دینا اللہ تعالیٰ پر کون سا احسان ہے؟ اسی طرح یہ غریبوں اور محتاجوں پر بھی کوئی احسان نہیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان غریبوں کا حصہ ہمارے پاس پہنچایا ہے اور ہم کو حکم دیا ہے کہ ان کا حصہ ان کو پہنچا دو۔

دیکھیے قرآن کریم نے کیا فرمایا:

﴿وَفِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُوْمٌ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾ (المعارج: ۲۴-۲۵)

(مسلمانوں کے مالوں میں مانگنے والوں کا حق بھی ہے اور غیرت کے مارے نہ مانگنے والوں کا بھی مقررہ حصہ اور حق ہے)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے مالوں میں ان کا حصہ رکھ کر بھیجا ہے، لہذا ان کا

حق ان کو ہم دیں، تو ان پر ہمارا کیا احسان ہے؟ لہذا جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، ان کو اپنے مال سے زکات نکالنا چاہیے اور محتاجوں اور غریبوں کو پہنچانا چاہیے؛ مگر یہ زکات کن کو دینا ہے، یہی اس وقت موضوع بحث ہے۔

زکات کن کن لوگوں کو دینا جائز و درست ہے؟

اس بارے میں قرآن کریم کی آیت میں زکات کے آٹھ مستحقین اور مصارف بیان کیے گئے ہیں۔ چناں چہ ارشاد خداوندی ہے کہ

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْم" حَكِيْم"﴾

(التوبۃ: ٦٠)

(فرض) صدقات تو صرف حق ہے غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان صدقات کی تحصیل (وصول کرنے) پر متعین ہیں اور جن کی دلجوئی کرنا (منظور) ہے اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں (صرف کیا جائے) اور قرض داروں کے قرضے (ادا کرنے) میں اور جہاد کرنے (والوں کے سامان) میں اور مسافروں (کی امداد) میں، یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے، بڑی حکمت والے ہیں۔)(۱)

اس آیت کریمہ میں زکات کے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں:

(۱) فقراء (۲) مساکین (۳) عاملین؛ یعنی اسلامی حکومت کی جانب سے زکات وصول کرنے والے (۴) مؤلفۃ القلوب؛ یعنی وہ لوگ جن کی دل جوئی منظور ہے (۵) غلاموں کو آزاد کرانا (۶) قرض داروں کا قرضہ اتارنا (۷) اللہ کے راستے میں (۸) مسافرین

(۱) ترجمہ از بیان القرآن

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر مختصر طور پر لکھ دی جائے؛ تاکہ مصارف زکات جن کا یہاں ذکر ہے، وہ تفصیل کے ساتھ سامنے آجائیں۔

شان نزول: اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ ابوداؤد اور دار قطنی نے روایت کیا ہے کہ حضرت زیاد بن الحارث صدائی نے روایت کیا کہ میں مجلس میں حاضر تھا کہ ایک شخص رسول اللہ –ﷺ– کی خدمت اقدس میں کچھ سوال کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ آپ –ﷺ– نے اس کو یہ جواب دیا کہ ''صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی بھی نبی، یا غیر نبی کے حوالے نہیں کیا؛ بل کہ خود ہی اس کے آٹھ مصارف متعین فرمادئے، اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو، تو تمھیں دے سکتا ہوں''۔ (۱)

اس آیت میں باجماع صحابہ وتابعین واجماع امت صدقے سے صدقۂ واجبہ یعنی زکات ہی مراد ہے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں لفظ صدقہ مطلقاً بولا گیا ہے، اور کوئی قرینہ نفلی صدقے کا نہ ہو، تو وہاں صدقۂ فرض ہی مراد ہے۔

اس آیت کی ابتدا میں ''إنَّمَا'' کا لفظ ہے، یہ حصر کا مفہوم پیدا کرتا ہے، اس کے معنی ہوتے ہیں ''صرف اور محض''، یعنی زکات تو صرف انھی لوگوں کو دینا ہے، جو یہاں بتائے گئے ہیں، اس میں اشارہ ہے کہ زکات کے مستحقین صرف وہی ہیں، جو اس میں بتائے گئے ہیں، ہم اپنی جانب سے اس میں کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ اور وہ آٹھ مصارف ہیں۔

علامہ زمخشری –رحمہ اللہ– لکھتے ہیں کہ

''إنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلفُقَراء : قَصْرٌ لِجِنْس الصَّدَقات على الأصْنَافِ المَعْدُوْدَةِ ، وأنَّهَا مُخْتَصَّةٌ بِهَا لا يَتَجَاوَزُها إلى غَيْرِهَا ،كأنَّه قِيْلَ: إنَّمَا هِيَ لَهُمْ لا لِغَيْرِهِمْ''. (۲)

(۱) القرطبي :۲۴۵/۱۰

(۲) الكشاف:۲۹۲/۲

امام ابن قدامہ الحنبلی ۔ رحمۃ اللہ ۔ نے اسی آیت کو پیش کر کے لکھا ہے کہ

"وَلا يَجُوزُ صَرْفُ الزكاةِ إلى غيرِ مَنْ ذَكَرَ اللّٰهُ تَعالٰى، مِنْ بِنَاءِ المَسَاجِدِ والقَنَاطِرِ والسِّقَايَات وإصْلاحِ الطُّرُقَات، وسَدِّ البُثُوْق، وتَكْفِيْنِ المَوْتٰى، والتَّوْسِعَة على الأضْيَافِ و أشْبَاهِ ذٰلكَ مِنَ القُرَبِ الَّتي لَمْ يَذْكُرْهَا اللّٰه تعالٰى." (۱)

الغرض اس "لفظ إِنَّمَا" سے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ واضح کر دیا ہے کہ زکات مذکورہ ومعدودہ مصارف ہی پر خرچ کرنا ہے، کسی اور جگہ اپنی رائے واجتہاد سے خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی ۔ رحمۃ اللہ ۔ "معارف القرآن" میں اسی لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اس شروع ہی کے کلمے نے بتلا دیا کہ صدقات کے جو مصارف آگے بیان ہو رہے ہیں، تمام صدقات واجبہ صرف انہیں میں خرچ ہونے چاہئیں، ان کے علاوہ کسی دوسرے مصرفِ خیر میں صدقات واجبہ خرچ نہیں ہو سکتے، جیسے جہاد کی تیاری، یا بناءِ مسجد ومدارس، یا دوسرے رفاہ عام کے ادارے، یہ سب چیزیں بھی اگرچہ کہ ضروری ہیں، اور ان میں خرچ کرنے کا بہت بڑا ثواب ہے، مگر صدقاتِ فرض جن کی مقداریں متعین کر دی گئی ہیں، ان کو ان میں لگایا نہیں جا سکتا"۔ (۲)

پہلا اور دوسرا مصرف:۔فقیر اور مسکین

یہاں زکات کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک مصرف فقیر ہے اور دوسرا مصرف مسکین ہے۔

---

(۲) المغني لابن قدامة: ۱۲۵/۴

(۱) معارف القرآن: ۳۹۵/۴

فقیر و مسکین کس کو کہتے ہیں؟ اس میں متعدد اقوال ہیں۔ اکثر حضرات کہتے ہیں کہ فقیر وہ شخص ہے، جس کے پاس گزر بسر کے لیے کچھ بھی نہ ہو اور مسکین وہ ہے، جس کے پاس کچھ مال تو ہو، مگر نصاب کے برابر نہ ہو۔

علامہ ابن الانباری – رحمہ اللہ – کہتے ہیں کہ

”يُرْوٰى عن الأصْمَعِي أنَّه قال: المَسَاكِيْنُ أحْسَنُ حَالاً مِنَ الفَقِيْر . وقال أحمد بن عبيد : المِسْكِيْنُ أحْسَنُ حَالاً من الفَقِيْر. قال (ابن الأنباري) : وهو الصَّحِيْحُ عِنْدَنا“.(۱)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب – رحمہ اللہ – لکھتے ہیں کہ

”فقیر اور مسکین کے معنی میں اگرچہ اختلاف ہے، ایک کے معنی ہیں، جس کے پاس کچھ نہ ہو اور دوسرے کے معنی ہیں، جس کے پاس نصاب سے کم ہو؛ لیکن حکم زکات میں دونوں یکساں ہیں، کوئی اختلاف نہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کے پاس اس کی ضروریات اصلیہ سے زائد بقدر نصاب مال نہ ہو، اس کو زکات دی جا سکتی ہے، اور اس کے لیے زکات لینا بھی جائز ہے“۔(۲)

خلاصہ یہ ہے کہ فقیر و مسکین وہ لوگ ہیں، جن کے پاس یا تو کچھ بھی مال نہ ہو، یا کچھ مال ہو، لیکن نصاب کے برابر نہ ہو یا نصاب کے برابر ہو تو نصاب نامی یعنی بڑھنے والا مال نہ ہو، تو وہ بھی فقیر، یا مسکین میں داخل ہے۔

مثال: ایک شخص کے پاس اتنا روپیہ پیسہ ہے، یا کچھ سونا ہے، یا کچھ چاندی ہے جو نصاب کے برابر نہیں ہے، تو اس کو بھی زکات دے سکتے ہیں؛ کیوں کہ اس کے پاس نصاب کے برابر مال نہیں ہے۔ ہاں! اگر کسی کے پاس کچھ سونا اور کچھ چاندی ہو، تو اگر یہ دونوں کو

(۱) زاد المسير لابن الجوزي:۴۵۶/۳

(۲) معارف القرآن:۳۹۶/۴

ملانے سے چاندی کے نصاب کی قیمت بن جائے ،تو اس کو زکات نہیں دے سکتے ؛ کیوں کہ یہ شخص صاحب نصاب ہے اور شرعاً مال دار ہے۔

اسی طرح ایک شخص کے پاس ذاتی مکان ہے، یا سواری وغیرہ ہے، جو اس کی ضروریات سے زائد نہیں ہے،ضرورت کے لیے ہے،تو اس کو بھی زکات کی رقم دے سکتے ہیں ؛ کیوں کہ اس کے پاس جو مکان وسواری ہے، وہ مال نامی نہیں ہے۔ جیسے بعض لوگ ہوتے ہیں کہ مکان تو ہے؛ مگر روزمرہ کی ضروریات کے لیے ان کے پاس رقم نہیں ہے،تو وہ بھی زکات کے مستحق ہیں۔

تیسرا مصرف :- عاملین زکات

آیت کریمہ میں زکات کا تیسرا مصرف '' عاملین '' مذکور ہے۔اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ عاملین سے مراد وہ لوگ ہیں، جو اسلامی حکومت کی جانب سے زکات و صدقات وصول کر کے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت پر ماٗمور ومقرر ہوتے ہیں اور امیر المؤمنین ان کی تنخواہ اسی سے ادا کرتے ہیں۔

امام قرطبی - رحمہ اللہ - لکھتے ہیں کہ

" العَامِلِيْنَ عَلَيْهَا : يعني السُعَاةُ والجُبَاةُ الَّذِيْنَ يَبْعَثُهُم الإمَامُ لِتَحْصِيْلِ الزَّكَاةِ بِالتَّوْكِيْلِ عَلَى ذٰلكَ ."

(عاملین زکات وہ محنت وکوشش کرنے والے لوگ جنھیں امیر المؤمنین بطور وکیل زکات وصول کرنے کے لیے بھیجتے ہیں)۔(۱)

لہذا امام وقت کی جانب سے جو لوگ زکات کی وصولی کے لیے مقرر ہوتے ہیں، ان کو بھی زکات کی مد سے ان کا حق الخدمت دیا جائے گا، اگرچہ کہ وہ خود اپنی جگہ مالدار وغنی بھی ہوں۔

---

(۱) تفسیر القرطبي:۱۰/۲۶۰

مگراس پر دو علمی سوال پیدا ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ مال دار کو جب زکات دینا حرام ہے تو عاملین کو کس طرح دی جا سکتی ہے؟ اور دوسرے یہ کہ عاملین کو ان کے حق الخدمت کے طور پر دیا جاتا ہے، تو یہ ان کی خدمت کا معاوضہ ہوا اور پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ کسی کی خدمت کے معاوضے میں زکات دینا جائز نہیں۔

ان سوالات کا جواب حضرت مفتی محمد شفیع صاحب -ﷺ- نے معارف القرآن میں تفصیل سے دیا ہے، چناں چہ آپ لکھتے ہیں کہ

"ان دونوں سوالوں کا جواب ایک ہی ہے، کہ عاملین صدقہ کی اصلی حیثیت کو سمجھ لیا جائے، وہ یہ ہے کہ یہ حضرات فقراء کے وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ سب جانتے ہیں کہ وکیل کا قبضہ اصل موکل کے قبضے کے حکم میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنا قرض وصول کرنے کے لیے کسی کو وکیل مختار بنا دے اور قرض دار یہ قرض وکیل کو سپرد کر دے، تو وکیل کا قبضہ ہوتے ہی، قرض دار بری ہو جاتا ہے۔ تو جب رقم زکات عاملین صدقہ نے فقراء کے وکیل ہونے کی حیثیت سے وصول کر لی، تو ان کی زکات ادا ہوگئی، اب یہ پوری رقم ان فقراء کی ملک ہے، جن کی طرف سے بطور وکیل انھوں نے وصول کی ہے۔ اب جو رقم ان کو بطور حق الخدمت دی جاتی ہے، وہ مالداروں کی طرف سے نہیں، بل کہ فقراء کی طرف سے ہوئی اور فقراء کو اس میں ہر طرح کا تصرف کرنے کا اختیار ہے، ان کو یہ بھی حق ہے کہ جب اپنا کام ان لوگوں سے لیتے ہیں، تو اپنی رقم میں سے ان کو معاوضہ خدمت دے دیں۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ فقراء نے تو ان کو اپنا وکیل مختار نہیں بنایا، یہ ان کے وکیل کیسے بن گئے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ جس کو امیر کہا جاتا ہے، وہ قدرتی طور پر منجانب

اللہ پورے ملک کے فقراء غرباء کا وکیل ہوتا ہے؛ کیوں کہ ان سب کی ضروریات کی ذمے داری اس پر عائد ہوتی ہے، امیر مملکت جس جس کو صدقات کی وصول یابی پر عامل بنادے، وہ سب ان کے نائب کی حیثیت سے فقراء کے وکیل ہوجاتے ہیں۔اس سے معلوم ہوگیا کہ عاملین صدقہ کو جو کچھ دیا گیا، وہ درحقیقت زکات نہیں دی گئی، بل کہ زکات جو فقراء کا حق ہے، ان کی طرف سے معاوضۂ خدمت دیا گیا۔"(۱)

چوتھا مصرف–مؤلفۃ القلوب

زکات کا چوتھا مصرف: مؤلفۃ القلوب ہے، اس سلسلے میں دو بحثیں ہیں: ایک یہ کہ مؤلفۃ القلوب کون ہیں؟ دوسرے یہ کہ یہ مصرف زکات اب باقی ہے، یا نہیں؟

ان دونوں مباحث میں علماء کے درمیان قدیم زمانے سے کافی اختلاف چلا آرہا ہے اور تفاسیر وشروحات حدیث اور فقہی کتابوں میں اس پر بڑی لمبی لمبی بحثیں کی گئی ہیں۔

جہاں تک پہلی بحث ہے، تو اس سلسلے میں مشہور یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب میں کئی قسم کے لوگ داخل تھے، ان میں چار قسمیں مسلمانوں کی تھیں اور دو قسمیں غیر مسلمین کی تھیں، اس طرح یہ کل چھ قسمیں ہوجاتی ہیں:

(۱) ایک وہ مسلمان جو اسلام لانے کے باوجود ابھی اسلام میں پختہ ومضبوط نہیں ہوئے تھے۔ایسے لوگوں کو اسلام پر جمانے کے لیے اللہ کے رسول–ﷺ– زکات کی مد سے دیتے تھے، جیسے عیینہ بن حصن، اقرع بن حابس کو آپ دیا کرتے تھے۔

(۲) دوسرے وہ لوگ تھے، جو اپنے قبیلوں کے رئیس تھے اور اسلام میں مضبوط بھی تھے، مگر ان کو زکات دینے سے دیگر قبائل کے سرداروں کو اسلام کی جانب ترغیب ہوسکتی تھی؛

(۱) معارف القرآن: ۴/۳۹۸–۳۹۹

لہذا ان کو اس لیے دیا جاتا تھا کہ ان کو دیکھ کر دیگر قبائل کے سردار اسلام قبول کرلیں۔ جیسے حضرت عدی بن حاتم، حضرت زبرقان بن بدر کو دینے کا یہی مقصد تھا کہ یہ خود بڑے سچے اور پکے مسلمان تھے، مگر دیگر لوگوں کو اس سے ترغیب ہوسکتی تھی۔

(۳) تیسرے وہ مسلمان لوگ تھے، جو سرحدوں پر رہتے تھے، جہاں ان کو کفار سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا؛ لیکن یہ لوگ اپنے حالات کی کمزوری، یا دینی لحاظ سے ضعف کی وجہ سے اس وقت تک ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے، جب تک کہ ان کی مدد نہ کی جائے، اس قسم کے لوگوں کو بھی زکات کی مد سے دیا جاتا تھا۔

(۴) چوتھے وہ مسلمان لوگ جو اپنے قبائل کے با اثر مانے جاتے تھے، ان کو زکات دی جاتی تھی؛ تا کہ وہ اپنے قبائل یا علاقے کے لوگوں کی زکاتیں وصول کرکے بھیجیں، یا فوج کی مدد کے لیے آدمی فراہم کریں۔

اور کفار میں سے دو قسم کے لوگوں کو مؤلفۃ القلوب میں شمار کیا جاتا ہے:

(۱) ایک وہ لوگ جن کے شر کا اندیشہ ہو اور ان کو مال دینے سے ان کے شر سے محفوظ رہنے کی امید ہو، جیسے عامر بن الطفیل کو دیا جاتا تھا؛ لہذا ایسے لوگوں کی دل جوئی کے لیے ان کو دیا جاتا تھا؛ تاکہ ان کے شر سے بچا جاسکے۔

(۲) دوسرے وہ لوگ جن کے اسلام لانے کی امید ہو، یا دفاع عن الاسلام کی امید ہو، جیسے صفوان بن امیہ کو دیا جاتا تھا؛ لہذا ان کو دینے کا مقصد اسلام لانے کی ترغیب یا دفاع اسلام کی امید تھی۔ (۱)

ان مذکورہ بالا اقسام میں غور کیا جائے، تو متعدد قسموں میں تداخل معلوم ہوتا ہے، اس

---

(۱) دیکھو: شرح السنة للبغوی : ۹۲/۶، معالم التنزیل للبغوي:۶۳/۴، زاد المسیر لابن الجوزی:۴۵۷/۳، المجموع للنووي:۱۷۹/۶، تفسیر القرطبي: ۱۷۸/۸-۱۷۹، المغني لابن قدامة:۳۱۷/۹

لیے بعض علماء وفقہاء نے مؤلفۃ القلوب کی صرف تین قسمیں بیان کی ہیں، جس کو ان قسموں کا خلاصہ کہنا مناسب ہوگا، چنانچہ الجوھرۃ، البحر الرائق ،النھر الفائق اور رد المحتار وغیرہ میں ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی تین قسمیں تھیں:

(۱) ایک کفار جن کو اسلام کی جانب رغبت دلانا مقصود تھا۔

(۲) دوسرے وہ کفار جن کے شر سے بچنا منظور تھا۔

(۳) تیسرے وہ مسلمان جو دین میں پختہ نہیں ہوئے تھے۔ (۱)

مؤلفۃ القلوب کی اقسام کے بعد یہ بات قابل ذکر ہے کہ علماء وائمہ میں سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ زکات کی مد سے ان سب قسم کے لوگوں کو دیا جاتا تھا، جبکہ بعض ائمہ وعلماء کا کہنا ہے کہ ان میں سے جو کفار تھے، ان کو زکات سے نہیں، بل کہ مال غنیمت کے خمس سے یا کسی اور مد سے دیا جاتا تھا۔

علامہ کاسانی نے "بدائع الصنائع" میں اور علامہ حدادی نے "الجوھرۃ النیرۃ" میں صراحت کی ہے کہ مؤلفۃ القلوب میں دیگر قسموں کے ساتھ کفار کو بھی دیا جاتا تھا۔

علامہ کاسانی –رحمہ اللہ– لکھتے ہیں کہ

"وأمّا المؤَلَّفَةُ قُلُوْبُهُمْ فَقَدْ قِيْل : إنَّهم كَانُوْا قَوْماً مِنْ رُؤَسَاءِ قُرَيْش و صَنَادِيْدِ العَرَبِ ، مِثل أبي سُفْيان بن حرب ، و صَفْوَان بن أمَيّة ، والأقْرَع بن حَابِس ، وعُيَيْنَة بن حِصْن الفَزَارِي ، والعَبّاس بن مَرْدَاس السلمي، ومَالک بن عَوْف النضري ، وحَكِيْم بن حِزَام ، وغَيْرِهِم ، و لَهُمْ شَوْكَةٌ وقُوّةٌ وأتْبَاعٌ كثيرةٌ ، بَعْضُهُم أسْلَمَ حَقِيْقَةً ، وبَعْضُهم أسلَمَ ظاهراً

(۱) الجوهرة النيرة: ۱/۳۱۱، البحر الرائق: ۲/۴۱۹، النهر الفائق: ۱/۴۵۸، رد المحتار: ۳/۲۸۷

لا حَقِيقَةً ، وكان مِنَ المُنافِقِين و بَعضُهُم كان مِنَ المُسَالِمِيْن .
فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰه –ﷺ– يُعطِيهِم مِنَ الصَّدَقات تَطْيِيباً لِقُلُوْب
المُسْلِمِيْن منهم ، وتَقْرِيْراً لَهُمْ على الإِسْلام وتَحْرِيضاً لأَتْبَاعِهِم
على اتِّبَاعِهِمْ وتَألِيْفاً لِمَن لم يَحْسُنْ إسلامُه ، وقد حَسُنَ إسلامُ
عَامَّتِهِمْ إلّا مَنْ شَاءَ اللّٰه تعالیٰ لحُسْن مُعَامَلَةِ النَّبِيِّ –ﷺ–
معهم "۔(۱)

اسی طرح علامہ حدادی –رحمہ اللہ– "مؤلفۃ القلوب" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

"وهُمْ ثلاثَةُ أصْنَافٍ : صِنْفٌ كانَ يُؤَلِّفُهُمْ النَّبِيُّ –ﷺ– لِيُسْلِمُوْا وَيُسْلِمَ قَوْمُهُم بإسْلامِهِمْ . وصِنفٌ منهم أسْلَمُوْا ؛ ولكن على ضُعْفٍ ، فَيُرِيْدُ تَقْرِيْرَهُم عَلَيْه . و صِنفٌ يُعْطِيْهِمْ لِدَفْعِ شَرِّهِمْ مثل عَبَّاسِ بن مَرْدَاس السلمي ، وعُيَيْنة بن حِصْن الفَزاري ، و صَفْوَان بن أمَيَّة القُرشِي ، و الأقْرَع بن حَابِس ، وأبي سُفْيان بن حرب الأموي "۔(۲)

نیز علامہ برہان الدین البخاری –رحمہ اللہ– نے "المحيط البرهاني" میں، علامہ عینی نے "البناية" میں، علامہ بابرتی نے "العناية" میں، علامہ ابن نجیم نے "البحر الرائق" میں، علامہ سراج الدین نے "النهر الفائق" میں، علامہ شامی نے "رد المحتار" میں، کفار کو دیے جانے کا صراحت سے ذکر کیا ہے۔(۳)

---

(۱) بدائع الصنائع:۲/۴۶۸–۴۷۰

(۱) الجوهرة النيرة:۱/۳۱۱

(۲) المحيط البرهاني:۲/۲۸۱، البناية :۳/۵۲۳، العناية :۲/۲۵۹، البحر الرائق: ۲/۴۱۹، النهر الفائق:۱/۴۵۸، رد المحتار:۳/۲۸۷

ہمارے اکابرین دیوبند میں سے حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی -رحمہ اللہ- نے ''الکوکب الدري تقریر ترمذي'' میں اسی کو اختیار کیا ہے، چناں چہ آپ مؤلفۃ القلوب کو زکات دینے سے، ضرورت پر رشوت دینے کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''ویُعْلَمُ مِنْ هٰذا جَوَازُ إِيْتَاءِ الرِّشْوَةِ إِذَا لَمْ يَجِدْ بُدّاً مِنْ ذٰلِکَ ، ویُعْلَمُ أنّه لا يَتفَصّٰى عَنِ الظُّلْمِ إلَّا بِهِ ، إذْ كَانَ إِيْتَاؤُه لِلْكُفَّار لِئَلَّا يَتعَرَّضُوا الفُقَرَاءَ المُسْلِمِيْن بِسُوْءٍ.''(۱)

اسی طرح حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی -رحمہ اللہ- نے بھی بیان القرآن میں ذکر کیا ہے کہ مؤلفۃ القلوب کے مصرف میں کفار کو بھی دیا جاتا تھا۔

آپ لکھتے ہیں کہ

''مؤلفۃ القلوب کو جناب رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- کے زمانے میں زکات دی جاتی تھی، گو وہ مسلمان نہ ہوں، مگر ان کے مسلمان ہونے کی امید ہو، یا محض ان کے شر وفتنہ سے بچنے کے لیے''۔(۱)

اس کے برخلاف متعدد حضرات ائمہ وفقہاء کی رائے یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کے مصرف میں جن کو دیا جاتا تھا، وہ صرف اہل اسلام تھے۔اور جو بعض روایات میں غیر مسلمین کو دئے جانے کا ذکر آیا ہے، ان حضرات کے نزدیک اس سے مراد مال غنیمت میں سے دینا ہے، زکات میں سے نہیں۔

علامہ بغوی -رحمہ اللہ- نے " شرح السنة " اور " معالم التنزيل " میں مؤلفۃ القلوب کی مذکورہ اقسام کا ذکر کرتے ہوئے، اجمالاً بعض کے بارے میں صراحت کی ہے کہ ان کو خمس سے یا غازیوں کے مد سے دیا جاتا تھا۔

(۱) بیان القرآن:۱۴۰/۲

(۲) الكوكب الدري:۲۶/۲

اورعلامہ نووی نے "المجموع" میں کفار کی دونوں قسموں کے بارے میں کہا کہ

"كَانَ النَّبِيُّ – صلى الله عليه وسلم – يُعْطِيهِم – كما ذَكَرْنَا – مِنَ الغَنَائِمِ ، لَا مِنَ الزَّكَاةِ" (۱)

(اللہ کے رسول ان کو غنائم سے دیتے تھے، زکات سے نہیں)

اسی بنیاد پر بعض ائمہ نے تصریح کی ہے کہ مؤلفۃ القلوب کے حصے میں کفار کو نہیں دیا جائے گا، یہی امام شافعی کا نقطۂ نظر ہے۔

چناں چہ امام شافعی – رحمہ اللہ – نے "کتاب الأم" میں تصریح کی ہے کہ مال زکات میں سے کفار کو نہیں دیا جائے گا، پھر آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ حنین کے موقعے پر اللہ کے رسول – صلی اللہ علیہ وسلم – نے بعض مشرکین کو مال دیا ہے، تو جواب یہ ہے کہ آپ – صلی اللہ علیہ وسلم – نے یہ مال غنیمت میں سے اور خود اپنے ذاتی حصے سے دیا تھا۔

"کتاب الأم" میں امام شافعی – رحمہ اللہ – کی عبارت یہ ہے:

"والمُؤَلَّفَةُ قُلُوبُهم مَنْ دَخَلَ فِي الإِسْلَامِ ، ولا يُعْطَى مِنَ الصَّدَقَةِ مُشْرِكٌ يتألَّفُ على الإسلام، فإنْ قَال قَائِل : أَعْطَى النَّبِيُّ – صلى الله عليه وسلم – عامَ حُنَيْنٍ بَعضَ الْمُشْرِكِين مِنَ المُؤَلَّفَة ، فَتِلْكَ العَطَايَا مِنَ الفَيْءِ ، وَمِنْ مَالِ النَّبِي – صلى الله عليه وسلم – خَاصَّةً". (۲)

امام شافعی – رحمہ اللہ – کی اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ مؤلفۃ القلوب میں کفار داخل نہیں ہیں، اور دوسرے یہ کہ اللہ کے رسول – صلی اللہ علیہ وسلم – جو بعض کفار کو دیا کرتے تھے، جس کا احادیث میں ذکر ہے، وہ مال غنیمت میں سے دیتے تھے، مال زکات میں سے نہیں۔

محدث وقت علامہ انور شاہ کشمیری – رحمہ اللہ – کے طرز بیان سے بھی یہی لگتا ہے کہ

---

(۱) المجموع: ۱۹۸/۶

(۲) الأم للإمام الشافعي: ۱۸۳/۳

وہ کفار کو مؤلفۃ القلوب کے مد میں دینے کے قائل نہیں تھے؛ کیوں کہ آپ نے ''العَرْفُ الشَّذِي شرح الترمذي'' میں صفوان بن امیہ کو حنین کے موقعے پر مال دینے کی حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے پہلے تو فرمایا کہ بظاہر حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفر کی حالت میں ان کو دیا گیا، مگر یہ بات قابل اشکال ہے، پھر قابل اشکال ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''فإنَّ المُؤَلَّفَةَ قُلُوْبُهُم هُم الَّذِينَ أَسْلَمُوْا وَلَمْ يَرْسَخْ الإسْلامُ فِيْ قُلُوْبِهِمْ .'' (۱)

آپ کی یہ تحقیق شیخ علامہ یوسف بنوری -رحمہ اللہ- نے ''معارف السنن شرح ترمذی'' میں بھی ذکر کی ہے۔ (۲)

اس سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک مؤلفۃ القلوب میں کفار داخل نہیں تھے۔

اسی کو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب -رحمہ اللہ- نے ''معارف القرآن'' میں اختیار کیا ہے کہ مؤلفۃ القلوب میں کفار داخل نہیں تھے۔

چناں چہ آپ کہتے ہیں کہ

''عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ان سب کو آنحضرت -صلی اللہ علیہ وسلم- کے عہد میں اس مصلحت وحکمت سے زکات کی مد سے دیا جاتا تھا، لیکن آپ -صلی اللہ علیہ وسلم- کے بعد اسلامی فتوحات کی وجہ سے یہ ضرورت و مصلحت باقی نہ رہی، اس لیے زکات کا یہ مد بھی ختم ہوگیا۔ اسی کو بعض فقہاء نے، منسوخ ہونے سے تعبیر کیا ہے اور بہت سے حضرات نے فرمایا کہ یہ مؤلفۃ

---

(۱) العرف الشذي :۱۳۰/۲

(۲) معارف السنن:۲۸۲/۵

القلوب کا حصہ منسوخ نہیں،بل کہ صدیق اکبر-رضی اللہ عنہ- اور عمر فاروق-رضی اللہ عنہ-
کے دور میں ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے یہ ساقط کردیا گیا تھا اور آئندہ
کسی زمانے میں ایسی ضرورت پیش آنے پر دوبارہ ان کو دیا جاسکتا ہے
؛لیکن تحقیقی اور صحیح بات یہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین میں
کبھی بھی غیر مسلموں کو زکات کی مد سے نہیں دیا گیا۔ اور امام قرطبی نے
صاف لکھا ہے کہ: ''وبِالجُمْلَةِ فَكُلُّهُمْ مُؤمِنٌ ، وَلَمْ يَكُنْ فِيهِمْ
كَافِرٌ'' کہ مؤلفۃ القلوب سب کے سب مسلمان تھے،ان میں کوئی کافر
نہیں تھا۔ اسی طرح تفسیر مظہری میں بھی تصریح ہے کہ اللہ کے رسول سے
یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے کسی کافر کو دل جوئی کے لیے زکات دی ہو
۔اور جو بعض روایات سے ایسا سمجھا جاتا ہے کہ مؤلفۃ القلوب میں کفار کو
بھی دیا جاتا تھا، یہ غلط فہمی ہے اور جو کفار کو دیا جاتا تھا، وہ مال غنیمت کے
خمس سے دیا جاتا تھا،جس میں مسلم وغیر دونوں کا حق ہے۔(۱)

نیز حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی -رحمہ اللہ- نے بھی مؤلفۃ القلوب میں صرف
اہل اسلام کو داخل مانا ہے، کفار کو نہیں، آپ اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ

> ''مؤلفۃ القلوب سے وہ نومسلم مراد ہیں کہ جنھوں نے اسلام تو قبول
> کرلیا، مگر ہنوز ان کا اسلام کمزور ہے اور غریب و نادار ہیں، اندیشہ ہے کہ
> پھسل نہ جائیں۔ اس لیے ان کو صدقات سے دیا جائے؛ تاکہ اسلام پر قائم
> اور ثابت رہیں ....اور کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ آں
> حضرت-صلی اللہ علیہ وسلم- نے کسی کافر کو تالیف قلب کے لیے زکات اور صدقات
> میں سے کچھ دیا ہو۔ جن روایتوں میں صفوان بن امیہ وغیرہ کو

(۱) معارف القرآن:۳/۴۰۰-۴۰۳

دینے کا ذکر آیا ہے، سو وہ مال غنیمت کے خمس سے دیا گیا ہے، نہ کہ مال زکات سے۔[1]

الغرض اس مسئلے میں اختلاف ہوا ہے کہ مؤلفۃ القلوب میں کون کون لوگ داخل ہیں، اکثر نے اس میں ان مسلمانوں کو داخل مانا ہے، جو ایمانی لحاظ سے کمزور تھے، یا ان کو دینے سے کفار کو ایمان لانے کی ترغیب ہو سکتی تھی اور بعض حضرات نے یہ مانا ہے کہ اس میں کفار بھی شامل تھے اور ان کو بھی دیا جاتا تھا اور دونوں طرف بڑے بڑے اکابر حضرات ہیں، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا۔

لیکن غور کرنے سے ان حضرات کا نقطۂ نظر اصح و ارجح معلوم ہوتا ہے جو مؤلفۃ القلوب میں غیر مسلموں کو بھی داخل مانتے ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ یہ تو سب مانتے ہیں کہ حضرت ابو بکر -رضی اللہ عنہ- اور حضرت عمر -رضی اللہ عنہ- نے مؤلفۃ القلوب میں سے بعض لوگوں کو دینے سے انکار کر دیا اور ان کے حصے کو ساقط قرار دیا، خواہ وہ ساقط ہونا منسوخ ہونے کے طور پر ہو، یا موقوف ہونے کے طور پر ہو۔ جیسا کہ ہم اس پر دوسری بحث میں روشنی ڈالیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان حضرات نے جن کا حصہ ساقط قرار دیا تھا، وہ کون تھے، مسلم، یا غیر مسلم؟ اگر ان کو غیر مسلم مانا جائے تو بات واضح ہوگئی کہ مؤلفۃ القلوب میں یہ لوگ داخل تھے، تب ہی تو ان کے حصے کو ساقط کیا گیا۔ اور اگر وہ صرف مسلمان ہی تھے، تو اس میں دو احتمالات ہیں: ایک یہ کہ وہ غریب مسلمان تھے یا مالدار مسلمان تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ غریب محتاج ہوں، تو ان کا حصہ ساقط نہیں ہو سکتا؛ کیوں کہ غربت کی وجہ سے تو ان کو دیا جائے گا؛ لہذا اب صرف اس میں وہ مسلمان رہ گئے جو مالدار تھے۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ حضرات شیخین نے جن کا حصہ ساقط کیا تھا، وہ صرف مالدار مسلمان تھے، مگر روایات سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

(۱) معارف القرآن: ۴/۳۶۷

ایک تو اس لیے کہ روایت میں ہے کہ جب اللہ کے رسول –ﷺ– کی وفات کے بعد مشرکین مانگنے آئے ،تو حضرت عمر –رضی اللہ عنہ– نے یہ فرمایا کہ تم کو اس وقت دیا جاتا تھا، جب اسلام کمزور تھا، اب اسلام کو اللہ تعالی نے عزت دے دی ہے، لہذا یا تو تم اسلام پر جم جاؤ، ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ (حوالہ آگے آرہا ہے)

امام طبری نے عبداللہ بن عباس –رضی اللہ عنہ– سے روایت کیا ہے کہ مؤلفۃ القلوب وہ لوگ تھے، جو رسول اللہ –ﷺ– کی خدمت میں اسلام ظاہر کرتے ہوئے آتے تھے، اور آپ ان کو صدقات میں سے دیتے تھے، ان لوگوں کا حال بیان کرتے ہیں کہ:

" فإذَا أعْطَاهُمْ مِنَ الصَّدَقَاتِ فَأصَابُوْا مِنهَا خَيْراً ، قَالُوْا : هٰذا دِيْنٌ صَالِحٌ ، وإنْ كَانَ غَيرَ ذٰلِک ، عَابُوْهُ وَتَرَكُوْه "

(اگر آپ ان کو صدقات میں سے دیتے اور وہ اس میں سے پاتے تو کہتے کہ یہ دین بہت اچھا دین ہے اور اگر نہ پاتے ،تو دین میں کیڑے نکالتے اور چھوڑ جاتے۔)(۱)

یہ روایت بتا رہی ہے کہ مؤلفۃ القلوب میں ایسے لوگ بھی داخل تھے، جو صدقہ دینے سے دین اسلام کی تعریف کرتے اور نہ دیا جائے ،تو دین کو عیب دار قرار دیتے اور چھوڑ جاتے۔ حضرت ابن عباس –رضی اللہ عنہ– نے ان لوگوں کی جو علامت یا حالت بتائی ہے، ظاہر ہے کہ اہل اسلام کی تو ہو نہیں سکتی ، بل کہ منافقین کی علامت وحالت ہے؛ کیوں کہ دین کو عیب دار قرار دینے کی کوشش یا اس کو برا بھلا کہنا تو کفر ہے، جو اگر چھپا ہوا ہو تو نفاق ہے اور اگر کھلا ہوا ہو تو کفر ہے۔

اسی طرح امام سرخسی –رحمہ اللہ– نے "المبسوط "میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عمر –رضی اللہ عنہ– کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ

---

(۱) تفسیر الطبري:۳۱۳/۱۴

"وأمَّا اليَوْمَ فَقَدْ أعزَّ اللّٰهُ الدِّيْنَ ، فإنْ ثَبَّتُّمْ عَلَى الإسْلامِ ، وَ إلَّا فَبَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ السَّيف ". (۱)

یہ الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ جو لوگ مال لینے آئے تھے، وہ دین پر قائم نہیں تھے، اسی لیے حضرت عمر -رضی اللہ عنہ- نے فرمایا کہ دین اسلام پر جم جاؤ، ورنہ تلوار فیصلہ کرے گی۔ ظاہر ہے کہ تلوار کے فیصلہ کرنے کی نوبت، تو اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب کوئی اسلام کا منکر ہو۔

بلکہ امام ابن قدامہؒ نے اس واقعے میں مشرک کا ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

" لِما رُوِيَ أنّ مُشْرِكاً جَاءَ يَلْتَمِسُ مِنْ عُمَرَ مَالاً فَلَمْ يُعْطِهِ ، وقَالَ: ﴿ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾".

(ایک مشرک حضرت عمر کی خدمت میں مال مانگنے کے لیے آیا، تو آپ نے اس کو نہیں دیا اور فرمایا کہ جو چاہے، ایمان لائے اور جو چاہے، کفر کرے۔)(۲)

الغرض ان روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر -رضی اللہ عنہ- نے جن لوگوں کو مال دینے سے انکار کیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ تم کو پہلے دیا جاتا تھا، لیکن اب نہیں دیا جائے گا، یہ لوگ اس وقت مسلمان نہیں تھے۔

دوسرے اس لیے کہ اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کے بارے میں جو روایت آئی ہے، اس میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ ان لوگوں نے حضرت ابوبکر -رضی اللہ عنہ- کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار کیا تھا اور اسی حوالے سے مال کا مطالبہ کیا تھا۔ اس میں یہ آیا ہے کہ ان دونوں نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں ایک زمین شوریلی ہے، جس میں نہ گھاس اگتی ہے اور نہ اس میں کوئی منفعت ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں، تو وہ ہمیں عطا کر دیں تاکہ ہم اس میں ہل چلا کر کاشت سے فصل حاصل کر سکیں۔ اور جب حضرت عمر -رضی اللہ عنہ-

(۱) المبسوط للسرخسي :۹/۳

(۲) المغني:۹/۳۱۶

نے ان کو دینے سے انکار کیا، تو ساتھ ساتھ ان سے یہ بھی فرمایا کہ تم لوگ محنت و مشقت کرو۔ (یہ روایت ایک صفحے کے بعد باحوالہ آ رہی ہے)

اس سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنی حاجت وضرورت کی بنا پر مانگا تھا، تو اگر یہ مسلمان تھے، تو ان کو نہ دینے کی کوئی وجہ نہیں اور نہ اس جواب کی کوئی ضرورت تھی، جو حضرت عمر نے دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ان کو نہ دینے کی وجہ حضرت عمر کے نزدیک وہی تھی، کہ اب اسلام کو قوت وشوکت حاصل ہوگئی ہے، لہذا غیر مسلمین کو اب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

لہذا ہمارے نزدیک اصح بات یہ ہے کہ حضرات شیخین نے جن کو دینے سے انکار کیا تھا اور ان کا حصہ ساقط مانا تھا، وہ غیر مسلم تھے۔ واللہ اعلم

مؤلفۃ القلوب کے سلسلے میں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ مصرف اب بھی باقی ہے، یا ختم ہوگیا؟ اس میں بھی ائمہ وعلماء کا اختلاف قدیم دور سے چلا آ رہا ہے اور اس میں دونوں طرف اکابر علماء وفقہاء گئے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ -رحمہ اللہ- اور ان کے اصحاب کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا مصرف اب باقی نہیں، ساقط ہوگیا اور جمہور کا بھی یہی قول ہے، جن میں امام شعبیؒ، امام مالک -رحمہ اللہ-، امام سفیان ثوری -رحمہ اللہ-، اور امام اسحاق بن راھویہ -رحمہ اللہ- وغیرہ حضرات ائمہ بھی داخل ہیں۔

امام محی السنہ بغوی -رحمہ اللہ- نے "شرح السنۃ" میں لکھا ہے کہ

" أَمَّا اليَوْمَ فَقَدْ أَعَزَّ اللّٰه الإِسْلَامَ بِحَمْدِ اللّٰه ، فأَغْنَاهُ عَنْ أَنْ يَتَأَلَّفَ عَلَيْهِ رِجَالٌ ، فَلا يُعْطَى مُشْرِكٌ تَأَلُّفاً بِحَالٍ . فَقَدْ قَالَ بِهٰذا كَثِيْرٌ مِنْ أَهْلِ العِلْم :إِنَّ المُؤَلَّفة مُنْقَطِعَةٌ ، وَسَهْمُهُمْ سَاقِطٌ . رُوِيَ ذٰلكَ عَنِ الشَّعْبِي، وبِهِ قَالَ مالكٌ ، والثَّورِيُّ ، وأصحابُ الرَّأي ، و إسحاقُ ".

(۱) شرح السنۃ:۹۳/۶

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق -رضی اللہ عنہ- کے دور خلافت میں جب اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن دونوں آپ -رضی اللہ عنہ- کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ ہمارے یہاں ایسی شوریلی زمین ہے، جس میں نہ کوئی گھاس پھونس اگتی ہے، نہ کوئی منفعت حاصل ہوتی ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ زمین ہمیں کھیتی باڑی کے لیے دے دیجیے؛ تا کہ اللہ ہمیں اس میں کوئی نفع دیدے، تو حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں کے لیے یہ زمین لکھ دی اور پروانہ لکھ کر اس پر حضرت عمر کو گواہ بنایا؛ مگر اس وقت حضرت عمر وہاں موجود نہیں تھے، تو وہ دونوں حضرت عمر کے پاس تصدیق کے لیے پہنچے؛ مگر حضرت عمر نے اس پر گواہ بننے اور اس کی تصدیق کرنے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ

"إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ -صلى الله عليه وسلم- كَانَ يَتَأَلَّفُكُمَا وَالْإِسْلَامُ يَوْمَئِذٍ قَلِيْلٌ (وفي رواية : ذَلِيْلٌ)، وَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَعَزَّ الْإِسْلَامَ ، فَاذْهَبَا فَاجْتَهِدَا جَهْدَكُمَا ".

(اللہ کے رسول -صلی اللہ علیہ وسلم- تمہاری تالیف قلبی اس زمانے میں کیا کرتے تھے، جب کہ اسلام کمزور حالت میں تھا، اور اب اللہ نے اسلام کو عزت دے دی ہے، لہذا تم دونوں جاؤ اور محنت و مشقت کرو۔)(۱)

یہ روایت اگر چہ کہ ضعیف ہے، جیسا کہ ابن کثیر نے مسند الفاروق میں اس کی تخریج کے بعد نقل کیا ہے؛ کیوں کہ اس میں انقطاع پایا جاتا ہے، کہ اس کے راوی حضرت عَبیدہ کا لقاء و سماع حضرت عمر سے ثابت نہیں ہے۔

مگر اس کی تصدیق و تائید دیگر متعدد روایات سے ہوتی ہے، کہ حضرت عمر -رضی اللہ عنہ- نے مؤلفۃ القلوب کے حصے کو ساقط مانا ہے۔

---

(۱) السنن الكبرى للبيهقي: ۱۳۱۸۹، تفسير ابن أبي حاتم: ۱۸۲۲/۶، مسند الفاروق لابن كثير: ۲۴۲

مثلاً امام طبریؒ نے اپنی تفسیر میں حبان بن ابی جبلہ سے روایت کیا ہے کہ عیینہ بن حصن (جو مؤلفۃ القلوب میں سے تھے) حضرت عمر۔ؓ۔ کے پاس (مال لینے) آئے تو آپ نے فرمایا کہ

" فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ، لَيْسَ الْيَوْمَ مُؤَلَّفَةٌ "

(جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے، اب مؤلفۃ القلوب کا حصہ نہیں ہے۔)(۱)

نیز امام طبریؒ، امام ابن ابی حاتمؒ اور امام ابن ابی شیبہؒ نے حضرت امام عامر شعبیؒ سے روایت کی ہے، انھوں نے فرمایا کہ

"إِنَّمَا كَانَتْ الْمُؤَلَّفَة قُلُوبُهُم عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ۔ﷺ۔، فَلَمَّا وُلِّيَ أَبُوْ بَكْرٍ انْقَطَعَتْ ."(۲)

یہ روایت بھی اگر چہ اس پائے کی تو نہیں ہے، ایک تو یہ مرسل ہے، دوسرے اس کے راویوں میں جابر جعفی ایک راوی ہیں، جن کے بارے میں محدثین کا کافی اختلاف ہے، مگر پہلی روایت کی تقویت اس سے ہوتی ہے، خصوصاً اس لیے کہ امام شعبیؒ کے مرسلات کو محدثین نے صحیح مانا ہے، یہاں تک کہ امام عجلیؒ نے کہا کہ:

"ولا يَكَادُ الشَّعْبِي يُرْسِلُ إِلَّا صَحِيْحاً ."(۳)

الغرض ان سب روایات کو دیکھا جائے، تو یہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں اور ان سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت عمر۔ؓ۔ نے مؤلفۃ القلوب کے حصے کے بارے میں یہ طے کیا کہ اب ان کو نہیں دیا جائے گا۔

(۱) تفسير الطبري:۱۶۸۵۵

(۲) مصنف ابن أبي شيبة :۱۰۷۵۹، تفسير ابن أبي حاتم : ۱۸۲۲/۶، تفسير الطبري: ۳۱۵/۱۴

(۳) تهذيب التهذيب:۶۸/۵

پھر یہاں علماء وفقہاء میں یہ اختلاف ہے کہ اس حکم کے ساقط ہونے کا مطلب کیا ہے؟ بعض نے کہا ہے کہ منسوخ ہے اور نسخ کی دلیل میں بعض نے آیت کریمہ: "فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ" کو پیش کیا ہے اور بعض نے حدیث: "تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَ تُرَدُّ إِلٰى فُقَرَائِهِم" کو پیش کیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ دلیل نسخ اگر چہ ہمارے علم میں نہیں ہے، مگر حضرت عمر کے علم میں ہوگی اور بعض نے اجماع کا ذکر کیا ہے، لیکن اس پر اشکال کیا گیا ہے۔(۱)

اور اکثر حضرات نے یہ فرمایا کہ یہ حکم منسوخ نہیں، بل کہ حضرت عمر-رضی اللہ عنہ- نے مؤلفۃ القلوب کو زکات دینے کے حکم کی اصل علت کو واضح کیا ہے، کہ شروع دور میں اسلام کمزور تھا، لہذا مؤلفۃ القلوب کو اسلام کی جانب مائل کرنے یا ان سے اسلام کو تقویت دینے کے لیے زکات کی مد سے ان کو دینے کی اجازت دی گئی تھی؛ لیکن جب اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا، تو اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ لہذا جب وہ علت بعد کے دوروں میں باقی نہیں رہی، تو وہ حکم بھی باقی نہیں رہا۔

علامہ کاسانیؒ نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر بن الخطاب-رضی اللہ عنہما- کے اس سلسلے میں فیصلے کا ذکر کر کے اس کی وجہ اس طرح بیان کی ہے کہ:

"لِأَنَّهُ ثَبَتَ بِاتِّفَاقِ الأُمَّةِ أَنَّ النَّبِيَّ كانَ يُعْطِيهِمْ لِيَتَأَلَّفَهُمْ عَلَى الإِسْلامِ. وَلِهٰذا سَمَّاهُمُ اللّٰهُ الْمُؤَلَّفَة قُلُوبُهم، والإسلامُ يَوْمَئِذٍ فِيْ ضُعْفٍ، و أَهْلُه فِيْ قِلَّةٍ، وأُوْلٰئِك كَثِيْرٌ ذُوْ قُوَّةٍ وعُدَدٍ، واليَوْمَ بِحَمْدِ اللّٰهِ عَزَّ الإِسْلامُ وَكَثُرَ أَهْلُه، واشْتَدَّتْ دَعَائِمُه ورَسَخَ بُنْيَانُه، وصَارَ أَهلُ الشِّرْك أَذِلَّاء. والحُكْمُ

(۱) مستفاد من فتح القدير :۲/۲۶۴، البناية :۳/۵۲۳، النهر الفائق: ۱/۴۵۹، الدر المختار مع الشامي: ط۳/۲۸۷-۲۸۸

مَتٰی ثَبَتَ مَعْقُولاً بِمَعْنٰی خَاصٍّ یَنْتَھِيْ بِذَھَابِ ذٰلِکَ المَعْنٰی ". (۱)

اور علامہ ابن نجیم المصری -رحمہ اللہ- نے "البحر الرائق" میں اور انھی کے حوالے سے علامہ شامی -رحمہ اللہ- نے "الرد المحتار" میں فرمایا کہ

"وھُوَ مِنْ بَابِ انْتِھَاءِ الحُکْمِ لانْتِھَاءِ عِلَّتِه الغَائِیَةِ الَّتِي کَانَ مِنْ أجلِھَا الدَّفْعُ ، فإنَّ الدَّفْعَ کَانَ لِلاعْزَازِ وَقَدْ أعَزَّ اللّٰهُ الإسْلامَ وأغْنَی عَنْھُمْ ". (۲)

لیکن اس پر علامہ ابن الہمامؒ نے ایک اشکال کیا ہے، وہ یہ کہ علت ختم ہو جانے سے حکم کا ختم ہو جانا لازم نہیں ؛ کیوں کہ کسی حکم کے بقاء کے لیے اس کی علت کا بقاء ضروری نہیں ؛ دیکھو طواف میں اضطباع اور رمل کی علت تو باقی نہیں ہے، لیکن یہ حکم اب بھی باقی ہے۔ (۳)

مگر اس کا عمدہ جواب علامہ ظفر احمد عثمانی نے "إعلاء السنن" میں بعض علماء سے نقل کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ بقائے حکم کے لیے بقائے علت ضروری نہیں ؛ لیکن اصل یہی ہے کہ جب علت منتفی ہو جائے، تو حکم بھی منتفی ہو جائے، ہاں! کسی مستقل دلیل سے علت کے منتفی ہونے کے باجود حکم کا بقاء ثابت ہو جائے، تو وہ حکم باقی رہے گا۔ (۴)

الغرض اکثر علماء کے نزدیک چوں کہ مؤلفۃ القلوب کو دینے کا حکم ایک علت پر مبنی تھا اور وہ علت بعد کے دوروں میں جب کہ اسلام کو قوت و غلبہ حاصل ہو گیا، ختم ہو گئی، لہذا وہ حکم بھی منتفی ہو گیا۔

اس لحاظ سے یہ حکم محض موقوف ہوا ہے ؛ کیوں کہ جو علت تھی، وہ اس دور میں باقی نہ رہی ؛ لیکن اگر کسی دور میں دوبارہ وہ علت لوٹ آئے اور یا کسی جگہ ایسے حالات پیدا

---

(۱) بدائع الصنائع:۲/۴۷۰

(۲) البحر الرائق:۲/۴۱۹، شامي:۳/۲۸۸

(۳) فتح القدیر :۲/۲۶۴

(۴) إعلاء السنن:۸/۸۴

ہوجائیں،تو کیا وہ حکم بھی دوبارہ لوٹ آئے گا؟

اس میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے،اقوال دونوں قسم کے ہیں ، تاہم ایک بڑی جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ حکم اس کی علت کے منتفی ہونے سے موقوف ہوا ہے،اس لیے اگر کبھی حالات تقاضا کریں،تو یہ حکم مؤلفۃ القلوب کو دینے کا پھر جاری ہوسکتا ہے۔

علامہ ابوالولید ابن رشد مالکی-رحمہ اللہ- لکھتے ہیں کہ

"اخْتُلِفَ هَلْ يَعُوْدُ ذلک السَّهْمُ إن احْتِيْجَ إلَيْهِ أم لا ؟ فَرَأى مَالکٌ أنَّه لا يَعُوْدُ ، وهو مَذْهَبُ أهْلِ الكُوْفَةِ ، و قَدْ قِيْلَ: إنَّه يَعُوْدُ إن احْتِيْجَ إلَيْهِ ، ورَأى ذٰلِکَ الإمامُ ، وهُوَ قَوْلُ ابن الشِّهَاب وعُمَر بنِ عِبْدِ العَزِيْز وإلَيْهِ ذَهَبَ الشَّافَعِيُّ". (۱)

علامہ ابن عبدالبر المالکی-رحمہ اللہ-اس مسئلے پر"الكافي في فقه أهل المدينة" میں لکھتے ہیں کہ

"وقَدْ سَقَطَ مِنْهَا حَقُّ المُؤَلَّفة قُلُوْبُهم ؛ لأنَّ اللّٰه تعالٰى قَدْ أغْنٰى الإسلامَ وأهْلَه عن أنْ يَتَألَّفَ عَليه اليومَ أحَدٌ ، وَلَو اضْطَرَّ الإمَامُ فِيْ وقتٍ مِنَ الأوقاتِ أنْ يتألَّفَ كَافِراً يُرْجٰى نَفْعُه و تُخْشٰى شَوْكَتُه جَازَ أنْ يُعْطِي مِنْ أمْوَالِ الصَّدَقَات". (۲)

امام شافعی کے مسلک میں بھی ایک قول یہ ہے کہ ضرورت پڑنے پر مؤلفۃ القلوب کو دیا جاسکتا ہے، پھر ان میں سے بعض حضرات نے یہ شرط لگائی ہے کہ دینے کا جواز اس وقت ہے کہ امیر المؤمنین اس کو تقسیم کرے اور بعض نے یہ کہا کہ اگر کوئی حادثہ و پریشانی

(۱) البيان و التحصيل:۳۵۹/۲

(۲) الكافي في فقه أهل المدينة :۱۱۴/۱

مسلمانوں کو پیش آئی ہو، تو ضرورت پر مؤلفۃ القلوب کو دے سکتے ہیں۔ (۱)

اور حنابلہ کے یہاں یہ مؤلفۃ القلوب کو دینے کا حکم جاری ہے، نہ منسوخ، نہ موقوف، اور حضرات خلفائے رشدین نے ان کو اس لیے نہیں دیا تھا کہ ضرورت نہیں تھی، لہذا جب بھی ضرورت پڑے تو مؤلفۃ القلوب کو دیا جاسکتا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی –رحمہ اللہ– "الکافی" میں لکھتے ہیں کہ

"وتَرْكُ عُمَرَ وعُثْمَانَ عَطِيَّتَهُمْ إنَّمَا كانَ لِغِنَاهُمْ عَنْهُمْ، والمُؤَلَّفَة إنَّمَا يُعْطَوْنَ لِلْحَاجَة إلَيْهِمْ، فإنِ اسْتُغْنِيَ عَنْهُم فَلاَ شَيْءَ لَهُمْ". (۲)

اسی طرح "المغنی" میں بھی علامہ ابن قدامہ –رحمہ اللہ– نے بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ امام احمد –رحمہ اللہ– کا مذہب یہی ہے کہ یہ حکم ساقط نہیں ہے اور حنبل نے جو قول امام احمد سے ساقط ہونے کا ذکر کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ضرورت نہ ہونے سے یہ حکم ساقط ہوگیا، یا یہ مراد ہے کہ آج کل امیر و حاکم لوگ ان کو نہیں دیتے ہیں؛ لیکن اگر ضرورت پڑے، تو ان کو دینا جائز ہے، اور بلاضرورت کے دینا جائز نہیں ہے۔ (۳)

اس سلسلے میں فقہائے حنفیہ کی کوئی تصریح مجھے نہیں ملی، البتہ امام ابن رشد المالکی –رحمہ اللہ– نے "بدایۃ المجتہد" میں امام ابوحنیفہ –رحمہ اللہ– اور امام شافعی –رحمہ اللہ– دونوں کی جانب یہ بات منسوب کی ہے کہ یہ مصرف آج بھی باقی ہے، اگر امیر المؤمنین اس کی ضرورت سمجھتے ہوں۔

ان کے الفاظ یہ ہیں:

---

(۱) دیکھو: أسنى المطالب: ۱/۳۹۵، الغرر البهية في شرح البهجة الوردية: ۴/۷۳، حاشية الجمل على شرح المنهج: ۴/۹۹، كفاية النبيه في شرح التنبيه: ۶/۱۶۲

(۲) الكافي: ۲/۱۹۸

(۳) المغني: ۹/۳۱۶

”وَقَالَ الشَّافِعِيُّ و أبُو حَنِيفَة : بَل حَقُّ المُؤَلَّفَة باقٍ إلى اليَوْمِ إذَا رَأى الإمامُ ذٰلِکَ“. (۱)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی -رحمہ اللہ- کے کلام میں سے ایسا ہی مستفاد ہوتا ہے کہ وہ بھی اس مد کے باقی ہونے کے قائل ہیں؛ کیوں کہ آپ نے زکات کے مصارف کے اسرار بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مصارف مختلف قسم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مشروع ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک ضرورت یہ بیان کی ہے کہ اہل اسلام کے مابین پیدا ہونے والے فتنوں کو دور کرنے ، یا غیر مسلمین کی جانب سے اہل اسلام کے خلاف جو فتنے رونما ہونے کا خطرہ ہو، ان کو دفع کرنے کے لیے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور ان سب کو مؤلفۃ القلوب کا لفظ حاوی ہے۔ (۲)

موجودہ دور کے بعض اہل علم وفضل نے بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ مؤلفۃ القلوب کو دینے کا حکم ضرورت پڑنے پر لوٹ آئے گا۔

دار العلوم دیوبند کے محدث حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری -رحمہ اللہ- نے بھی اس قسم کی بات کا اظہار کیا ہے۔ چناں چہ وہ اپنی کتاب ”تحفۃ الالمعی شرح سنن ترمذی“ میں فرماتے ہیں کہ

> ”جب ائمہ کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا حصہ موقوف ہوگیا ہے، اصح قول کے مطابق ان کے نزدیک یہ مصرف منسوخ نہیں ہوا، بل کہ وہ معلول بہ علت ہے؛ کیوں کہ نبی کریم -صلی اللہ علیہ وسلم- کے بعد نسخ نہیں ہوسکتا اور علت چوں کہ ضعف اسلام تھی، اس لیے جب یہ علت ختم ہوگئی، تو یہ مصرف بھی ختم ہوگیا؛ لیکن اگر قیامت سے پہلے کبھی یہ علت لوٹ آئے جیسا کہ

(۱) بداية المجتهد :۷٦/۲

(۲) حجة الله البالغة:٦٩/۲

حدیث میں ہے کہ

«بَدَأَ الإِسْلَامُ غَرِيْباً وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ» (یعنی اسلام کس میرسی کی حالت میں شروع ہوا ہے اور آئندہ اس کا وہی حال ہو جائے گا جو شروع میں تھا) پس اگر دور اول کی طرح کفار کی دل جوئی کا محتاج ہو جائے، تو مؤلفۃ القلوب کا حصہ دوبارہ شروع ہو جائے گا۔"(۱)

اسی طرح حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی –حفظہ اللہ تعالیٰ– نے بھی حنابلہ کے قول کو موجودہ حالات میں راجح قرار دیا ہے، جو اس مد کے باقی رہنے کے قائل ہیں۔

آپ نے اپنی "آسان تفسیر" میں آیت صدقات کے تحت لکھا ہے کہ

"یہ مد باقی ہے، یا ختم ہو گئی؟ اس سلسلے میں حنفیہ اور مالکیہ کی رائے ہے کہ اب یہ مد باقی نہیں رہی، حنابلہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ مد باقی ہے اور بوقت ضرورت اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اور امام شافعی سے دونوں طرح کی رائیں منقول ہیں۔ موجودہ حالات میں حنابلہ کا قول شریعت کے مقاصد و مصالح سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کا رجحان بھی اسی طرف ہے"۔ (۲)

احقر کے نزدیک بھی یہی راجح ہے کہ یہ مد موقوف ہوئی تھی، ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے، لیکن اگر کبھی اور کہیں پھر وہ ضرورت پیش آجائے، تو حکم بھی لوٹ آئے گا؛ مگر یہاں ایک خاص بات کی طرف توجہ لازم ہے کہ چوں کہ اس مد سے مقصود اسلام و اہل اسلام کا تحفظ و ترقی ہے؛ تاکہ غیر لوگ مسلمانوں کے اس تعاون و ہمدردی کی وجہ سے اسلام میں رکاوٹ نہ بنیں اور اہل اسلام کو پریشان نہ کریں اور وہ اسلام کی جانب رغبت کریں، لہذا جہاں اور

(۱) تحفة الألمعي: ۲/۵۹۱-۵۹۲
(۲) آسان تفسیر: ۱/۵۷۸

جن کو دیا جائے وہاں اس کا خاص لحاظ ہونا چاہیے کہ یہ مقصد پورا ہو، ایسا نہ ہو کہ ایک جانب ہمارا مال ان کو دیا جائے اور دوسری جانب وہ لوگ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف سازشوں کو خود ہمارے ہی مال سے مضبوط کریں۔

پانچواں مصرف-غلاموں کو آزاد کرنا

آیت مذکورہ میں پانچواں مصرف بیان کیا گیا ہے: " وَ فِيْ الرِّقَابِ "، (یعنی غلام کو چھڑانے میں زکات خرچ کرنا۔)

جمہور علماء کے نزدیک اس سے مراد وہ غلام ہے، جس کو اس کے آقا نے ایک مقررہ رقم دینے کی شرط پر آزاد کردینے کا وعدہ کیا ہو، جس کو فقہاء مکاتَب غلام کہتے ہیں، ایسے غلام کو زکات کی رقم دے کر اس کو آزاد کرنے میں مدد کرنا جائز ہے۔ باقی عام غلام کو خرید کر آزاد کرنا، یا ان کے آقاؤں کو زکات کی رقم دے کر ان سے یہ معاہدہ کرلینا کہ وہ ان کو آزاد کردیں گے، اس میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء وفقہاء کے نزدیک یہ درست نہیں ہے، جب کہ امام مالک کی ایک روایت اس کے جواز کی ہے۔

امام ابن قدامہ حنبلی-رحمہ اللہ- لکھتے ہیں کہ

"لا نَعْلَمُ بَيْنَ أهل العِلْمِ خِلافاً في ثُبُوتِ سَهْمِ الرِّقَاب ولا يَخْتَلِفُ المَذْهَبُ فِيْ أنَّ المُكاتَبِيْن مِنَ الرِّقَاب يَجُوْزُ صَرْفُ الزّكَاةِ إِلَيْهِمْ، وهو قَوْلُ الجُمْهُور، وخَالَفَهُمْ مَالكٌ." (۱)

امام نووی نے "المجموع شرح المهذب" میں لکھا ہے کہ

" قال الشَّافِعِيُّ والأصحابُ : يُصْرَفُ سَهْمُ الرِّقَابِ إلى المُكَاتَبِيْن، هٰذا مَذْهَبُنَا، وبِه قَالَ أكْثَرُ العُلَمَاء . كذا

(۱) المغني:۳۱۹/۹، باب قسمة الفئ والغنيمة والصدقة

نَقَلَه عن الأكْثَرِيْنَ البَيْهَقِيُّ فِيْ السُنَن الكَبِيْر والمُتَوَلِّي . وبِهِ قَالَ عَلِيُّ بنُ أَبِيْ طَالِب-رضي الله عنه - وسعيدُ بنُ جُبَيْر ، و الزُّهْرِيُّ، واللَّيْثُ بنُ سَعْد ،والثَّوْرِيُّ ، وأبُوحَنِيْفَةَ وأصْحابُه .
وقالت طائفةٌ : المُرَادُ بِالرِّقَابِ أنْ يُشْتَرٰى بِسَهْمِهِمْ عَبِيْدٌ ويُعْتَقُوْنَ، و به قَالَ مَالِكٌ " .(۱)

چھٹا مصرف-قرض دار

چھٹا مصرف ہے:"الغَارِمِيْنَ "(وہ لوگ جن پر قرض ہو، اوران کے پاس اس قرض کو ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو، ان کو زکات کی مد سے دیا جاسکتا ہے؛ تاکہ وہ اپنا قرض ادا کرسکیں۔)

یہ لفظ غارم کی جمع ہے اوراس سے کیا مراد ہے، اس میں اکثر حضرات فقہاء کہتے ہیں کہ مدیون وقرض دار مراد ہے۔

ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ:

"والغارمين: وهُمُ المَدِيْنُوْنَ العَاجِزُوْن عنْ وَفَاء دُيُوْنِهِم. هذا الصِّنْفُ السَّادِسُ منْ أَصْنَافِ مَصَارِفِ الزَّكاةِ . ولا خِلافَ فِيْ اسْتِحْقَاقِهِمْ ، وثُبُوْتِ سَهْمِهِمْ ، وأنّ المَدِيْنِيْن العَاجِزِيْن عن وفاءِ دُيُوْنِهِم مِنْهُم". (۲)

علامہ کاسانی -رحمه الله- کی "بدائع الصنائع" میں ہے کہ

"قِيلَ : الغَارِمُ الَّذِيْ عَلَيْه الدَّيْنُ أكثر مِنَ المَالِ الَّذيْ في يَدَيْه ، أو مثله ، أو أقلّ منه ؛ لكنّ مَا وَرَاءَ ه لَيْسَ بِنِصَابٍ ".

(۱) المجموع :۶/۱۸۴

(۲) المغني:۹/۳۲۳

(۳) بدائع الصنائع:۲/۴۷۱

اور امام شافعی۔ رحمہ اللہ۔ کے یہاں اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ جس نے اپنے ذمے کسی مقتول کی دیت لگالی ہو، یا کسی فتنے کو فرو کرنے کے لیے اپنے اوپر کوئی مالی ذمے داری لے لی ہو۔(۱)

قرض دار کو معاف کرنے سے زکات ادا نہیں ہوتی

یہ مسئلہ تو معلوم ہو گیا کہ کسی قرض دار کو زکات دی جا سکتی ہے، مگر ایک بات یہاں یہ سمجھنا ہے کہ اگر کسی کو قرض دیا تھا اور اس نے وہ قرض ادا نہیں کیا، تو اس قرض کو معاف کر دینے سے زکات ادا نہیں ہوتی اور وہ قرض جو معاف کیا گیا وہ زکات میں شمار نہیں ہوتا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ زکات دیتے وقت زکات دینے کی نیت لازم ہے، یہاں اس صورت میں قرض دیتے وقت زکات دینے کی نیت نہیں تھی، لہذا وہ رقم زکات میں شمار نہ ہوگی۔

علامہ شرنبلالی۔ رحمہ اللہ۔ "مراقي الفلاح" میں لکھتے ہیں کہ

"ولا يُجزِئُ عن الزَّكاةِ دَيْنٌ أبْرِئَ عنه فَقِيرٌ بِنِيَّتِهَا".(۲)

"فتاوی ہندیہ" میں لکھا ہے کہ

"رَجُلٌ له على فَقِيرٍ مالٌ، و أرَادَ أنْ يَتَصَدَّقَ بِمَالِه على غَرِيْمِه وَ يَحْتَسِبَ به عنْ زَكَاتِه، فَقَدْ عُرِفَ من أصْل أصْحَابِنَا ۔ رحمهم الله ۔ أنَّه لا يَتَأَدّى بِالدَّيْنِ زَكاةُ العَيْن ولا زكاةُ دَيْنٍ آخَرَ".(۳)

ہاں! اگر زکات نکالنے والا اپنی زکات اس شخص کو دیدے، جو اس کا مقروض ہے اور پھر اس سے اپنا قرضہ وصول کر لے، تو جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

چناں چہ "فتاوی ہندیہ" میں لکھا ہے کہ

"والحِيلَةُ فِيْ ذٰلکَ أنْ يَتَصَدَّقَ صَاحِبُ المَالِ عَلٰى

---

(۱) المجموع :۶/۱۹۰

(۲) مراقي الفلاح: ۲۶۲

(۳) الفتاوى الهندية :۶/۳۹۲، كتاب الحيل/الفصل الثالث في مسائل الزكاة

الغَرِيْمِ بِمِثْلِ مَا لَهُ عَلَيْه مِنَ المَالِ العَيْن نَاوِياً عنْ زَكاةِ مَالِه وَيَدْفَعَه إلَيْه ، فإذَا قَبَضَه الغَرِيْمُ وَدَفَعَه إلى صَاحِبِ المَالِ قَضَاءً بِمَا عَلَيْه مِنَ الدَّيْنِ يَجُوْزُ ". (۱)

اسی طرح دیگر فقہاء لکھتے ہیں کہ

" وَحِيْلَةُ الجوَاز أَنْ يُعْطِيَ مَدْيُوْنَه الفَقِيرَ زَكَاتَه ، ثُمَّ يَأخُذَهَا عَنْ دَيْنِه ". (۲)

ساتواں مصرف-"فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"

آیت زیر بحث میں ساتواں مصرف "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے، یعنی اللہ کے راستے میں زکات دینا۔

یہاں "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں فقہائے کرام کے تین اقوال ہیں:

(۱) اکثر علماء وفقہاء نے کہا کہ اس سے وہ شخص مراد ہے، جو جہاد میں جانا چاہتا ہے، مگر اس کے پاس سواری، یا ہتھیار، وغیرہ سامان جہاد نہیں ہے، تو اس کو جہاد میں جانے کے لیے زکات کی رقم دی جاسکتی ہے۔علما میں سے ایک جم غفیر نے اسی کو مختار قرار دیا ہے، کیوں کہ "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کا لفظ قرآن وحدیث کے اکثر استعمالات میں جہاد ہی کے معنی میں آتا ہے؛ لہذا یہاں بھی اس کا یہی مفہوم ہونا چاہیے۔

امام جمال الدین الصردفی الریمی نے " **المعاني البديعة في معرفة اختلاف أهل الشريعة** " میں لکھا ہے کہ

"عِنْدَ الشَّافِعِيّ ومالكٍ و أبيْ حَنِيْفَةَ و أكثرِ العُلَمَاء أنَّ

(۱) الفتاوى الهندية :أيضاً

(۲) الدر المختارمع رد المحتار :۱۹۱/۳، الطحطاوي على المراقي:۷۱۵

سَبِيْلَ اللّٰه المَذكُوْر فِيْ الآيَةِ هُمُ المُجَاهِدُوْن الَّذِيْن يَغْزُوْنَ إذَا نَشَطُوْا دُوْنَ المُرْتَزِقِيْن المُرَتَّبِيْنَ فِي دِيْوَانِ السُّلطَانِ . وَلا يُصْرَفُ إلٰى سَائِرِ وُجُوهِ القُرَبِ ، وبه قال مِنَ الزَّيْدِيَّة النَّاصِرُ". (۱)

پھر یہاں علماء میں سے بعض فقر کی شرط لگاتے ہیں کہ اگر وہ مجاہد وغازی فقیر ہو، تو اس کو زکات سے دے سکتے ہیں، یہی امام ابوحنیفہ -رحمہ اللہ- اور صاحبین -رحمہما اللہ- کا مسلک ہے اور بعض حضرات یہاں فقر کی شرط نہیں لگاتے، وہ کہتے ہیں کہ خواہ فقیر ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں غازی کو زکات دے سکتے ہیں، یہی امام شافعی، امام مالک، امام اسحاق بن راہویہ وغیرہ کا مسلک ہے۔

امام ابن قدامہ -رحمہ اللہ- کہتے ہیں کہ

"وهُمُ الغُزَاةُ ، يُعْطَوْنَ مَا يَشْتَرُوْنَ به الدَّوَابَّ والسِّلاحَ ومَا يُنْفِقُوْنَ بِهِ عَلَى العَدُوِّ ؛ وإنْ كَانُوْا أغْنِيَاءَ ....، و لاخِلاَفَ فِيْ اسْتِحْقَاقِهِمْ وَبَقَاءِ حُكْمِهِمْ . ولَا خِلَافَ في أَنَّهُمُ الغُزَاةُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؛ لأنَّ سَبِيْلَ اللّٰه عندَ الإطلاقِ هُو الغَزْو............وبِهٰذَا قَالَ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ ، وإسحاقُ، وأبُو ثَوْر، وأبُو عُبَيْد ، وابنُ المُنْذِر.وقَالَ أبُو حَنِيْفَةَ ، و صاحِبَاهُ : لا تُدْفَعُ إلَّا إلَى فَقِيْرٍ ."(۲)

(۲) بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے وہ شخص مراد ہے، جس پر حج فرض ہوگیا تھا؛ مگر اس نے کسی وجہ سے حج نہیں کیا اور بعد میں وہ فقیر ہوگیا، تو اس کو اپنا حج فرض ادا کرنے کے لیے مال زکات میں سے دیا جاسکتا ہے۔

صحابہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس -رضی اللہ عنہ- اور حضرت عبد اللہ بن عمر -رضی اللہ عنہ- سے یہ قول مروی ہے اور ائمہ میں سے امام اسحاق بن راہویہؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور

(۱) المعاني البديعة :۳۱۲/۱

(۲) المغني :۳۲۶/۹

اور حنفیہ میں سے امام محمدؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

امام ابن قدامہ۔ رحمہ اللہ۔ نے لکھا ہے کہ

”ویُعْطٰی أیْضاً في الحَجِّ وهو فِيْ سَبِيْلِ اللّٰه ، ويُرْوٰى هٰذا عن ابن عَبَّاسٍ ، وعن ابن عُمَر:الحَجُّ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰه وهُو قَوْلُ إسْحَاق“. (۱)

اور ”بدائع الصنائع“ میں ہے کہ

”وقَالَ مُحَمَّدٌ : المُرَادُ منه الحَاجّ المُنْقَطِع لِمَا رُوِيَ : أنَّ رَجُلاً جَعَلَ بَعِيْراً لَه فِيْ سَبِيْلِ اللّٰه ، فأمَرَه النَّبِيُّ ۔ﷺ۔ أنْ يُحْمَلَ عَلَيْه الحَاجُّ“ . (۲)

(۳) بعض علماء کہتے ہیں کہ جو لوگ دینی کاموں میں مصروف ہیں اور وہ محتاج ہیں، ان کو بھی زکات میں سے دیا جا سکتا ہے، جیسے طالب علم، جو دینی و علمی کاموں میں لگا ہوا ہے، مگر وہ محتاج ہے، تو اس کو بھی زکات دے سکتے ہیں۔

علامہ کاسانی۔ رحمہ اللہ۔ نے فرمایا کہ

” وأمَّا قَولُه تَعَالى:﴿ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ عِبَارةٌ عنْ جَمِيْعِ القُرَب ؛ فَيَدْخُلُ فيه كُلُّ مَنْ سَعٰى فِيْ طَاعَةِ اللّٰه ، وسَبِيْلِ الخَيْرَاتِ إذَا كَانَ مُحْتَاجاً “ . (۳)

مصرف ”فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ“ کی دو وضاحتیں

اس تفصیل کے بعد یہاں دو باتوں کی وضاحت کر دینا ضروری ہے:

(۱) المغني:۹/۳۲۸

(۲) بدائع الصنائع: ۲/۴۷۲

(۳) بدائع الصنائع:۲/۴۷۱

ایک تو یہ کہ ﴿ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ کا لفظ تو عام ہے؛ مگر اس کی مراد عام نہیں ہے، بلکہ خاص ہے؛ کیوں کہ اگر پہلا اور دوسرا قول لیتے ہیں، تب تو ظاہر ہے کہ فقہاء نے اس عام لفظ سے خاص مراد لے کر بتا دیا کہ اس سے مراد عام معنی نہیں ہیں۔ اور اگر یہاں بعض فقہاء کے مطابق تیسرا قول لیتے ہیں، جس میں ایک طرح کا عموم مراد لیا گیا ہے، تب بھی اتنی بات واضح ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی اس میں کچھ نہ کچھ تخصیص ہے، ایسا نہیں کہ "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" میں ہر طرح کی دینی و شرعی ذمے داریاں اور ملی و انسانی خدمات داخل ہوں؛ کیوں کہ ان حضرات نے خود یہ وضاحت کر دی ہے کہ مساجد کی تعمیر، پلوں اور سڑکوں کی تعمیر، یا مرمت وغیرہ میں زکات نہیں خرچ کی جا سکتی، جیسا کہ خود صاحب بدائع سے اوپر نقل کر چکا ہوں، تو وہ خود کس طرح یہاں اس سے عام مفہوم مراد لے سکتے ہیں؟

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب اس سلسلے میں معارف القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ

> لفظ "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کے لفظی معنی بہت عام ہیں، جو جو کام اللہ کی رضا جوئی کے لیے کیے جائیں، وہ سب اس عام مفہوم کے اعتبار سے "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" میں داخل ہیں۔ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی تفسیر و بیان اور ائمہ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر محض لفظی ترجمے کے ذریعے قرآن سمجھنا چاہتے ہیں، یہاں ان کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ لفظ "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" دیکھ کر زکات کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کر دیا، جو کسی حیثیت سے نیکی، یا عبادت ہیں، مساجد، مدارس، شفاخانوں، مسافر خانوں وغیرہ کی تعمیر، کنویں، پل اور سڑکیں بنانا اور ان رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات، ان سب کو انھوں نے "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" میں داخل کر کے مصرف زکات قرار دے دیا، جو سراسر غلط ہے اور اجماع امت کے خلاف ہے"۔ (۱)

(۱) معارف القرآن: ۴/ ۴۰۷

دوسری بات یہ کہ ''فی سبیل اللہ'' میں جو تین قول ہیں، ان میں اکثر تو پہلے قول کو لیتے ہیں اور بعض دوسرے کو اور بعض تیسرے قول کو اختیار کرتے ہیں، مگر اس مصرف کے تحت جن جن کو بھی دینے کی بات کی گئی ہے، فقہاء حنفیہ کے نزدیک ان سب میں ایک شرط ملحوظ ہے کہ وہ حاجت مند ہوں، اگر وہ حاجت مند نہیں ہیں، تو ان کو نہیں دے سکتے۔

دینی کام میں لگے فقرا لوگ زکات کا افضل ترین مصرف

اس کے بعد یہاں ایک نکتہ لائق فہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکات کے مصارف میں ''فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کا ذکر کرتے ہوئے اس میں لفظ '' في ''کا دوبارہ استعمال کیا ہے، جب کہ اس سے پہلے کے دو مصارف '' في الرقاب والغارمين'' میں شروع میں بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس لیے یہاں بغیر ''في'' کے بھی یہ کہا جا سکتا تھا: ''سَبِيْلِ اللّٰهِ''، اس میں ایک خاص نکتہ ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی لکھتے ہیں کہ

> ''تفسیر کشاف میں ہے کہ اس لفظ کو دہرانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مصرف دیگر اور مصارف سے افضل وبہتر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں ہمیں دو فائدے ہیں: ایک تو غریب مفلس کی امداد، دوسرے ایک دینی خدمت میں اعانت۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ زکات عام فقراء و مساکین اور غلاموں کو چھڑانے اور قرض داروں کے قرض چکانے میں دینا بھی بہت اچھا کام ہے، مگر ان سب میں افضل و بہتر یہ ہے کہ ان حاجت مندوں اور ضرورت مندوں کو دیا جائے جو دینی کام میں لگے ہیں، اس میں ایک تو ان محتاج لوگوں کی مدد و نصرت ہوگی اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ دینی خدمات کو باقی رکھنے اور ترقی دینے میں اعانت و مدد ملے گی۔

---

(۲) مستفاد از معارف القرآن: ۴/۴۰۶

اس سے معلوم ہوا کہ مدارس کے طلبہ کو زکات دینا افضل و بہتر کام ہے اور یہ زکات کا سب سے افضل مصرف ہے؛ کیوں کہ ان کے ذریعے محتاج طلبہ کی امداد بھی ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ مدارس کا دینی و عملی نظام باقی رہتا ہے اور دین زندہ رہتا ہے؛ کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ دین اور علم دین کے بقاء کا سب سے بڑا سامان یہی مدارس اسلامیہ ہیں، جہاں قرآن وحدیث کی تعلیم ہوتی ہے، جہاں ان کی تشریح ہوتی ہے، جہاں ان پر عمل کا سبق دیا جاتا ہے، اور ان میں حفاظ وقراء، علماء وفقہاء، محدثین ومفسرین پیدا ہوتے ہیں اور اپنی زندگیاں دین کے لیے وقف کر کے دین کی حفاظت واشاعت کا کام کرتے رہتے ہیں؛ اس لیے مدارس کے طلبہ کو زکات دینا تمام مصارف میں سے افضل ہے۔

آٹھواں مصرف-مسافر

آیت کریمہ میں بیان کردہ آٹھواں مصرف ''ابنُ السَّبِیْل'' ہے، ابن السبیل مسافر کو کہتے ہیں، معلوم ہوا کہ مسافر کو بھی زکات دی جاسکتی ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ جو مسافر اپنے پاس وطن میں مال رکھنے کے باوجود سفر میں بقدر ضرورت مال نہیں رکھتا، تو چوں کہ فی الحال وہ ضرورت مند ومحتاج ہے؛ اس لیے اس کو بھی زکات کی رقم میں سے دے سکتے ہیں۔

علامہ کاسانی-رحمہ اللہ-کی ''بدائع الصنائع'' میں ہے کہ

"وأمَّا قَولُه تعالیٰ :﴿ وابن السَّبِيْلِ ﴾ فهو الغَرِيْبُ المُنْقَطِع عنْ مَالِهِ ، و إنْ كَانَ غَنِيّاً فِيْ وَطْنِه ؛ لأنَّه فَقِيْرٌ في الحَال " .(۱)

الحمد للہ! یہاں تک آیتِ صدقات کی فقہی لحاظ سے مختصر تفسیر پیش کی گئی، جس سے آٹھوں مصارف زکات کی تفصیل واضح ہوگئی۔

---

(۱) بدائع الصنائع:۲/۴۷۳

مصارف زکات کے بارے میں چند امور کی وضاحت و تفصیل

جب زکات کے بارے میں یہ معلوم ہو گیا کہ اس کے مستحق کون کون ہوتے ہیں، تو یہاں اس سلسلے میں اب چند باتیں جان لینا ضروری ہے۔

مصارف زکات میں حاجت و غربت علت ہے

ایک یہ کہ فقہائے حنفیہ کے مطابق یہ سارے مصارف وہ ہیں، جن میں انسانوں کی بنیادی حاجت وضرورت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، لہٰذا حاجت مندی ومحتاجی کا لحاظ کیے بغیر کسی کو زکات دینا جائز نہیں ہے۔ اگرچہ کوئی اچھا کام ہی کیوں نہ ہو، جیسے بعض لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بعض طلبہ (اسٹوڈنٹس) کو اعلی تعلیم، جیسے ڈاکٹر بننے، یا انجینئر بننے کے لیے اسکالرشپ (Scholarship) کے طور پر زکات دیتے ہیں۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ اگر وہ اسٹوڈنٹ غریب ہے، تو درست ہے؛ لیکن اگر وہ ضرورت مند ومحتاج نہیں ہے، یعنی وہ خود اپنے پاس اتنا مال رکھتا ہے کہ شرعاً وہ مالدار کہلاتا ہو، مگر صرف اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کو ڈونیشن باندھنے رقم کی ضرورت ہو، تو اس کو زکات دینا جائز نہیں ہے۔ مجھے بعض لوگوں کا یہ عمل معلوم ہوا کہ وہ کالج کی اعلی تعلیم کے لیے لاکھوں کا ڈونیشن زکات سے بھرتے ہیں، جب کہ وہ اسٹوڈنٹ خود اپنی جگہ شرعاً مالدار بھی ہوتا ہے، مگر اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے زکات دیتے ہیں؛ لہٰذا یہاں ضروری ہے کہ پہلے اس کا اطمینان کر لیا جائے کہ وہ لوگ مستحق ومحتاج ہیں، پھر اگر وہ محتاج ہیں تو ان کو دیا جائے۔

مصارفِ زکات اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر ہیں

دوسرا مسئلہ یہاں یہ سمجھنا ہے کہ زکات کے جو مصارف بیان کیے گئے، صرف انہی

میں زکات کو لگانا درست ہے، ان کے علاوہ اپنی مرضی سے کسی اور مصرف میں لگانا جائز نہیں، جیسا کہ پہلے بھی تفصیل سے عرض کیا جاچکا ہے۔

زکات پہلے اپنے قریبی محتاجوں کو دیں بعد میں دوسروں کو

تیسری بات یہ سمجھیے کہ زکات کی رقم نکالنے کے بعد سب سے پہلے ان کو دینا اچھا ہے جو اپنے ہی علاقے میں محتاج وضرورت مند ہوں۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ حضرت رسول کریم۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ نے فرمایا کہ

« تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَ تُرَدُّ إِلَى فُقَرَائِهِمْ »

(ان کے مالداروں سے لی جائے اور انھی کے غریبوں میں لوٹا دی جائے۔)

اسی لیے بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ بلاضرورت ایک شہر کی زکات دوسری بستی میں نہ بھیجی جائے؛ بل کہ اسی بستی اور علاقے کے فقراء اس کے زیادہ حق دار ہیں۔

ہاں اگر دوسری بستی کے لوگ زیادہ محتاج ہوں، تو دوسری جگہ بھی زکات کی رقم بھیج سکتے ہیں، اسی طرح اگر اپنے رشتہ دار دوسری بستی میں رہتے ہوں، تو ان کو بھی دوسری بستی میں زکات بھیجنا بلا کراہت جائز ہے، نیز باہر کے لوگ اگر اپنے یہاں کے لوگوں سے زیادہ علم وتقوی میں بڑھے ہوئے ہوں، یا اہل اسلام کو ان سے زیادہ فائدہ ہو، تو ان کو دینا بھی بلا کراہت جائز ہے۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ

"ويُكرَهُ نَقْلُ الزكاةِ مِنْ بَلَدٍ إلى بَلَدٍ ، وإنَّمَا يفرقُ صَدَقَةُ كُلِّ فَرِيقٍ فيهم.........، إلَّا أنْ يَنْقُلَهَا الإنسانُ إلى قَرَابَتِه". (۱)

---

(۱) الهداية :۲۲۹/۲

اور "درر الحكام" میں ہے کہ

"(وَكُرِهَ) نقلُهَا إلى بلدٍ آخَرَ ؛ لأنَّ فيه تفويتَ حَقِّ الجَوَارِ (لِغَيْرِ قَرِيْبٍ وأحْوَج) يعني: لا يُكرَهُ إذَا نَقلَهَا إلى قَرِيْبه ، وإلى قَوْمٍ هُمْ أحْوَجُ مِنْ أهْلِ بَلَدِه ؛ لِمَا فيه مِنَ الصِّلَةِ أوْ زيادة دَفْعِ الحَاجَةِ". (۱)

علامہ شرنبلالی – رحمہ اللہ – نے درر الحکام کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ

"ولا يُكْرَهُ أيضاً نَقلُهَا لِمَنْ هو أوْرَعُ وأنْفَعُ لِلْمُسْلِمِين بِتَعْلِيْمٍ مِنْ فُقَرَاءِ بَلَدِه بَعْدَ تَمَامِ الحَوْل". (۲)

مصارف زکات میں اپنے رشتے داروں کو دینا افضل ہے

چوتھی بات یہ کہ ماں، باپ، دادا دادی، نانا، نانی کو اور اپنے بچوں کو اور میاں بیوی کو چھوڑ کر کسی بھی غریب ومحتاج رشتے دار کو زکات دینا جائز ہے؛ بل کہ زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے، حدیث میں ہے کہ: رسول اللہ – صلی اللہ علیہ وسلم – نے فرمایا کہ

" اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ ، وَهِيَ عَلَى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ :صَدَقَةٌ وَ صِلَةٌ "

(مسکین کو صدقہ دینا تو صرف صدقہ ہے اور رشتے دار کو صدقہ دینے میں دوگنا اجر ہے: ایک صدقے کا اور ایک صلہ رحمی کا۔)(۳)

اور فقہاء نے لکھا ہے کہ محتاج وضرورت مند رشتے داروں کو زکات دینے میں اپنے

---

(۱) درر الحكام:۱/۱۹۲

(۲) درر الحكام:۱/۱۹۲

(۳) الترمذي : باب ماجاء في الصدقة على ذي القرابة ،ح:۶۵۸، مسند الحميدي ،ح :۸۲۳، مسند أحمد ، ح :۱۶۲۳۲

بھائی بہنوں کو مقدم رکھا جائے، پھر ان کی اولاد کو دیا جائے، پھر چچاؤں اور پھوپیوں کو، پھر ان کی اولاد کو، پھر ماموؤں اور خالاؤں کو، پھر ان کی اولاد کو، پھر دیگر رشتہ داروں کو دیا جائے۔

امام الحدادی-رحمہ اللہ- نے "الجوهرة النيرة" میں فرمایا کہ

"واعْلَمْ أنَّ الأفضلَ في الزكاةِ والفِطْرَةِ والنُذُوْر الصَّرْفُ أوّلاً إلى الإخْوَةِ والأخَوَاتِ ، ثُمَّ إلى أوْلادِهِمْ ، ثُمَّ إلى الأعْمَام والعَمَّاتِ ، ثُمَّ إلى أوْلادِهِمْ ، ثُمَّ إلى الأخْوَالِ والخَالاتِ ، ثُمَّ إلى أوْلادِهِمْ ، ثُمَّ إلى ذَوِي الأرْحَام منْ بَعْدِهِمْ ، الخ". (۱)

اور علامہ ابن الھمام-رحمہ اللہ- نے فتح القدیر میں تحریر فرمایا ہے کہ

"قالُوْا: الأفضلُ في صَرْفِهَا أنْ يَصْرِفَهَا إلى إخْوَانِه الفُقَرَاءِ ، ثُمَّ أولادهم ثُمّ أعْمَامِه الفُقَرَاء ، ثُمّ أخْوَالِه ، ثُمّ ذَوِي أرْحَامِه". (۲)

اس سلسلے میں بہت سے لوگ کوتاہی وغفلت کرتے ہیں اور اپنی زکات اور دوسرے صدقات رشتے داروں کے بجائے دوسروں کو دیتے ہیں، اور اپنے رشتے داروں کو بھول جاتے ہیں، دوسروں کو دینے سے زکات تو بےشک ادا ہو جاتی ہے، مگر افضل واحسن یہ ہے کہ پہلے اپنے غریب رشتے داروں کو یاد کیا جائے اور ان کی خبر گیری کی جائے پھر دوسروں کو دیا جائے۔



(۱) الجوهرة النيرة:۱/۳۲۰

(۲) فتح القدير:۲/۲۸۳

بحث نهم

کن لوگوں کو زکات دینا جائز نہیں ہے؟

بحث نهم
کن لوگوں کو زکات دینا جائز نہیں ہے؟

مصارف زکات کے بعد اب یہ سمجھنا باقی ہے کہ کن کن لوگوں کو زکات دینا جائز نہیں ہےاور زکات ان کو دینے سے ادا نہیں ہوتی، لہذا اب یہاں ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔

غیر مسلم کو زکات نہیں دے سکتے

زکات کی رقم جن لوگوں کو دینا جائز نہیں ہے، ان میں سے سب سے پہلے تو غیر مسلم لوگ ہیں، ان کو زکات نہیں دی جا سکتی اور یہ تمام ائمہ کا متفقہ مسلک ہے کہ زکات کی رقم غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہے۔

چناں چہ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے " **الإشْرَافُ على مَذَاهِبِ العُلَمَاء** " میں لکھا ہے کہ

> **" أَجْمَعَ كُلُّ مَنْ نَحْفَظُ عنه مِنْ أهل العِلْمِ على أَنَّ الذِّمِّي لا يُعْطى مِنْ زَكَاةِ الأَمْوَالِ شَيْئاً ، ومِمَّنْ حَفِظْنَا ذٰلک عنه: ابنُ عُمَر، والحَسَنُ البَصري ، والنخعيُّ ، وقتادةُ ، ومالكٌ ، وأحمدُ ، وأبُو ثَوْر ، وأبُو عُبَيْد والنُّعْمَانُ " .** [1]

(۱) الإشراف على مذاهب العلماء :۳/۱۰۰

اسی طرح علامہ ابن المنذر –رحمہ اللہ– نے اپنی دوسری کتاب " الإجماع" میں لکھا ہے کہ

"وأجمَعُوا عَلٰى أنَّ الذِّمّي لا يُعْطٰى زَكَاةَ الأَمْوَالِ شَيْئاً " (۱)

غیر مسلم کو نفلی صدقہ دے سکتے ہیں

ہاں! زکات کے علاوہ جو عام صدقات ہوتے ہیں، وہ غیر مسلم لوگوں کو دے سکتے ہیں؛ حتی کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک صدقہ فطر بھی ان لوگوں کو دینا جائز ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک مرسل حدیث ہے، کہ حضرت سعید بن جبیر نے روایت کیا کہ رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے فرمایا کہ

« تَصَدَّقُوْا عَلَى أَهْلِ ٱلاَدْيَانِ كُلِّهَا »

(ہر دین والے کو صدقہ دو۔)(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم لوگوں کو زکات کے علاوہ سے صدقہ دینا جائز ہے، بلکہ قرآن کریم سے، تو اس کی ترغیب بھی معلوم ہوتی ہے، چناں چہ ایک جگہ یہ آیت ہے کہ

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾

(البَقَرَة: ۲۷۲)

اس آیت کے شان نزول میں متعدد روایات آئی ہیں: ایک روایت حضرت سعید بن جبیر سے ہے کہ: رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے ایک موقعے پر یہ فرمایا کہ: "لاَ تَصَدَّقُوْا إِلَّا عَلَى أَهْلِ دِيْنِكُمْ" کہ تم لوگ سوائے اپنے دین والوں کے کسی اور کو صدقہ نہ دو۔

(۱) الإجماع لابن المنذر: ۵۷

(۲) ابن أبي شيبة : الزكاة/ما قالوا في الصدقة في غير الإسلام ،ح: ۱۰۴۹۹.
نصب الراية : ۳۹۸/۲

(یہ اس لیے فرمایا تھا تاکہ غیر لوگ اس کی وجہ سے اسلام میں داخل ہو جائیں) اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(۱)

اس میں کس قدر ترغیب دی گئی ہے اور مختلف پہلوؤں سے یہ بتایا گیا ہے کہ غیر مسلم لوگوں پر صدقہ کرنے سے تمہارا اجر ضائع نہیں جاتا، بل کہ بھر پور طریقہ سے ملتا ہے۔اور محمد بن الحنفیہ کہتے ہیں کہ جب صحابہ نے مشرکین کو صدقہ دینے میں کراہت سمجھی، تو یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر مسلمین کو بھی صدقہ دیں۔(۲)

ایک روایت یہ ہے کہ جب اللہ کے رسول –صلی اللہ علیہ وسلم– نے عمرۃ القضاء کیا تھا، تو اس وقت حضرت اسماء بھی عمرے میں آپ کے ساتھ گئی تھیں، مکہ مکرمہ میں حضرت اسماء کی والدہ اور دادی یا نانی ان کے پاس سوال کرتے ہوئے آئیں، تو حضرت اسماء نے کہا کہ میں تمھیں اس وقت تک نہیں دوں گی، جب تک کہ میں اللہ کے رسول –صلی اللہ علیہ وسلم– سے اس بارے میں مشورہ نہ کرلوں؛ کیوں کہ تم لوگ ہمارے دین یعنی اسلام پر نہیں ہو۔ جب انھوں نے آپ –صلی اللہ علیہ وسلم– سے مشورہ کیا تو آپ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اسی طرح ایک روایت یہ ہے کہ مسلمانوں کی پہلے سے کچھ رشتے داریاں، یہودیوں سے چلی آ رہی تھیں، اور وہ لوگ اسلام سے پہلے ان کو صدقات دیا کرتے تھے، لیکن جب وہ مسلمان ہو گئے تو یہودیوں کو دینے میں کراہت سمجھنے لگے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ان کو بتایا گیا کہ یہودیوں کو صدقات دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(۳)

میں نے یہ بات ذرا تفصیل سے اس لیے عرض کردی؛ تاکہ کسی کو یہ سن کر کہ غیر مسلموں کو زکات نہیں دے سکتے، یہ شبہ اور خلش نہ ہو کہ اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ

---

(۱) أسباب النزول للواحدي:۹۱

(۲) أسباب النزول:۹۱

(۳) أسباب النزول:۹۲

کوئی امتیازی سلوک کیا جاتا ہے،اور اسلام میں ان کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے،نہیں نہیں، بل کہ میں نے تفصیل سے بتادیا کہ اسلام نے ان کا پورا لحاظ رکھا ہے اور ان کو صدقات میں سے دینے کی صرف اجازت ہی نہیں ، بل کہ اس کی ترغیب بھی دیتا ہے اور اس پر اجر و ثواب کا وعدہ بھی کرتا ہے۔ہاں زکات ایک خاص مد ہے،جس کا مقصد بھی خاص مسلم برادری میں موجود فقر وفاقے کو دور کرنا ہے؛لہٰذا اس کو خاص کر دیا گیا مسلموں کے ساتھ، تو اس میں کوئی شبہ کی بات نہیں ہے۔دیکھیے کہ ماں باپ کو بھی زکات نہیں دی جاسکتی ، اپنے بچوں کو بھی نہیں دی جاسکتی ، بہت سے دینی کاموں میں نہیں دی جاسکتی ،مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام میں ان کا لحاظ نہیں رکھا گیا؛ بل کہ یہ ایک دوسری وجہ سے ہے۔

الغرض غیر مسلم لوگوں کو زکات کے علاوہ دوسرے عام نفلی صدقات دے سکتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک صدقۂ فطر بھی ان کو دینا جائز ہے۔

مالدار کو زکات نہیں دے سکتے

جن لوگوں کو زکات دینا جائز نہیں ، ان میں سے ایک وہ ہے جو غنی و مال دار ہو۔ مالدار کون ہے؟ شریعت میں مال دار وہ ہے،جس کے پاس نصاب کے برابر مال ہو،جس کی تفصیل پہلے بیان کردی گئی ہے؛لہٰذا مالدار آدمی جس کے پاس نصاب کے بقدر مال موجود ہے،اس کو زکات دینا جائز نہیں اور اس کو لینا بھی جائز نہیں ہے۔

نصاب کی دو قسمیں اور ان کے احکام

یہاں ایک بات سمجھ لینا چاہیے کہ نصاب دو قسم کا ہوتا ہے:

(۱) نصاب نامی: مال نامی وہ مال ہے جس میں بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، یہ اگر اس خاص مقدار کو پہنچ جائے ،جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے،تو وہ نصاب نامی ہے۔

اور یہ پانچ قسم کی چیزوں میں ہوتا ہے : (۱) سونا و چاندی (۲) روپیہ و پیسہ ،

(۳) مال تجارت (۴) جانور و مویشی (یعنی اونٹ، بکری، گائے اور بعض کے نزدیک گھوڑا بھی) (۵) زمین کی پیداوار۔

یہ ہے مال نامی، یا نصاب نامی؛ لہذا جو بھی شخص اس نصاب کا مالک ہو، اس کو زکات دینا حرام ہے اور اگر دی جائے، تو ادا نہیں ہوتی؛ کیوں کہ خود اس پر زکات فرض ہے، تو وہ دوسرے کی زکات کیسے لے سکتا ہے؟

(۲) نصاب غیر نامی: یہ وہ مال ہے جو بڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یعنی اس سے مال میں بڑھوتری نہیں ہوتی۔

مال نامی کے علاوہ جو بھی مال ہے، وہ مال غیر نامی ہے، جیسے مکان، دکان، سواری، پہننے کے کپڑے، گھریلو سامان وغیرہ۔

اگر کوئی شخص مال غیر نامی کا مالک ہو، تو اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ مال اگر اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہو اور وہ چاندی کے نصاب کو پہنچ جائے یعنی چھ سو بارہ گرام تین سو ساٹھ ملی گرام کو پہنچ جائے، تو اس کو بھی زکات دینا جائز نہیں ہے اور اگر یہ مال غیر نامی حاجت اصلیہ سے زائد نہیں ہے، تو اس کو زکات دینا جائز ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ – صلی اللہ علیہ وسلم – نے فرمایا کہ

"لاَ تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلاَ لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ"

(یعنی زکات جائز نہیں ہے، کسی مالدار کے لیے اور اس کے لیے جو طاقت مند و صحت مند ہو) (۱)

لہذا جو شخص نصاب نامی کا، یا نصاب غیر نامی زائد از حاجت کا مالک ہو، اس کے لیے زکات جائز نہیں ہے، نہ اس کو لینا جائز اور نہ کسی کا اسے دینا جائز ہے، اگر کوئی جانتے

---

(۱) الترمذي: الزكاة / باب ماجاء من لاتحل له الصدقة، ح :۶۵۸، أحمد :۶۵۳۰

ہوئے اس کو زکات دے گا، تو اس کی زکات ادا نہ ہوگی۔

امام مرغینانیؒ نے ''الهداية'' میں لکھا ہے کہ

''وَلا يَجُوْزُ دَفْعُ الزَّكاةِ إلى مَنْ يَمْلِكُ نِصَاباً مِنْ أيِّ مالٍ كَانَ ؛ لأنَّ الغِنَى الشَّرْعِي مُقَدَّرٌ به..................

وَيَجُوْزُ دَفْعُهَا إلَى مَنْ يَمْلِكُ أقَلَّ مِنْ ذٰلكَ وإنْ كَانَ صَحِيْحاً مُكْتَسِباً ؛ لأنَّه فَقِيْرٌ''. (۱)

اور امام الحدادی -رحمہ اللہ- نے ''الجوهرة النيرة'' میں فرمایا کہ

''وَ لايَجُوْزُ دفعُ الزَّكاةِ إلى مَنْ يَمْلِكُ نِصَاباً مِنْ أيِّ مالٍ كانَ ؛ سَوَاءٌ كانَ النِّصَابُ نَامِياً أو غَيْرَ نَامٍ''۔ (۲)

مالدار کی غریب بیوی کو زکات

یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ زکات کا مال مال دار و غنی کے لیے جائز نہیں؛ لیکن اگر کسی مال دار کی بیوی محتاج ہو، تو اس کو زکات دینے کا کیا حکم ہے؟

اس بارے میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مال دار کی بیوی کو زکات دینا جائز ہے، خواہ قاضی نے اس کا نفقہ مقرر کیا ہو، یا نہ کیا ہو، دونوں صورتوں میں اس کو زکات دینا جائز ہے۔ اور امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ اگر قاضی نے اس کا نفقہ مقرر کر دیا ہے تو مال دار کی بیوی کو زکات نہیں دی جا سکتی۔

چناں چہ امام برهان الدین البخاری نے '' المحيط البرهاني '' میں اور امام علاء الدین الدہلوی -رحمہ اللہ- نے ''فتاوى التاتارخانية'' میں لکھا ہے کہ:

---

(۱) الهداية :۲۲۸/۲

(۲) الجوهرة النيرة :۳۱۸/۱

" قال القُدُوْرِي : وقالَ أبوحنيفة و محمد : يَجُوْزُ الدفعُ إلى امْرأةِ الغَنِيِّ إذَا كَانَتْ فَقِيْرَةً ، وعن أبي يوسف : أنَّه لا يُعْطى امرأةُ الغَنِي إذَا قُضِيَ لَهَا بِالنَّفْقَة، " .(۱)

مالدار بیوی کے غریب شوہر کو زکات

ایک صاحب کا سوال ہے کہ ایک عورت ہمارے خاندان میں ہے، جو بہت مالدار ہے اور وہ زیورات کی مالک بھی ہے اور اس کے علاوہ روپیہ پیسہ بھی اس کے پاس اس کے میکے سے ملا ہوا بہت ہے؛ مگر اللہ کی مصلحت کہ اس کا شوہر بہت غریب ہے، تو اس شوہر کو زکات دینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے اور اس کو زکات دی جائے، تو وہ اپنی اس مال دار بیوی کا نان نفقہ اس سے چلا سکتا ہے، یا نہیں؟

جواب: اسلام میں میاں بیوی کا مال الگ الگ متصور ہوتا ہے؛ لہذا اگر بیوی مال دار ہے، تو شوہر کو مال دار نہیں سمجھا جائے گا؛ لہذا جب اس مال دار بیوی کا شوہر غریب ہے تو اس کو زکات دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، جب کہ بعض ائمہ جیسا امام ابو یوسفؒ اور امام محمد وغیرہ کے نزدیک خود مال دار بیوی بھی اپنے شوہر کو زکات دے سکتی ہے، تو کوئی دوسرا اس کے غریب شوہر کو زکات دے، تو اس میں کیا اشکال ہے؟ اور پھر جب اس کو زکات دے دی، تو وہ جہاں چاہے، اس کو استعمال کر سکتا ہے۔

مال دار باپ کی اولاد کو زکات کا حکم

اسی طرح یہاں ایک سوال یہ پیش آتا ہے کہ مال دار کی اولاد کو زکات کی رقم دے سکتے ہیں، یا نہیں؟ مال دار کی اولاد مال دار شمار کی جائے گی یا نہیں؟ اگر وہ مال دار شمار ہوگی تو ظاہر ہے کہ اس کو زکات نہیں دی جا سکتی؟

---

(۱) المحیط البرهاني:۲/۲۸۳، التاتارخانية :۳/۲۱۰

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر غنی کی اولاد نابالغ ہو، تو اس کو زکات دینا جائز نہیں اور اگر بالغ ہو اور محتاج ہو، تو اس کو زکات دینا جائز ہے؛ کیوں کہ نابالغ اولاد باپ کے تابع ہے اور اس وجہ سے جب باپ مال دار ہے، تو اس کی نابالغ اولاد بھی مال دار شمار ہوگی۔

علامہ علاء الدین سمرقندی نے "تحفة الفقهاء" میں فرمایا کہ

" لايَجُوْزُ صَرْفُ الصَّدَقَات الوَاجِبَةِ إلى وَلَدِ الغَنِي إذَا كانَ صَغِيْراً ، وَإذَا كَانَ كَبِيْراً يَجُوزُ ؛ لأنَّ الصَّغِيْرَ يُعَدُّ غَنِيّاً بِمَالِ أبِيْهِ بِخَلافِ الكَبِيْر". (۱)

اور علامہ کاسانی -رحمہ اللہ- "بدائع الصنائع" میں تحریر کرتے ہیں کہ

"وأمَّا وَلَدُ الغَني ، فإنْ كانَ صَغِيراً لَمْ يَجُز الدَّفعُ إليه وإنْ كانَ فَقِيْراً لا مَالَ لَه ؛ لأنَّ الوَلَدَ الصَّغِيْر يُعَدُّ غَنِيًّا بِغِنىٰ أبِيْه ، وإنْ كانَ كَبِيْراً فَقِيراً يَجُوْز؛ لأنَّه لايُعَدُّ غَنِيّاً بِمَالِ أبِيْهِ". (۲)

اور امام برهان الدین البخاری -رحمہ اللہ- نے " المحيط البرهاني " میں لکھا ہے کہ

" ولا يُعْطِيْ منها غَنِيّاً ولا لِوَلَدِ غَنِيٍّ إذا كانَ صَغِيْراً ، وإنْ كانَ كَبِيراً فقيراً جازَ الدفعُ إليه ، وهٰذا لأنَّه إذا كان صَغِيْراً يُعَدُّ غَنِيًّا بِمَالِ أبيه ، ؛ لأنَّ كِفَايَتَه عليه ، ولا كذلك ما إذا كَانَ كَبِيْراً ، فهو لَيْسَ بِغَنِيٍّ بِغِنَى الأبِ ؛ لأنَّ كفايتَه لَيْسَ عَلَى الأبِ". (۱)

الغرض نابالغ اولاد باپ کے تابع ہونے کی وجہ سے باپ کے مال دار ہونے کی صورت میں اس کو زکات نہیں دی جاسکتی، اور بالغ محتاج اولاد کو دی جاسکتی ہے۔

---

(۱) تحفة الفقهاء :۱/۳۰۰

(۲) بدائع الصنائع:۲/۴۷۶

مال دار بیٹے کے باپ کو زکات

اسی طرح اگر کسی کا بیٹا مال دار ہو اور باپ غریب، تو اس غریب باپ کو زکات دی جا سکتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ بیٹے کے مال دار ہونے سے باپ مال دار قرار نہیں دیا جاتا۔

''المحیط البرهانی''اور''فتاوی التاتارخانیة''میں ہے کہ

"وكَذَا الأبُ إذَا كَانَ مُحْتَاجاً والابنُ مُوْسِرٌ ، جَازَ الإعْطَاءُ إلَى الأبِ". (۲)

اگر غلطی سے مال دار کو زکات دے دی تو؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی نے خود کو محتاج ظاہر کیا، لیکن ہمیں اس کا حال معلوم نہیں کہ حقیقت میں بھی یہ محتاج ہے یا صرف مانگنے کا مشغلہ بنا کر مانگ رہا ہے، یا مال بڑھانے کے لیے مانگ رہا ہے اور ایسی صورت میں کسی نے اس کو زکات دے دی، تو اس کی زکات ادا ہوگی، یا نہیں؟ اور اگر بعد میں اس کا مالدار ہونا معلوم ہو جائے، تو کیا دوبارہ دینا لازم ہے؟

جواب یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اگر کسی شخص کو فقیر سمجھ کر زکات دے دی، پھر اس کا غنی ہونا واضح ہوا تو دینے والے کی زکات ادا ہو جائے گی اور دوبارہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور امام ابو یوسف کے نزدیک اس صورت میں زکات دوبارہ ادا کرنا ہوگا، اور امام صاحب سے بھی ایک قول یہی مروی ہے؛ لیکن پہلا قول اصح ہے۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ

(۱) المحيط البرهاني:۲/۲۸۳

(۲) المحيط البرهاني:۲/۲۸۳، التاتارخانية:۳/۲۱۰

”قَالَ أبُو حنيفةَ و مُحَمّدٌ: إذَا دَفَعَ الزكاةَ إلَى رَجُلٍ يَظُنُّه فَقِيراً، ثُمَّ بَانَ أنّه غَنِيٌّ أو هَاشِمِيٌّ أو كافرٌ ، أوْ دَفَعَ في ظُلْمَةٍ ، فَبَانَ أنّه أبُوْهُ أو ابْنُه فَلاَ إعَادَةَ عَلَيْه . وقَالَ أبُو يُوْسُف: عَلَيْهِ الإعَادَةُ . “(۱)

لیکن یاد رہے کہ غلطی سے غیر مصرف میں دینے سے زکات کا ادا ہو جانا جو امام صاحب کا مسلک ہے، یہ اس وقت ہے، جب کہ اس نے دینے سے پہلے غور وفکر کیا ہو اور اپنے غالب گمان میں فقیر اور مصرف سمجھ کر دیا ہو۔ اور اگر غور وفکر ہی نہیں کیا؛ بل کہ جو ملا اسی کو دے آیا، یا اس کے فقیر ہونے میں شک تھا، پھر بھی اس کو دے دیا اور بعد میں اس کا غنی و مال دار ہونا معلوم ہوا، تو پھر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی زکات ادا نہ ہوگی۔

چناں چہ علامہ مرغینانیؒ لکھتے ہیں کہ

”وهٰذَا إذَا تَحَرّٰى وَدَفَعَ ، وَ فِيْ أكْبَرِ رَأيِه أنّه مَصْرَفٌ ، أمَّا إذَا شَكَّ وَلَمْ يَتَحَرَّ، أوْ تَحَرّٰى فَدَفَعَ وفِيْ أكْبَرِ رَأيِهِ أنَّه لَيْسَ بِمَصْرَفٍ لايُجْزِئُه ، إلَّا إذَا عَلِمَ أنّه فَقِيْرٌ ، هو الصحيحُ“ .(۲)

قوی وتندرست کو زکات

اگر کوئی شخص ضرورت مند ومحتاج ہے، مگر جسمانی لحاظ سے قوی وتندرست ہے، جو کمائی کر کے اپنا معاش پیدا کر سکتا ہے، تو اس کو زکات دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر اس کو زکات دی جائے، تو زکات ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟

اس مسئلے میں علما کا اختلاف ہے، بعض ائمہ جیسے امام شافعی، امام اسحاق بن راہویہ اور امام ابوعبید کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو زکات دینا جائز نہیں، اور دیگر ائمہ کے نزدیک قوی و

(۱) الهداية :۲۲۶/۲

(۲) الهداية :۲۲۷/۲

صحت مند انسان محتاج ہو اور اس کے پاس نصاب کے برابر مال نہ ہو، تو اس کو زکات دینا جائز ودرست ہے اور اس کو دینے سے زکات ادا ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں بعض احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کی تشریح میں دراصل اختلاف ہوا ہے اور اسی بنیاد پر مسئلے میں اختلاف ہے۔

چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص -رضی اللہ عنہ- سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم -صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا کہ:

« لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلاَ لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيّ »

(کسی مال دار کے لیے اور قوی وصحت مند کے لیے صدقہ حلال نہیں)(۱)

حضرت عدی بن خیار کہتے ہیں کہ مجھے دو شخصوں نے خبر دی کہ وہ دونوں رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- کی خدمت میں حجۃ الوداع کے موقعے پر اس وقت حاضر ہوئے کہ آپ -صلی اللہ علیہ وسلم- صدقات تقسیم کر رہے تھے، اور انھوں نے آپ -صلی اللہ علیہ وسلم- سے صدقے میں سے مانگا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ آپ -صلی اللہ علیہ وسلم- نے ہمیں نگاہ اٹھا کر دیکھا اور نگاہ نیچے کر لی اور آپ نے ہمیں قوی وتندرست محسوس کیا اور فرمایا کہ:

« إِنْ شِئْتُمَا أَعْطَيْتُكُمَا وَلاَ حَظَّ فِيْهَا لِغَنِيٍّ وَلَا لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ »

(اگر تم چاہو تو میں تمہیں دیدوں گا، لیکن صدقے میں کسی مال دار کا اور کمائی کرنے کے قابل قوی شخص کا کوئی حصہ نہیں)(۲)

---

(۱) أبو داود : كتاب الزكاة، باب من يعطى من الصدقة، ۱۶۳۴، احمد : ۶۵۳۰، الدارمي: الزكاة ، باب من تحل له الصدقة ، ۱۶۷۹)

(۲) أبو داود : كتاب الزكاة، باب من يعطى من الصدقة، ۱۶۳۳ .

ان احادیث سے امام شافعی وغیرہ نے استدلال کیا ہے کہ کمائی کرنے کے قابل شخص کو زکات دینا جائز نہیں ہے، کیوں کہ ان احادیث میں آپ نے کمائی کرنے کے قابل قوی شخص کے لیے زکات کو حرام قرار دیا ہے۔

مگر ہمارے علماء کہتے ہیں کہ ان احادیث میں ایسے شخص کو مانگ کر لینے سے منع کیا گیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص محتاج وضرورت مند ہے اور بلا سوال کوئی اس کو زکات دے دے، تو وہ لے سکتا ہے اور ایسے شخص کو دینا جائز ہے، اگر چہ کہ وہ کمائی کرنے کے قابل ہو ،لیکن اس کو مانگنا جائز نہیں ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ کمائی کرنے کے قابل آدمی کو دوسروں کے صدقے پر پلنا برا ہے۔

علامہ عینی – رحمہ اللہ – نے شرح ابوداود میں لکھا ہے کہ:

" وَ قَالَ أَصْحَابُنَا : يَجُوزُ لَهُ ذٰلِکَ مَا لَمْ يَمْلِکْ مِأَتَي دِرْهَمٍ فَصَاعِدًا ؛ لِأَنَّ الْمُرَادَ مِنَ الْغَنِيِّ: هُوَ الْغَنِيُّ الشَّرْعِيُّ وَهُوَ أَنْ يَّمْلِکَ نِصَابًا وَمَا فَوْقَهُ ، وَأَجَابُوْا عَنْ قَوْلِه: "وَلَا لِذِيْ مِرَّةٍ سَوِيٍّ" أَنَّ الْمُرَادَ بِه : أَنْ يَّسْأَلَ مَعَ قُدْرَتِه عَلٰى اكْتِسَابِ الْقُوْتِ ". (١)

سید خاندان کے لیے زکات جائز نہیں

جن لوگوں کو زکات نہیں دی جا سکتی ، ان میں ایک وہ بھی ہیں، جو رسول اللہ – صلی اللہ علیہ وسلم – کے خاندان کے لوگ ہیں ، جن کو سادات کہا جاتا ہے ،لہذا سیدوں کو بھی زکات دینا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں:

حضرت ابو رافع – رضی اللہ عنہ – سے روایت ہے کہ رسول اللہ – صلی اللہ علیہ وسلم – نے فرمایا کہ

"إِنَّ الصَّدَقَةَ حَرَامٌ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ وَ إِنَّ

(١) شرح أبي داود للعيني: ٦/ ٣٧٥

مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْهُمْ ." (۱)

(زکات حرام ہے محمد –ﷺ– پر اور محمد –ﷺ– کی آل اولاد پر اور لوگوں کا آزاد کردہ غلام بھی انھی میں سے ہے، یعنی آپ کے خاندان کے آزاد کردہ غلام کے لیے بھی زکات حرام ہے)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت حسن بن علیؓ نے ایک بار بچپن میں زکات کا ایک کھجور اٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا تھا، تو آپ –ﷺ– نے ان کے منہ میں ہاتھ ڈال کر نکالا اور زکات کے کھجوروں میں ڈال دیا اور فرمایا کہ ہم آل محمد کے لیے زکات حلال نہیں ہے۔ (۲)

مسلم وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آپ –ﷺ– نے فرمایا کہ

"إِنَّ الصَّدَقَةَ لاَ تَنبَغِيْ لِآلِ مُحَمَّدٍ ، إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاس" (۳)

(زکات آل محمد کے لیے نا مناسب ہے؛ کیوں کہ وہ تو لوگوں کا میل کچیل ہے)

پھر اس پر امت کا اجماع بھی ہو چکا ہے، علامہ ابن قدامہ الحنبلیؒ لکھتے ہیں کہ

" لانَعْلَمُ خِلافاً فِيْ أَنَّ بَنِيْ هَاشِمٍ لاتَحِلُّ لَهُمُ الصَّدَقَةُ المَفرُوْضَةُ"

(۱) أحمد: ۲۳۸٦۳.الطحاوي فيشرح المعاني: باب الصدقة على بني هاشم ،ح:۲۹٦۸

(۲) أبو داود الطيالسي: مسند الحسن بن علي،ح : ۱۱۲۷۳.أحمد : ۱۷۲۷. الطحاوي فيشرح المعاني: باب الصدقة على بني هاشم ، ح:۲۹٦٦

(۳) مسلم : الزكاة / باب ترك استعمال آل النبي على الصدقة ، ح: ۱۰۷۲، الطحاوي :۲۹٦۹، أحمد :۱۷۵۲۰

(بنی ہاشم کو زکات دینا ناجائز ہونے کے مسئلے میں کسی اختلاف کا علم نہیں)(۱)

اور علامہ نووی شافعی - رحمہ اللہ - نے بھی لکھا ہے کہ

" فالزكاةُ حَرَامٌ عَلَى بَنِي هَاشِمٍ وبَنِي المُطَّلِب بِلا خِلافٍ ، إلَّا مَا سَبَقَ فِيمَا إذَا كَانَ أحَدُهُمْ عَامِلاً ، والصَّحِيحُ تَحْرِيمُهُ ". (۲)

ان کے علاوہ علامہ عبدالرحمٰن ابن قدامہ - رحمہ اللہ - نے الشرح الکبیر (۲/۷۱۰) میں اور البھوتي نے كشف القناع (۵/۴۱۱) میں سیدوں پر زکات کی حرمت پر اجماع نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس مسئلے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔

الغرض ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ہمارے نبی - صلی اللہ علیہ وسلم - کے لیے اور آپ کی آل اولاد کے لیے جن کو سادات کہا جاتا ہے، ان کو زکات کا مال جائز نہیں ہے، اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

رہی اس حرمت کی حکمت تو اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی - رحمہ اللہ - نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں تین وجوہات بیان کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

"پہلی وجہ یہ ہے کہ صدقات لوگوں کا میل کچیل ہے، پس وہ آپ - صلی اللہ علیہ وسلم - اور آپ - صلی اللہ علیہ وسلم - کے خاندان کے لائق نہیں، اور وہ میل اس طرح ہیں کہ ان سے صدقہ کرنے والوں کے گناہ معاف ہوتے ہیں، ان کے ذریعے بلائیں رفع ہوتی ہیں، اور وہ لوگوں کی بلاؤں کا فدیہ بن جاتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جو مال بلا میادلے کے لیا جاتا ہے، اس میں

(۱) المغني لابن قدامة :۴/۱۰۹

(۲) المجموع شرح المهذب :۶/۲۲۰

لینے والے کے لیے ذلت ہے اور دینے والے کے حق میں برتری و احسان سمجھا جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ ''الید العلیا خیر من الید السفلی ''(اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے) تو یہ آپ جیسی مقدس ذات اور آپ کے خاندان جیسے پاکیزہ لوگوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر زکات وصدقات آپ کے اور آپ کے اہل خاندان کے لیے جائز قرار دیئے جاتے تو ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ آپ کے اور آپ کے خاندان کے بارے میں نازیبا باتیں کہتے اور یہ خیال کرتے کہ آپ نے اپنے لیے اور اپنے خاندان والوں کے عیش کے لیے لوگوں سے وصولی کا یہ سلسلہ جاری کیا ہے، لہذا اسد باب کے لیے زکات آپ کے لیے اور آپ کے اہل خاندان کے لیے حرام کر دی گئی۔(۱)

الغرض مختلف حکمتوں کی وجہ سے آپ کے اور آپ کے اہل خاندان کے لیے زکات کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

سید کون کون لوگ ہیں؟

یہاں یہ جان لیجیے کہ ہمارے نبی –صلی اللہ علیہ وسلم– کی کوئی نرینہ اولاد تو باقی نہیں رہی تھی، اس لیے آپ کی اولاد سے مراد اب حضرت حسن وحسین اور ان کی اولاد ہی ہے اور یہی آل رسول ہیں۔ان کے علاوہ سادات جن کو زکات دینا حرام ہے، ان سے مراد ایک تو ہوتے ہیں: حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی اولاد، دوسرے حضرت حارث بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی اولاد، یہ دونوں تو رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– کے چچا ہوتے ہیں، اور تیسرے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اولاد اور چوتھے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اولاد اور پانچویں حضرت عقیل بن

---

(۱) خلاصہ از: حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/۰۷

ابی طالبؓ کی اولاد۔ یہ تینوں حضرت ابوطالب کے بیٹے ہیں؛ ان سب کو زکات دینا حرام ہے۔

امام مرغینانی –رحمہ اللہ– نے ''الهداية'' میں فرمایا کہ:

''وَلَا تُدْفَعُ إِلَى بَنِي هَاشِمٍ، وهُمْ آلُ عَلِيٍّ، وآلُ عَبَّاسٍ وآلُ جَعْفَرٍ وآلُ عَقِيلٍ وآلُ الحَارِث بنِ عَبْدِ المُطَّلِب ''. (۱)

اور ''دُرَرُ الحُكّام'' میں ہے کہ

'' وَبَنِيْ هَاشِمٍ وهُمْ آلُ عَلِيٍ، وعَبَّاس وجَعْفَر وعَقِيل و الحَارِث بن عبدِ المُطَّلِب ''. (۲)

الغرض یہ حضرات بنو ہاشم کہلاتے ہیں، ان سب کے لیے زکات کو حرام قرار دیا گیا ہے؛ لیکن اب لوگ ان میں سے آج عام طور پر حضرت حسن وحسین کی اولاد ہی کو جانتے اور انھی کے لیے زکات کو حرام سمجھتے ہیں، حالاں کہ ان کے علاوہ بھی آج حضرت علیؓ کی دوسری اولاد اور حضرت عباس کی بے شمار اولاد موجود ہے اور ان سب پر بھی زکات حرام ہے؛ مگر اب ان کی پہچان ہی باقی نہیں رہی۔

جو لوگ نام کے سید ہوں، ان کو زکات دے سکتے ہیں؟

بہت سے سادات کہلانے والے لوگ حقیقی طور پر سید نہیں ہوتے، یا ان کا کوئی نسب نامہ موجود نہیں ہوتا، ان کے بارے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کو زکات دینے کا کیا حکم ہے؟

یہاں اس کی متعدد صورتیں ہیں: ایک یہ کہ کسی کا سید ہونا یقینی طور پر معلوم ہو اور وہ خود اس کا مدعی بھی ہو۔ اس صورت کا حکم واضح ہے کہ اس کو زکات نہیں دی جا سکتی۔

دوسری یہ کہ کسی کا سید نہ ہونا یقینی طور پر معلوم ہو؛ لیکن وہ خود کو سید کہلاتا ہو، اس کا

(۱) الهداية :۲۲۶/۲

(۲) درر الحكام:۱۹۱/۱

حکم یہ ہے کہ اس کو زکات دے سکتے ہیں؛ کیوں کہ وہ فی الواقع سید نہیں ہے۔

اور تیسری یہ کہ کسی کا سید ہونا معلوم نہ ہو؛ لیکن وہ خود اس کا مدعی ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو زکات دینا احتیاط کے خلاف ہے؛ کیوں کہ جب وہ خود سید ہونے کا مدعی ہے اور ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں، تو اس کو سید ہی سمجھا جائے گا اور اس وجہ سے اس کو زکات نہیں دی دینا چاہیے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی –رحمہ اللہ– کے ایک فتوے سے یہی مفہوم ہوتا ہے؛ چناں چہ آپ سے سوال کیا گیا کہ:

''جو شخص کہ سید کہا جاتا ہو؛ مگر اس کے نسب کا کہیں پتہ نہ ہو، تو اس کو زکات کے مال سے دے سکتے ہیں، یا نہیں، یا صرف تسامع سے اس کو سید مانیں گے گو کہ سید نہ ہو''؟

اس کا جواب حضرت تھانوی –رحمہ اللہ– نے یہ دیا کہ

''نسب میں تسامع کافی ہے، جب کہ مکذّب بیّن نہ ہو۔''(۱)

اس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ جو سید کہلاتا ہو اور یہ بات معروف ہو، تو اس کے سید ہونے کے لیے یہ کافی ہے۔ دوسرے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی یقینی دلیل سے اس کے سید ہونے کی تکذیب ہوتی ہو، تو پھر اس کو سید نہیں سمجھا جائے گا۔

موجودہ دور میں سیدوں کو زکات کا حکم

آج کے دور میں سیدوں کو زکات دینے کا کیا حکم ہے؟ پہلے تو ان کو غنیمت کے مال سے مل جاتا تھا؛ لیکن بعد کے دوروں میں یہ ختم ہو گیا، اور موجودہ دَور میں محتاج سیدوں کو اس کے سوا چارہ نہیں رہا کہ وہ زکات وصدقات وصول کر کے اپنا گزارہ کریں، تو کیا اب سیدوں کو زکات دینا جائز ہے؟

(۱) امداد الفتاوی:۲/۵۷

اس کا جواب یہ ہے کہ سیدوں یعنی بنی ہاشم کو زکات دینے کی حرمت منصوص ہے؛ کیوں کہ احادیث میں صراحت کے ساتھ اس سے منع کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر وہ نصوص گزر گئیں اور پھر یہ مسئلہ تمام امت کا اجماعی مسئلہ ہے جیسا کہ ائمہ کے اقوال بھی اس سلسلے میں پیش کیے گئے۔ ہاں! امام ابوحنیفہ - رحمہ اللہ - کی ایک روایت اس بارے میں یہ ہے کہ اب سیدوں کو زکات دینا جائز ہے اور اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ پہلے سیدوں کو مالِ غنیمت میں سے "خمس" یعنی پانچواں حصہ دیا جاتا تھا اور یہ بہ طورِ حقِ قرابتِ رسول ان کو ملتا تھا؛ مگر جب لوگوں نے مالِ غنیمت کے سلسلے میں کوتاہی کی اور سیدوں کو ان کا حصہ دینے سے پہلوتہی کی، تو ان کو زکات کی مد سے دینا جائز ہے۔ (۱)

لیکن امام صاحب - رحمہ اللہ - کا مذہب، جس پر اصحابِ متون نے اتفاق کیا ہے اور اس کو اپنے متون میں درج کرنے کا اہتمام کیا ہے، وہ یہی ہے کہ سیدوں کو کسی حال میں زکات دینا، جائز نہیں اور امام صاحب - رحمہ اللہ - کی اس دوسری روایت کو فقہا نے ضعیف قرار دے کر رد کیا ہے اور اکثر اصحابِ متون نے اس کا ذکر تک نہیں کیا ہے اور بعض نے صاف طرح سے اس روایت کے رد کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اور مذہب اسی کو قرار دیا ہے کہ سیدوں کو کسی حال میں بھی زکات دینا جائز نہیں۔

البتہ شوافع میں سے "علامہ ابوسعید اصطخری رحمہ اللہ" کہتے ہیں کہ

> "زکات سے سیدوں کو اس لیے محروم کیا گیا تھا کہ ان کو مالِ غنیمت کا خمس دیا جاتا تھا، جب ان کو اس میں سے نہیں ملتا ہے، تو ان کو زکات دینا واجب ہے؛ مگر خود حضراتِ شوافع نے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ مذہبِ شوافع تو یہی ہے کہ سیدوں کے لیے زکات جائز نہیں؛ کیوں کہ زکات کا ان کے حق میں حرام ہونا رسول اللہ - صلی اللہ علیہ وسلم - کی شرافت کی وجہ سے ہے

(۱) البحر الرائق :۲/۴۳۱، الشامي:۳/۲۹۹

اور یہ علت ان کو خمس نہ دیے جانے سے زائل نہیں ہو جاتی۔"(۱)

البتہ اکثر مالکیہ نے یہ لکھا ہے کہ اگر سیدوں کو ان کا بیت المال سے حصہ نہ پہنچے اور اس کی وجہ سے فقر و فاقہ ان کو مجبور کر دے، تو ان کو زکات دینا جائز ہے۔

علامہ خرشی۔ رحمہ اللہ۔ نے "مختصر خلیل" کی شرح میں اور علامہ دسوقی نے "الشرح الکبیر" کے حاشیے میں، علامہ صاوی۔ رحمہ اللہ۔ نے "بلغة السالک" میں لکھا ہے کہ

" مَحِلُّ عَدَمِ إِعْطَاءِ بَنِي هَاشِمٍ إِذَا أُعْطُوْا مَا يَسْتَحِقُّوْنَه مِنْ بَيْتِ المَال ، فَإِنْ لَمْ يُعْطَوْهُ و أَضَرَّبَهُمُ الفَقْرُ أُعْطُوْا مِنْهَا ، وَ إِعْطَاؤُهُمْ حِيْنَئِذٍ أَفْضَلُ مِنْ إِعْطَاءِ غَيْرِهِمْ ". (۲)

لیکن اسی کے ساتھ علامہ باجی مالکی۔ رحمہ اللہ۔ نے یہ قید بھی لگائی کہ یہ جواز اس وقت ہے کہ اضطرار یہاں تک پہنچا دے کہ مردار کا کھانا اس کو جائز ہو جائے، تو اس کے لیے زکات جائز ہے، اس شرط کو بعض فقہائے مالکیہ نے قبول کیا اور فرمایا کہ یہی ظاہر و متعین ہے اور بعض نے اس سے اختلاف کیا ہے، جیسا کہ اوپر کے حوالوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بہت سے مالکیہ کے یہاں بھی جواز ایک شرط سے مشروط ہے کہ حالت اضطرار ہو، ورنہ سیدوں کو زکات دینا ان کے یہاں بھی جائز نہیں ہے؛ ہاں بعض نے صرف حاجت کی وجہ سے بھی جائز قرار دیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ حنفیہ، شافعیہ و حنابلہ تو مطلقاً عدمِ جواز کے قائل ہیں اور یہی ان کا اصل مذہب ہے اور جو امام ابوحنیفہ اور علامہ اصطخری سے دوسری روایت جواز کی مروی ہے، اس کو حنفیہ و شافعیہ نے رد کر دیا ہے اور مالکیہ کے اکثر فقہا نے اگرچہ موجودہ حالات میں خمس نہ ملنے کی وجہ سے ان کو زکات دینے کا جواز اختیار کیا ہے؛ مگر

(۱) التنبيه لأبي إسحاق الشيرازي : ۵۲/۱، المهذب :۵۷۶/۱، المجموع لشرح المهذب:۶/ ۲۱۹، حلية العلماء للقفال:۵۴/۳

(۲) شرح الخليل للخرشي:۲۱۴/۲_الدسوقي على الشرح الكبير : ۴۹۲/۱، بلغة السالک:۱/ ۴۲۷

اس شرط سے کہ اضطرار پیدا ہو جائے اور اس کی وجہ سے مردار کھانا اس کو حلال ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ اس شرط کے ساتھ سبھی علما کے نزدیک سیدوں کو زکات دینا جائز ہوگا؛ کیوں کہ جب مردار کھانا ہی حلال ہو جائے، تو زکات کھانے میں کیا حرج ہو سکتا ہے، تو یہ ایک انتہائی مجبوری کی صورت کا حکم ہے۔

الغرض! اس روایت کی بنیاد پر فقہا نے جواز کو اختیار نہیں کیا؛ بل کہ ضرورت ہونے کے باوجود اس کو رد کیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ زکات کا ان کے حق میں منع ہونا، در اصل قرابتِ رسول و شرافتِ رسول کی وجہ سے ہے اور یہ بات ہر حال میں موجود ہے؛ لہٰذا جب علتِ منع موجود ہے، تو حکم بھی موجود و باقی ہے۔

اب رہا یہ کہ لوگ سیدوں کو دوسرے مدات سے نہیں دیتے، تو اس کا علاج یہ ہے کہ اس کے لیے ترغیب و تشویق کا اہتمام کرنا چاہیے اور بار بار توجہ دلانا چاہیے۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ یہی امت تو آج مدارسِ اسلامیہ اور مساجد کے لیے کروڑ ہا روپیہ خرچ کر رہی ہے اور ان کی تعمیرات پر خوب لگا رہی ہے اور یہ غیر زکات سے ہی خرچ کیا جا رہا ہے، تو کیا اگر لوگوں کو غیر زکات سے سیدوں کو دینے کی ترغیب دی جائے، تو لوگ ان پر خرچ نہیں کریں گے؟

لہٰذا بندے کے نزدیک ان حالات میں بھی سیدوں کو زکات کا جواز صحیح نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی سید کے حالات شدید فقر و پریشانی کے ہوں اور اس کو کوئی دوسرے مد سے دینے والا نہ ہو تو پھر امام ابوحنیفہ کی اس روایت پر اس کو زکات دینا جائز ہوگا۔ امام طحاوی –رحمہ اللہ– نے امام صاحب –رحمہ اللہ– کے قول کو نقل فرما کر کہا ہے کہ ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں اور بعض مفتیان کرام نے بھی اس زمانے میں اس پر فتوی دیا ہے؛ لہذا سخت مجبوری کی صورت میں ان کے قول کے مطابق، اگر سیدوں کو کوئی دوسرے مد سے دینے والا نہ ہو، تو اس پر عمل کرتے ہوئے ان کو زکات دینے کی گنجائش ہے۔

سید کی غیر سید بیوی کو زکات

ایک سوال آیا تھا کہ ایک شخص بہت محتاج ہے اور وہ سید بھی ہے؛ مگر اس کی عورت سید نہیں ہے اور وہ بھی غریب ہے، تو کیا اس عورت کو زکات دینا درست ہے اور اگر وہ عورت اس زکات کو اپنے شوہر پر استعمال کرے یا اس کو دے تو جائز ہوگا؟

جواب یہ دیا گیا:

اگر سید کی بیوی سید نہیں ہے، تو اس کو زکات دینے میں کوئی حرج نہیں، جب کہ وہ محتاج ہے۔ رہا یہ سوال کہ اگر وہ اپنے شوہر کو یہ رقم دے، یا اس پر خرچ کرے تو کیا حکم ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ جب ایک شخص نے اس عورت کو زکات دی، تو زکات دینے والے کی زکات ادا ہوگئی اور اب جو رقم اس عورت کے پاس ہے، وہ زکات کی رقم نہیں ہے، وہ زکات اس وقت تک تھی جب تک کہ وہ دینے والے کے ہاتھ میں تھی، جب اس نے محتاج کو دے دی اور وہ محتاج کے ہاتھ میں چلی گئی، تو اب وہ زکات کی رقم نہیں کہلائے گی؛ لہذا وہ اس کو جہاں چاہے، استعمال کرسکتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار حضرت بریرہ -رضی اللہ عنہا- جو باندی تھیں، انھوں نے حضرت عائشہ -رضی اللہ عنہا- کے پاس گوشت بھیجا، تو رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- نے ان سے فرمایا کہ اگر تم اسی گوشت کو آج پکا دو تو اچھا ہے! حضرت عائشہ -رضی اللہ عنہا- نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ گوشت بریرہ کو کسی نے صدقہ دیا تھا۔ مطلب یہ کہ آپ کے لیے تو صدقہ جائز نہیں ہے، اس لیے میں کیسے پکاؤں؟ اس پر آپ -صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا کہ ''هُوَ عَلَيْهَا صَدَقَةٌ وَهُوَ لَنَا هَدِيَةٌ'' کہ یہ بریرہ کے حق میں تو صدقہ ہے اور ہمارے لیے ہدیہ ہے۔ (۱)

اس کا یہی مطلب ہے کہ جب دینے والے نے بریرہ -رضی اللہ عنہا- کو زکات، یا صدقہ میں دیا، تو وہ ان کے لیے صدقہ ہوگیا اور پھر انھوں نے ہمیں دیا، تو وہ ہدیہ ہوگیا۔

---

(۱) أحمد: ۲۴۸۳۹

رشتے داروں میں سے کسے زکات نہیں دے سکتے؟

پہلے یہ عرض کیا گیا تھا کہ غریب رشتہ داروں کو زکات دینا افضل ہے؛ مگر چند رشتے دار ایسے ہیں، جن کو زکات نہیں دی جاسکتی، یہ رشتے دار کون کون ہیں؟ یہ کل تین قسم کے رشتے دار ہیں، جن کو زکات دینا جائز نہیں ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) ماں باپ اوران کے ماں باپ اوپر تک

ان میں سے ایک ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی ہیں، اگر چہ کہ اوپر تک چلے جائیں یعنی ان کے ماں باپ، پھر ان کے ماں باپ، ان میں سے کسی کو زکات دینا جائز نہیں۔

اور ماں باپ کو زکات دینے کے عدم جواز پر تمام ائمہ وعلماء کا اتفاق پایا جاتا ہے، لہذا اس پر اجماع ہے اوران کے علاوہ دوسرے رشتے داروں کے بارے میں بعض ائمہ کا اختلاف ہے۔

امام ابن قدامہ حنبلی - رحمہ اللہ - لکھتے ہیں کہ

”وَلَا يُعْطِيْ مِنَ الصَّدَقةِ المَفرُوْضَة لِلْوَالِدَيْن وإنْ عَلَوْا، وَلا لِلْوَلَدِ وإنْ سَفَلَ، قَالَ ابنُ المُنْذِر : أجْمَعَ أهْلُ العِلْمِ عَلى أنَّ الزكاةَ لا يَجُوْزُ دَفْعُهَا إلى الوَالِدَيْنِ“ .(۱)

اوراس کی وجہ یہ ہے کہ ماں باپ اور بچوں کے درمیان کا رشتہ ایسا ہے کہ ان کے منافع مشترک ہوتے ہیں؛ لہذا ماں باپ کو زکات دینے کا مطلب یہ ہوا کہ گویا خود کو دیا، لہذا اس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

علامہ ابن مفلح الحنبلی نے ”المبدع شرح المقنع“ ماں باپ کو اور اولاد کو زکات

---

(۱) المغني: ۹۸/۴

دینے کی ممنوعیت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”وَلَا إلَى الوَالِدَيْن وإنْ عَلَوًا ، ولا إلَى الوَلَدِ وإنْ سَفَلَ ؛ لاتِّصَال مَنَافِعِ المِلْكِ بَيْنَهُمَا عَادةً ، فَيَكُوْنُ صَارِفاً لِنَفْسِه “.(۱)

اور صاحب ہدایہ علامہ مرغینانیؒ لکھتے ہیں کہ

”ولا يَدْفَعُ المُزَكِّيْ زَكاةَ مَالِه إلَى أبِيْه وَجَدِّهِ وَإنْ عَلاَ ، وَ لَا إلَى وَلَدِه وَوَلَدِ وَلَدِهِ وَإنْ سَفَلَ ؛ لأنَّ مَنَافِعَ الأمْلاكِ بَيْنَهُم مُتَّصِلَةٌ ، فَلا يَتَحَقَّقُ التَّمْلِيْكُ عَلى الكَمَالِ “.(۲)

اور امام علاء الدین دہلویؒ نے ”فتاوی التاتارخانية“ میں لکھا ہے کہ

”وَلَايُعْطِيْ مِنَ الزَّكَاةِ وَالِداً وَإنْ عَلاَ ، ولاَ وَلَداً وإنْ سَفَلَ ، وفي الخَانِية: مِنْ قِبَلِ الذُّكُوْرِ والإنَاثِ “.(۳)

(۲) اولاد اور ان کی اولاد نیچے تک

دوسرے اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد، بیٹے، بیٹیاں، ان کے بچے: پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں، پھر ان کی اولاد، ان میں سے بھی کسی کو زکات دینا جائز نہیں۔ یہ بھی اجماعی مسئلہ ہے۔

علامہ ابن المنذر رحمہ اللہ نے ”الإشرافُ على مذاهب العلماء“ میں صراحت کی ہے کہ

” أجْمَعَ أهلُ العِلْم على أنَّ الزكاةَ لايَجُوْزُ دَفْعُهَا إلى الوَالِدَيْن ، ولا إلى الوَلَدِ في الحَالِ الَّذِيْ يُجْبَرُ الدَّافِعُ إلَيْهِمْ

(۱) المبدع شرح المقنع:۲/۴۲۰

(۲) الهداية :۲/۲۲۴]

(۳) فتاوى التاتارخانية :۳/۲۰۶

عَلَى النَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ" . (۱)

اوراس کی وجہ وہی ہے جواوپر بیان کی گئی کہ ماں باپ اوراولاد میں ایسا رشتہ پایا جاتا ہے کہ ان کے درمیان منفعت بھی مشترک رہتی ہے، ماں کو بیٹا زکات دے، تو گویا خود کو دیا ہے، اسی طرح بیٹا باپ کو زکات دے گا، تو وہ مال کہاں گیا، وہیں اپنے ہی گھر میں ہے اور اگر ماں یا باپ نے اپنی اولاد کو زکات دی، تو گویا اپنے ہی اوپر زکات خرچ کی، اس لیے ان میں آپس میں زکات نہیں دی جاسکتی۔

(۳) میاں بیوی آپس میں زکات نہیں دے سکتے

تیسرے میاں بیوی ایک دوسرے کو زکات نہیں دے سکتے اور جہاں تک شوہر کے بیوی کو نہ دینے کا مسئلہ ہے، اس پر فقہاء کا اجماع ہے؛ کیوں کہ بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے۔

علامہ ابن المنذر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ

"أَجْمَعَ أَهْلُ العِلْمِ عَلَى أَنَّ الرَّجُلَ لايُعْطِيْ زَوْجَتَه مِنَ الزَّكَاةِ ؛ لأَنَّ نَفْقَتَهَا تَجِبُ عَلَيه وَهِيَ غَنِيَّةٌ بِغِنَاهُ."(۲)

اسی طرح علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ نے بھی اس پر اجماع کا ذکر کیا ہے کہ مرد اپنی بیوی کو زکات نہیں دے سکتا۔(۳)

رہا یہ کہ بیوی شوہر کو زکات دے سکتی ہے یا نہیں؟ اس میں بعض ائمہ کا اختلاف ہے اور امام ابوحنیفہ، امام احمد اور امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ بیوی اپنی زکات میں سے شوہر کو نہیں دے سکتی۔

"الهدايه" اور اس کی شرح "البناية" میں ہے کہ

---

(۱) الإشراف على مذاهب العلماء:۱۰۳/۳

(۲) المغني : ۱۰۰/۴

(۳) الإشراف على مذاهب العلماء:۱۰۴/۳

"وَلَاتَدْفَعُ المَرأَةُ أي الزكاةَ إلى زَوْجِهَا عندَ أبي حنيفةَ ؛ لِمَا ذَكَرْنَا؛ أي لِلاشْتِرَاکِ فِيْ المَنَافِعِ . و بِهِ قَالَ مالکٌ ، وأحمدُ ، واخْتَارَهُ الحربي وأبوبكر مِنَ الحَنَابِلَة ". (۱)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ بیوی کا شوہر کو زکات دینے کا عدم جواز اس بنا پر ہے کہ میاں بیوی بھی ایک ایسے رشتے میں پروئے ہوئے ہیں کہ ان میں سے ایک کی منفعت دوسرے سے متعلق ہوتی ہے،اس لیے نہ میاں بیوی کو زکات دے سکتا ہے، نہ بیوی میاں کو دے سکتی ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا مسلک امام شافعیؒ، حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اور مالکیہ میں سے امام اشہب کا ہے، یہ حضرات کہتے ہیں کہ بیوی اپنے شوہر کو زکات دے سکتی ہے،اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

پھر امام شافعی –رحمہ اللہ– اور امام اشہب –رحمہ اللہ– کے نزدیک شوہر کو دینا ایک روایت میں مکروہ ہے، یعنی اس کو بیوی اگر زکات دے، تو ادا ہو جائے گی؛ مگر ایسا کرنا مکروہ ہے اور امام شافعی –رحمہ اللہ– سے دوسری روایت یہ ہے کہ فقیر شوہر کو صدقہ وزکات دینا دوسروں کو دینے سے افضل ہے۔

"هدايه" میں امام مرغینانیؒ اور "البناية" میں امام عینیؒ لکھتے ہیں کہ

"وقَالَا: تَدْفَعُ إلَيْهِ أي قَالَ أبُويُوسُفَ ومُحَمّدٌ : تَدْفَعُ المَرْأةُ زَكَاتَهَا إلَى زَوْجِهَا ، وَبِهِ قَالَ الشَّافِعِيُّ و أشْهَبُ مِنَ المَالِكِيَّةِ . وقَالَ القُرَافِي : كَرِهَهُ الشَّافِعِي و أشْهَبُ ، قُلْتُ: حَكَى الثَّوْرِيُّ : أنَّ زَوْجَهَا أفْضَلُ عِنْدَ الشَّافِعِي ". (۲)

اور "فتاوى التاتارخانية" میں لکھا ہے کہ

(۱) الهداية :۲/۲۲۴، البناية :۳/۵۵۰

(۲) الهداية :۱/۲۲۴، البناية :۳/۵۵۰

"وَكَذَا لاتُعْطِي الْمَرْأَةُ زَوْجَهَا عندَ أبي حنيفة، وعندهما تُعْطِيْهِ ، وفي شَرْحِ الطَّحَاوِي :وهُوَ قَوْلُ الشَّافِعِي. وكَذَلِکَ هٰذَا الحُكْمُ في صَدَقَةِ الفِطْرِ، والنُّذُوْرِ، وَالكَفَّارَاتِ ، و العُشُوْر". (۱)

یہ حضرات اس سلسلے میں ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں، وہ یہ کہ ایک بار اللہ کے رسول اللہ–ﷺ–نے عورتوں کوصدقہ دینے کی ترغیب دی،تو حضرت عبداللہ بن مسعود–رضی اللہ عنہ–کی بیوی زینبؓ نے رسول اللہ–ﷺ–کے پاس گھر جا کر پوچھا کہ کیا اگر میں میرے شوہر کو صدقہ دوں،تو درست ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا کہ

" لَکِ أجْرَان: أجْرُ الصَّدَقَةِ وَأجُرُ الصِّلَةِ "

(اس میں تجھے دو اجر ملیں گے:ایک رشتے داری کا اور ایک صدقہ کا)(۲)

ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ حضرت زینبؓ نے آپ–ﷺ–کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے صدقہ کا حکم دیا ہے اور میرے پاس زیورات ہیں،جن کا میں صدقہ کرنا چاہتی تھی،مگر عبداللہ بن مسعود کا خیال یہ ہے کہ وہ اور ان کی اولاد اس صدقے کی زیادہ حق دار ہے جو میں کروں؟ اس پر اللہ کے رسول–ﷺ–نے فرمایا کہ

"صَدَقَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ ، زَوْجُکِ وَوَلَدُکِ أحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتِ بِهِ عَلَيْهِمْ". (۳)

(۱) فتاوی التاتارخانية:۲۰۷/۳

(۲) البخاري: الزكاة/ باب الزكاة على الزوج ،۱۴۶۶، مسلم: الزكاة/ باب فضل النفقة والصدقة على الاقربين ،۱۰۰۰

(۳) البخارى: كتاب الزكاة ، باب الزكاة على الأقارب: ۱۴۶۲ ، صحيح ابن خزيمة: ۲۴۶۲ ،صحيح ابن حبان: ۵۷۴۴، شرح السنة للبغوي: ۱۸۷/۶ .

(ابن مسعود نے ٹھیک کہا ہے، تمہارا شوہر اور تمہارے بچے تمہارے صدقے کے زیادہ حق دار ہیں)

اس حدیث سے یہ حضرات اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ بیوی اپنی زکات شوہر کو دے سکتی ہے؛ مگر یہ استدلال اس پر موقوف ہے کہ یہ بات ثابت ہو کہ آپ نے یہ زکات کے بارے میں فرمایا تھا؛ حالاں کہ یہ بات ثابت نہیں؛ کیوں کہ یہاں زکات مراد ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

اس کے برخلاف یہاں عام نفلی صدقہ مراد ہونے کی دلیل وقرینہ پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مذکورہ بالا حدیث میں ایک تو یہ آیا ہے کہ حضرت زینب نے عرض کیا کہ" میں اپنے زیورات کا صدقہ دینا چاہتی ہوں"، اور امام شافعیؒ کے نزدیک زیورات پر زکات ہی فرض نہیں ہوتی، تو اس میں وہ زکات کیسے مراد لے سکتے ہیں؟ نیز اس حدیث میں اللہ کے رسول کا ارشاد آیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ" تمہارے صدقے کے زیادہ حق دار تمہارے شوہر اور اولاد ہیں"، سوال یہ ہے کہ کیا اولاد کو زکات دی جاسکتی ہے؟ نہیں اور اس پر ہم نے اوپر علماء کا اجماع نقل کیا تھا، معلوم ہوا کہ یہاں آپ کی مراد نفلی صدقہ ہے زکات نہیں۔

چناں چہ امام احمد -رحمہ اللہ- اور امام اعمش -رحمہ اللہ- کہتے ہیں کہ اس حدیث میں زکات مراد نہیں ہے؛ بل کہ زکات کے علاوہ صدقہ مراد ہے۔ (۱)

ہاں! اس سلسلے کی بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ یہ سوال و جواب زکات کے بارے میں ہوا تھا، مگر معلوم ہونا چاہیے کہ ان روایات کے بارے میں امام احمدؒ کہتے ہیں کہ وہ روایات میرے نزدیک غیر محفوظ ہیں۔ (۲)

الغرض اس حدیث سے اس بات پر استدلال کہ بیوی اپنے شوہر کو زکات دے سکتی ہے، محل نظر وقابل اشکال ہے اور ناقص ہے۔

(۱) دیکھو: المغني:۱۰۲/۴

(۲) دیکھو: المغني:۱۰۲/۴

سوتیلی ماں یا سوتیلے باپ اور داماد اور بہو کو زکات

ماں باپ کو زکات دینے کا عدم جواز جو بیان کیا گیا، اس سے مراد حقیقی ماں باپ ہیں، اور جو سوتیلے ماں و باپ ہوں، ان کو زکات دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

چناں چہ "فتاوی التاتارخانیة" میں ہے اور اسی کے حوالے سے امام شامیؒ نے "ردُّ المُحتار" میں لکھا ہے کہ:

"ویَجُوْزُ دَفْعُهَا لِزَوْجَةِ أبِيْهِ وابْنِه وَ زَوْجِ ابْنَتِه". (۱)

اسی طرح داماد اور بہو اگر محتاج ہوں، تو ان کو بھی زکات دی جا سکتی ہے، جیسا کہ اوپر کی عبارت میں ہے۔

ساس اور سسر کو زکات دینے کا حکم

ایک سوال بعض لوگوں کی جانب سے پیش کیا جاتا ہے، کہ کیا کوئی شخص اپنے سسر اور ساس کو زکات دے سکتا ہے، اگر وہ محتاج ہوں؟ یا ان کو ماں باپ کی طرح زکات دینا منع ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ساس یا سسر کو زکات دینا جائز ہے، جب کہ وہ محتاج ہوں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ بل کہ رشتے داری ہونے کی وجہ سے افضل ہے؛ کیوں کہ یہ ان رشتوں میں سے نہیں ہیں، جن کو زکات دینا منع ہے۔

چناں چہ علامہ کاسانی –رحمہ اللہ– لکھتے ہیں کہ

"وَيَجُوْزُ دَفْعُ الزَّكَاةِ إلَى مَنْ سِوَى الوَالِدَيْنِ والمَوْلُوْدِيْن مِنَ الأقَارِب، ومِنَ الإخوةِ، والأخَوَات وغَيْرِهم". (۲)

---

(۱) فتاوی التاتارخانیة: ۲۱۱/۳، شامي: ۲۹۳/۳

(۲) بدائع الصنائع: ۴۸۴/۲

اور پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ تین رشتوں (ماں باپ، اولاد اور میاں بیوی) کے علاوہ دیگر رشتوں میں زکات دینا جائز ہے؛ لہٰذا اسسر اور ساس کو بھی زکات دی جاسکتی ہے؛ بل کہ جس طرح رشتے داروں کو زکات دینا زیادہ ثواب کا باعث ہے، اسی طرح یہ بھی چوں کہ ایک رشتے داری ہے، لہٰذا اساس اور سسر کو بھی زکات دینا نہ صرف جائز، بل کہ زیادتی اجر کا باعث ہے۔

رہا یہ شبہ کہ ساس وسسر ماں باپ کے برابر ہیں، تو ان کو زکات دینا کیسا جائز ہوسکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ساس سسر ماں باپ کے قائم مقام ہیں، مگر یہ حقیقی ماں باپ کی طرح نہیں ہیں، دیکھیے حدیث میں خالہ کو بھی ماں کا درجہ دیا گیا ہے، چناں چہ ایک حدیث میں رسول اللہ – صلی اللہ علیہ وسلم – نے فرمایا کہ: ''**الخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الأمّ**'' اور ایک حدیث میں فرمایا کہ: ''**إنَّ الخَالَةَ وَالِدَةٌ**''۔(۱)

مگر سب کو معلوم ہے کہ خالہ کو بھی زکات دینا جائز ہے، اسی طرح یہاں سمجھنا چاہیے کہ ساس سسر ماں باپ کی طرح ہونے کے باوجود ان کو زکات دی جاسکتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایک چیز میں دو دو تین تین حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک حیثیت سے ایک حکم ہوتا ہے اور دوسری حیثیت سے دوسرا حکم ہوتا ہے۔ ساس اور سسر ماں باپ کی طرح ہیں، لہٰذا اساس وسسر کی عظمت وخدمت ماں باپ کی طرح کرنا چاہیے؛ لیکن وہ حقیقی ماں باپ کی طرح نہیں ہیں، اس لیے ان کو زکات دے سکتے ہیں۔



بحث دھم

زکات کے سلسلے کی بعض کوتاہیاں

بحث دھم
زکات کے سلسلے کی بعض کوتاہیاں

اس بحث میں ہم زکات کے سلسلے میں بعض اغلاط اور کوتاہیوں کا ذکر کریں گے، جو عموماً واقع ہوتی ہیں؛ تاکہ زکات کو ادا کرتے ہوئے ان سے بچنے کا بھی اہتمام کیا جائے اور ہماری یہ اہم عبادت اغلاط و کوتاہیوں سے خالی ہو کر عند اللہ مقبول و منظور ہو سکے۔

❑ زکات کی ادائیگی میں غفلت

ایک بڑی کوتاہی اور غفلت بعض لوگوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ زکات ہی ادا نہیں کرتے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے: حالاں کہ زکات کا فرض ہونا معلوم ہے اور فرض میں غفلت کا سخت وبال اور اس پر شدید وعید قرآن وحدیث میں وارد ہوئی ہے۔لہذا ایسے لوگوں کو ان آیات اور احادیث کا مطالعہ کرنا چاہیے ،جن میں زکات کی اہمیت و فرضیت اور اس کے فوائد و برکات ، نیز اس میں کوتاہی وغفلت پر وعیدوں کا ذکر آیا ہے۔ہم نے اس کتاب کے شروع میں ان میں سے چند کا ذکر کیا ہے،ان کا دیکھنا بھی مفید ہوگا۔

اس سلسلے میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی- رحمہ اللہ- نے اپنی انقلاب آفریں کتاب ”اصلاحِ انقلابِ امت“ میں توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ایک کوتاہی تو جو سب سے بڑی ہے، یہ ہے کہ بعض لوگ زکات

ہی نہیں دیتے۔اس کی اصلاح یہ ہے وہ لوگ زکات کی تاکید وفرضیت کے نصوص اوراس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں، ان کو دیکھیں، سنیں، غور کریں اوراس کا جو اصلی سبب 'بخل' ہے، اس کا علاج کریں۔اس علاج کا حاصل مال کی محبت گھٹانا ہے، جس کی سب سے اچھی تدبیر موت کا بکثرت یاد کرنا اور یاد رکھنا ہے۔(۱)

زکات کی ادائیگی میں تاخیر اوراس کے بہانے

زکات کے سلسلے میں ایک کوتاہی بعض لوگوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ بلا کسی وجہ کے اس کی ادائیگی میں تاخیر کرتے جاتے ہیں، حالاں کہ بہت سے علماء کا مسلک یہ ہے کہ زکات علی الفور واجب ہے، اگر چہ بعض کا مسلک یہ ہے کہ علی الفور واجب نہیں، مگر بلا وجہ تاخیر کرنا تو سب کے نزدیک مکروہ و برا ہے۔لہذا واجب ہوتے ہی، جلد سے جلد اس کی ادائیگی کی کوشش کرنا چاہیے اور بلا وجہ تاخیر نہ کرنا چاہیے۔

علامہ ابن الجوزی – رحمہ اللہ – نے "**منهاج القاصدين**" میں لکھا ہے کہ:

"زکات دینے والے پر ایک بات یہ بھی لازم ہے کہ وہ سال پورا ہوتے ہی زکات نکال دے، اگر دینے کی قدرت ہونے کے باوجود تاخیر کیا، تو گناہ گار ہوگا، اور اگر نکالنے سے پہلے اور سال پورا ہونے کے بعد مال ہلاک ہو گیا، تو زکات اس سے ساقط نہ ہوگی"۔(۲)

بعض لوگ اس میں مختلف قسم کے بہانے بناتے ہیں: کوئی بچیوں کی شادی کا عذر کرتا ہے کہ جب شادی ہوجائے گی، تب زکات ادا کروں گا، کوئی بچوں کی تعلیم کے لیے اخراجات کا بہانہ کرتا ہے، کوئی یہ کہتا ہے کہ ابھی کاروبار مندا ہے؛ حالاں کہ وہ مالک

---

(۱) اصلاح انقلاب امت: ۱/۱۴۴

(۲) **منهاج القاصدين**: ۱۶۴

نصاب ہوتا ہے، اور کاروبار کے مندا ہونے سے زکات معاف نہیں ہوتی ، اور نہ شادی یا تعلیمی اخراجات کا ہونا مانع زکات ہے۔

اور بعض لوگ ایک عجیب بہانہ کرتے ہیں کہ ہمارے پاس زکات ادا کرنے کے لیے رقم اور روپیہ نہیں ہے؛ حالاں کہ ان کے پاس مختلف قسم کا مال ہوتا ہے، خصوصاً عورتیں یہ کہتی ہیں کہ ہمارے پاس زیور تو ہے؛ لیکن زکات ادا کرنے کے لیے رقم نہیں ہے۔ یہاں سمجھ لینا چاہیے کہ یہ عذر لنگ ہے، جس کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں۔ اگر رقم نہیں ہے، تو جو مال موجود ہے، زکات اسی میں سے دینا لازم ہے، مثلاً زیور ہے، تو زیور کی زکات زیور کی شکل میں یا اس کو بیچ کر رقم حاصل کر کے ادا کرنا چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے زیور یا اور کوئی مال دیا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے لیے اس میں سے نہ دینا اور یہ عذر کرنا نہایت بری بات ہے۔

الغرض ان وجوہات کی وجہ سے زکات میں تاخیر کرنا جائز نہیں، لہذا چاہیے کہ جب زکات واجب ہو جائے، تو جلد سے جلد اس کو ادا کر دے۔

☐ زکات میں ریا کارانہ انداز

ایک بڑی کوتاہی یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ بعض مال دار لوگ زکات کی تقسیم کرنے کا ایک دن مقرر کر کے اپنے گھروں اور بنگلوں کے پاس فقراء و غرباء کو جمع کرتے ہیں اور ان کی لائن لگا کر زکات کی تقسیم کرتے ہیں۔

اگر چہ کہ کوئی عمل بلا ریا کاری کے علانیہ طور پر کرنے میں شرعاً کوئی حرج تو نہیں ہے ، جیسا کہ اپنی جگہ اس کے دلائل مذکور ہیں؛ کیوں کہ بلا ریا کاری کے علانیہ عمل بھی قابل قبول ہے؛ لیکن یہاں جس طرز عمل کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں ریا کارانہ جذبہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے، جب کہ ہمیں حکم مخلصانہ جذبے کے ساتھ عبادات کی انجام دہی کا دیا گیا ہے اور اس عمل کو باطل کہا گیا ہے، جو ریا کاری کے جذبے سے انجام دیا گیا ہو۔

ایک حدیث میں حضرت انس بن مالک -رضی اللہ عنہ- سے مروی ہے کہ رسول اللہ -صلی اللہ علیہ وسلم- نے ارشاد فرمایا کہ

« إنَّ العَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلاً فِي السِّرِّ فَيَكْتُبُهُ اللّٰهُ لَهُ سِرّاً ، فَإنْ أظْهَرَهُ نَقَلَ مِنَ السِّرِّ وَكَتَبَ فِي العَلانِيَةِ ، فَإنْ تَحَدَّثَ بِهِ نَقَلَ مِنَ السِّرِّ وَالعَلانِيَةِ وَكَتَبَ رِيَاءً ».

(بلاشبہ بندہ کوئی عمل مخفی طور پر کرتا ہے،تو اس کو اللہ تعالیٰ مخفی عمل میں لکھ لیتے ہیں، پھر اگر وہ اس کو ظاہر کرتا ہے،تو علانیہ میں لکھ دیتے ہیں اور اگر وہ لوگوں میں بیان کرتا ہے،تو اس کو ریاء میں لکھ دیتے ہیں)(1)

لہذا ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے،جس سے ہمارا عمل باطل ہوجائے،بل کہ پورے اخلاص کے ساتھ انجام دینا چاہیے اور سب سے بہتر تو یہ ہے کہ عام حالات میں مخفی طور پر خرچ کیا جائے،یہ زیادہ ثواب کا باعث ہے۔

□ زکات وصدقہ دے کر محتاجوں پر احسان سمجھنا

حقیقت سے نا آشنا لوگ فقراء وغرباء کو زکات وصدقہ دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ان پر احسان کیا ہے؛ حالاں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے کہ فقراء وغرباء کا مال داروں پر احسان ہے۔

وجہ یہ کہ ان فقراء وغرباء کی وجہ سے مال دار اپنی زکات ان کو دے کر اپنی جنت اور اللہ کی رضا حاصل کرتا ہے۔اگر یہ فقراء وغرباء نہ ہوتے، یا ان کی زکات نہ لیتے،تو ان کے لیے بڑی پریشانی پیش آتی،لہذا یہ فقراء تو شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ان کی زکات کے مصرف میں پہنچنے کا خود کو واسطہ وذریعہ بنایا۔

اسی کو امام ابن الجوزی -رحمہ اللہ- کہتے ہیں کہ

(1) تخريج الإحياء للعراقي :۲۵۵/۱

"ولو حَقَّقَ النظر لرأى الفقيرَ مُحْسِناً إلَيْه بِقَبُولِ حَقِّ اللّٰه الذي هو طُهْرَةٌ له . ولَوْ كانَ على الإنْسَانِ دَيْنٌ لإنسانٍ، فأحَالَ بِهِ عَبْدَهُ الَّذِيْ هو مُتَكَفِّلٌ بِرِزْقِه، فاعْتَقَدَ مُؤَدِّي الدَّيْن أنّ القَابِضَ تَحْتَ مِنَّتِه كَانَ سَفِيهاً؛ لأنَّ المُحْسِنَ إلَيْهِ هُو المُتَكَفِّلُ بِرِزْقِه ، لَا مُؤَدِّي الدَّيْن".

(اگر غور وفکر سے کام لیا جائے، تو نظر آئے گا کہ فقیر ہی دراصل اس کا محسن ہے، بایں وجہ کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے اس حق کو قبول کیا جو اس مال دار کے حق میں پاکی کا ذریعہ ہے۔ اگر کسی شخص کا دوسرے آدمی پر قرض ہو اور وہ شخص اس قرض کو اپنے غلام کو دینے کے لیے کہہ دے، جس کے نان نفقے کا وہ ذمے دار ہے، اور وہ قرض ادا کرنے والا اس کو قرض دے کر یہ سمجھے کہ یہ قرض وصول کرنے والا میرا احسان مند ہے، تو وہ بے وقوف ہوگا؛ کیوں کہ اس پر احسان کرنے والا تو خود یہ غلام ہے، جو اپنے آقا کی ذمے داری میں ہے، نہ کہ یہ قرض ادا کرنے والا)

الغرض زکات وصدقہ دینے والے کا کوئی احسان فقراء ومساکین پر نہیں ہے، بل کہ یہ فی الواقع اللہ کے دیے ہوئے مال کو اللہ کے ان بندوں تک پہنچا رہا ہے، جن کو دینے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ جیسے اوپر کی مثال میں ایک شخص نے اپنا قرض اپنے غلام کو دینے کا حکم دیا تھا، تو اس کو دینے سے دینے والے کا کوئی احسان اس غلام پر نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مال اللہ کے بندوں کو پہنچانے سے، پہنچانے والے کو احسان کرنے والا نہیں سمجھا جا سکتا؛ بل کہ احسان تو اللہ کا ہے اور پھر ان فقراء کا جو اللہ کے حکم کے مطابق اپنا حق وصول کر رہے ہیں اور دینے والے کے لیے جنت ورضائے الٰہی کا ذریعہ وسبب بن رہے ہیں۔

---

(۱) منهاج القاصدين:۱٦٧

زکات دے کر احسان جتانا یا تکلیف پہنچانا قابل مذمت ہے

زکات دینا جس قدر قابل تعریف اور لائق ثواب کام ہے، اس کو انجام دے کر فقراء وغرباء پر احسان جتانا یا کسی انداز سے ان کو تکلیف پہنچانا اسی قدر مذموم و برا ہے؛ لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ اس میں مبتلا ہوتے ہیں کہ زکات یا صدقہ فقراء وغرباء کو دے کر اپنا احسان سمجھتے اور بعض اوقات اس کو جتاتے ہیں اور اپنے طرزِ عمل سے ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔

مثلاً زکات وصدقہ دینے کا انداز نہایت متکبرانہ اختیار کرتے ہیں یا ان کی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں، یا انھیں کوئی بری بات کہہ دیتے ہیں کہ جس سے سائلین کو تکلیف ہوتی ہے، یہ سب افعال اسلام ہی میں نہیں، انسانی اقدار میں بھی قبیح و برے ہیں اور اس سے زکات وصدقات کی قبولیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ:۲۶۴]

(اے ایمان والو! تم احسان جتلا کر، یا ایذاء پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، پس اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر ہے، جس پر مٹی پڑی ہو، پس اس پر زور کی بارش ہوئی، تو اس کو بالکل صاف کر دیا۔ ایسے لوگوں کو ان کا عمل کچھ بھی ہاتھ نہ لگے گا اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں دیتے)

مفسرقرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ﷺ۔اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

"اس سے واضح ہوگیا کہ جس صدقہ و خیرات کے بعد احسان جتلانے یا مستحقین کوایذاء پہنچانے کی صورت ہوجائے، وہ صدقہ باطل کالعدم ہے،اس پرکوئی ثواب نہیں"۔(۱)

اس آیت میں جو"المَنّ"(احسان جتلانا)اور"الأذٰی"(تکلیف دینا)کے الفاظ آئے ہیں،اس کی مراد کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔

امام غزالیؒ نے نقل کیاہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ:

"مَنْ مَنَّ فَسَدَتْ صَدَقَتُهُ"(کہ جس نے احسان جتلایا،اس کا صدقہ فاسد ہوگیا) آپ سے پوچھا گیا کہ احسان جتلانا کیا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ احسان کا ذکر کرنا اور لوگوں سے اس کو بیان کرنا احسان جتلانا ہے۔(۲)

بعض حضرات علماء نے کہا ہے کہ احسان جتلانا یہ ہے کہ فقیر کو دے کر اس سے خدمت لے اوراذی یہ ہے کہ فقیر کو عار دلائے،اوربعض نے کہا کہ احسان جتلانا یہ ہے کہ فقیر کوصدقہ دے کر اس پر تکبر کرے،اوراذی یہ ہے کہ اس کوجھڑکی دے یا مانگنے کی وجہ سے اس کوڈانٹ ڈپٹ کرے۔(۳)

امام غزالی۔ﷺ۔"احیاءالعلوم"میں کہتے ہیں کہ

"احسان جتلانا یہ ہے کہ اس کو ظاہر کرے یا لوگوں سے بیان کرے،اس کے بدلے میں شکریہ یا دعاء چاہے،یا اس کے عوض اپنی خدمت یاتوقیروتعظیم چاہے،یااس کے بدلے میں اپنے حقوق کا مطالبہ یا

(۱) معارف القرآن:۱/۶۳۳

(۲) احیاءالعلوم:۱/۲۱۶

(۳) احیاءالعلوم:۱/۲۱۶

مجالس میں آگے بڑھانے اور اپنی بات ماننے کی چاہت کرے۔ یہ سب
باتیں احسان جتلانے کے باطنی نتائج ہیں۔ اور اذی یہ ہے کہ فقراء کو
ڈانٹ ڈپٹ کرے، ان کو عار دلائے، ان سے سخت کلامی کرے، چہرہ
بگاڑے، ان کی ہتک عزت کرے اور تحقیر و توہین کرے۔ (۱)

لہذا زکات وصدقات دینے والوں کو اس کا بہت پاس ولحاظ کرنا چاہیے کہ اس میں اپنا کوئی احسان نہ سمجھیں اور نہ جتلائیں اور اپنے کسی قول یا عمل سے فقراء وغرباء کی تحقیر نہ کریں اور نہ ایذاء پہنچائیں۔

□ کچھ مال کی زکات دینا اور کچھ کی نہ دینا

زکات کے سلسلے میں بعض لوگوں کی جانب سے ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ اپنے تمام مالوں کی زکات نہیں دیتے، بل کہ بعض اموال کی زکات نکالتے ہیں اور بعض کی نہیں دیتے اور ان کو حساب ہی میں نہیں لیتے۔

مثلاً روپیہ پیسے کی زکات دے دیتے ہیں، لیکن جو زمین یا مکان بیچنے کے لیے ہوتا ہے، اس کی زکات نہیں نکالتے۔

بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ بینک میں جمع شدہ اپنی رقومات کی زکات اس لیے نہیں دیتے کہ وہ رقم اپنے پاس نہیں ہے؛ حالاں کہ زکات کی رقم خواہ اپنے پاس ہو یا کہیں رکھی ہو، سب پر زکات ہے۔

اسی طرح بعض لوگ اپنے ہاتھ میں جو مال ہے، اس کی زکات نکال دیتے ہیں، لیکن جو ان کو قرض میں یا کسی اور طرح وصول ہونے والا مال ہے، اس کی زکات نہیں دیتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مال ہمارے پاس نہیں ہے، اس لیے ان کی زکات نہیں ہے۔

اور اس غلطی کی بنیادی وجہ علم کی کمی ہوتی ہے کہ ان کو معلوم ہی نہیں کہ کن کن مالوں پر

(۱) احیاء العلوم: ۱/۲۱۷

زکات عائد ہوتی ہے، لہذا ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ زکات کے سلسلے میں لکھی ہوئی کتابوں کو پڑھیں یا کسی معتبر و مستند عالم سے مسائل معلوم کر کے عمل کریں۔ اس کتاب میں ہم نے بھی اس کی پوری وضاحت و تفصیل پیش کر دی ہے، کہ کن کن مالوں پر زکات لاگو ہوتی ہے اور کن مالوں پر زکات عائد نہیں ہوتی۔

زکات محض اندازے سے نکالنا

یہ بات ہم نے پہلے بیان کر دی ہے کہ زکات حساب کر کے نکالنا چاہیے؛ تا کہ اپنے مال کی زکات مکمل ادا ہو جائے اور یہ کہ محض اندازے و تخمینے سے نہیں نکالنا چاہیے۔ اس سلسلے میں بھی بہت سے لوگ غلطی و کوتاہی کرتے ہیں اور زکات نکالنے سے پہلے کوئی حساب نہیں لگاتے کہ کیا اور کتنا مال موجود ہے اور یہ کہ ہمیں اس پر کتنی زکات نکالنا ہے؛ بل کہ محض ایک اندازہ کر کے کچھ زکات دے دیتے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ اس طرح زکات دینے سے یہ اندیشہ ضرور رہتا ہے کہ مکمل مال کی زکات نہ ادا ہوئی ہو، اگر خدانخواستہ مثال کے طور پر کسی کی زکات ایک لاکھ روپے ہوتی ہوں اور وہ محض ایک اندازہ کر کے اسی ہزار یا نوے ہزار کی زکات دے دی، تو جو بیس یا دس ہزار کی نہیں دی ہے، اس کا گناہ لازم آئے گا۔

اس لیے اولاً تو اپنی بساط بھر کوشش کرنا چاہیے کہ مال کا پورا حساب لگایا جائے، اور اس کا طریقہ ہم نے اس کتاب میں بیان کر دیا ہے، اس کو دیکھ لیا جائے اور اس کے مطابق زکات دی جائے۔ پھر پورا حساب کر کے بھی مزید اطمینان کے لیے کچھ زیادہ دیدینا مناسب ہے؛ تا کہ عند اللہ سرخ روئی نصیب ہو اور کمی کی وجہ سے کوئی پکڑ نہ ہو۔

حساب زکات میں غلطیاں

بعض لوگ حساب تو کرتے ہیں، مگر حساب کرنے میں بعض غلطیاں کر جاتے ہیں، اس سلسلے میں حضرت حکیم الامت تھانوی -رحمہ اللہ- نے ''اصلاح انقلاب امت'' میں بعض

امور کی جانب توجہ دلائی ہے، ہم یہاں ان امور کا اپنے الفاظ میں ذکر کریں گے اور بعض اور باتوں کو بھی ذکر کریں گے۔

(۱) اس سلسلے میں ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ مال تجارت میں اپنی خرید یا لاگت کا حساب لگا لیتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص نے ایک ہزار روپے میں کچھ کتابیں تاجرانہ قیمت پر خریدیں یا اپنے پریس میں چھاپیں، مگر ان کی قیمت بازار میں دو ہزار ہے، تو زکات دو ہزار کی دینا چاہیے؛ مگر لوگ اپنی خریدی یا لاگت پر زکات کا حساب کرتے ہیں۔ حالاں کہ زکات لاگت پر نہیں؛ بل کہ اس قیمت پر آتی ہے جو زکات دیتے وقت بازار میں ہوتی ہے۔

(۲) ایک غلطی حساب میں یہ کی جاتی ہے کہ اکثر لوگ رمضان میں زکات نکالتے ہیں؛ حالاں کہ ان کی زکات کا سال مالک نصاب ہونے کے لحاظ سے اس سے پہلے کسی اور مہینے سے ہوتا ہے، تو یہ زکات نکالنے والا اپنے مال کا حساب رمضان سے لگاتا ہے جب کہ اس کو اس تاریخ سے مال کا حساب لگانا چاہیے، جس سے اس کا سال شروع ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص زید کی زکات کا سال رجب میں ہوگیا اور اس وقت اس کے پاس ایک لاکھ روپے تھے، اور اس نے جب رمضان میں زکات دی، تو اس وقت اس کے پاس صرف اسی ہزار روپے ہی رہے، تو یہ شخص رمضان میں اسی ہزار روپے کی زکات دیتا ہے؛ حالاں کہ اس کو رجب کے لحاظ سے ایک لاکھ کی زکات دینی واجب تھی۔ لہذا یہ حساب کی غلطی ہے، اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

☐ غیر مصرف میں زکات خرچ کرنا

زکات کا مصرف شرعی میں خرچ کرنا بھی لازم ہے جیسا کہ تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے، لیکن اس میں بھی لوگ بڑی غلطیاں کرتے ہیں، مثلاً:

★ بعض لوگ اپنے پیروں اور مشائخ کو زکات دیتے ہیں، جب کہ وہ محتاج نہیں ہوتے۔

★ بعض مساجد کے ائمہ ومؤذنین کی تنخواہوں میں زکات دے دیتے ہیں؛ حالاں کہ کسی کام کے عوض میں زکات نہیں دی جاسکتی۔ ہاں! امام یا مؤذن صاحب نصاب نہ ہو تو تنخواہ کے علاوہ زکات ان کو دی جاسکتی ہے۔

★ ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ مدارس میں زکات دیتے وقت ذمے دار مدرسے یا مہتمم کو اس کی اطلاع نہیں کی جاتی کہ یہ رقم زکات کی مد کی ہے، اس لیے اہل مدرسہ ان کو کبھی تعمیر یا اساتذہ کی تنخواہوں وغیرہ غیر مصارف زکات میں خرچ کر دیتے ہیں۔ اس لیے زکات دینے والوں کو چاہیے کہ اہل مدرسے کو اس کی اطلاع کر دینا چاہیے کہ یہ رقم زکات کی ہے؛ تا کہ وہ اس رقم کو مصرف زکات میں خرچ کریں۔

★ بعض لوگ مسجد کی تعمیر یا مسجد کی ضروریات میں یا اور کسی دینی ضرورت میں زکات خرچ کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ زکات کسی بھی دینی وشرعی کاموں اور ضرورتوں میں خرچ کی جاسکتی ہے، بل کہ بعض کو اس سلسلے میں ٹوکا جاتا ہے، تب بھی وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے کہ ہم اللہ کے راستے میں کسی بھی جگہ خرچ کر دیں؛ مگر یہ بات تفصیلی طور پر گزر گئی کہ ہر دینی کام میں زکات نہیں خرچ کی جاسکتی، بل کہ اس کے مصارف متعین ومقرر ہیں، لہذا یہ بڑی غلطی ہے کہ زکات غیر مصرف میں خرچ کی جائے۔

★ ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ زکات کی رقومات سے کھانا پکا کر فقراء و مسکین کو کھلا دیتے ہیں، فقراء ومساکین کو کھانا کھلانا اگرچہ بہت بڑی نیکی ہے، مگر اس طرح کھلا دینے سے زکات ادا نہیں ہوتی، کیوں کہ یہاں یہ زکات کی رقم ان فقراء کو تملیک نہیں کی گئی یعنی ان کو اس کا مالک نہیں بنایا گیا، اور زکات میں تملیک ضروری ہے، اس لیے کھانا کھلانے کے بجائے فقراء کو خود کھانا ہی دے دینا چاہیے اور سب سے بہتر تو رقم دے دینا ہے۔

★ بعض لوگ اپنے کسی رشتے دار کی یا پڑوسی وغیرہ کی شادی کے لیے زکات خرچ کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اپنی زکات کی رقم نکال کر شادی میں شریک ہونے والوں کو کھانا کھلا دیتے ہیں یا اور اسی طرح کی کوئی ذمے داری لیتے اور اس میں خرچ کر دیتے ہیں۔ یہ

بھی ایک بڑی کوتاہی ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں تملیک نہیں پائی گئی اور زکات میں تملیک کا پایا جانا لازم ہے، جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے۔لہذا اس صورت میں زکات دینے والے کی زکات ادا نہیں ہوئی۔

★ اسی طرح بعض پڑھے لکھے لوگوں میں یہ تصور ہے کہ زکات کی رقم سے طلبہ کو اعلی تعلیم دلانا چاہیے، اور گراجوویٹ، انجینئر، ڈاکٹر، لائر، وغیرہ کی تعلیم کے لیے زکات سے ان کو اسکالرشپ دینی چاہیے اور ان کو اس راہ میں آگے بڑھانا چاہیے۔

جہاں تک یہ خیال ہے کہ مسلمان طلبہ کو ان تمام شعبوں میں آگے بڑھانا چاہیے اور اس کی فکر کی جانی چاہیے، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ خیال اچھا ہے؛ مگر اس کو زکات ہی کی مد سے پورا کرنے پر اصرار اور اس کو زکات کا مصرف سمجھنا صحیح نہیں۔

یہاں غلطی یہ ہوتی ہے کہ مستحق زکات ہونے یا نہ ہونے کا خیال نہیں رکھا جاتا؛ ہاں! اگر یہ طلبہ واقعی مستحق زکات ہیں اور اپنی تعلیمی ضروریات میں خرچ کرنے کے لیے ان کو زکات دی جائے، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ جائز و درست ہے؛ لیکن عموماً یہ ہوتا ہے کہ ان طلبہ کو اسکالرشپ دے دی جاتی ہے، جن کے پاس پہلے سے لاکھوں روپے موجود ہوتے ہیں، صرف مزید ڈونیشن یا بھاری بھاری فیس بھرنے کے لیے ان کو بڑی بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے؛ حالاں کہ زکات کا مصرف غرباء وفقراء ہیں اور زکات کی مشروعیت کا اصلی مقصد انسانوں کی بنیادی ضروریات کو پوری کرنا ہے، جس کو یہ لوگ فراموش کر جاتے ہیں۔

اس طرزِ فکر وعمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو غربت ومحتاجی کی وجہ سے بنیادی ضروریات کھانا، پانی، کپڑا وغیرہ تک سے محروم ہوتے ہیں، ان کو استحقاق کے باوجود زکات نہیں ملتی اور غیر مستحق لوگ اپنی اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے زکات وصول کر جاتے ہیں، جو مقصد شریعت کے خلاف ہے۔

لہذا جو لوگ طلبہ کو اعلی تعلیم دلانا چاہتے ہیں، وہ غرباء وفقراء کے حق (زکات) سے دینے کے بجائے، اپنی جیب سے عطیہ جات نکال کر خرچ کریں اور یہ ان حضرات کے

لیے بڑے ثواب کا باعث ہوگا۔

مستحقِ زکات کو تلاش نہ کرنا

ایک غلطی اس سلسلے میں یہ ہوتی ہے کہ لوگ زکات کا مستحق کون ہے؟ اس کی تحقیق و تلاش کیے بغیر جو ملے یا جو مانگے، اس کو زکات دے دیتے ہیں اور خود کو سبکدوش سمجھ لیتے ہیں؛ مگر یہ بات صحیح نہیں؛ بل کہ زکات دینے والے کی ذمے داری ہے کہ وہ مستحقین کی تحقیق و تلاش کرے اور مستحقین تک اس کو پہنچائے۔ اسی لیے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر تحقیق و تلاش کے بغیر کسی کو زکات دے دی اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ مستحق نہیں تھا، تو زکات ادا نہیں ہوگی، اس کے برخلاف اگر تحقیق و تلاش کے بعد کسی کو زکات دی اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ مستحق نہیں تھا، تو زکات ادا ہوگئی۔ یہ مسئلہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک کسی مال دار اور غیر مستحق زکات کو غلطی سے زکات دینے سے اس وقت ادا ہو جاتی ہے جب کہ دینے والے نے غور و فکر کیا ہو، تحقیق کی ہو، ورنہ ادا نہیں ہوتی۔ لہذا زکات دینے والوں کو چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں اپنی بساط بھر کوشش کر کے مستحق تک زکات کو پہنچائیں۔

اسی طرح بعض لوگ مدرسے کے سفراء کو زکات دیتے ہیں، جب کہ دینے والا ان کو جانتا ہی نہیں کہ کون ہیں اور کیسے ہیں؟ لہذا یہاں بھی پہلے تحقیق کر لینا چاہیے کہ قابل اعتماد لوگ ہیں یا نہیں؟ اس کے لیے مثلاً ان کی تصدیقات وغیرہ جو ان کے علاقے کے معتبر علماء نے دی ہو، یا کسی معتبر ادارے نے جاری کی ہو، اس کو دیکھ کر اطمینان کر کے پھر ان کو زکات دینا چاہیے۔ ورنہ اگر خدانخواستہ کسی غلط جگہ زکات پہنچ گئی اور ہم نے تحقیق ہی نہیں کی تھی، تو زکات خطرے میں ہے۔

زکات نکال کر خود اپنے پاس رکھے رہنا

بعض لوگ زکات کی رقم نکال کر مستحقین کو دینے کے بجائے کسی وجہ سے اپنے ہی

پاس جمع رکھتے ہیں، مثلاً کسی کی شادی میں دینے کے لیے یا کسی خاص مقصد کے تحت کسی مستحق کو دینے کے لیے اپنے ہی پاس رکھ لیتے ہیں، یہ بھی ایک کوتاہی ہے؛ کیوں کہ جب تک وہ رقم مستحق کو نہیں دی جاتی اور اس کو اس کا مالک نہیں بنادیا جاتا، اس وقت تک زکات ادا ہی نہیں ہوتی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے زکات ہی نہ نکالی ہو۔

اس لیے زکات کی رقم نکال کر جلد سے جلد مستحق تک پہنچادینا چاہیے اور اس انتظار میں نہیں رہنا چاہیے کہ فلاں کام کے لیے بعد میں مستحق کو دیں گے؛ بل کہ جس کو دینے کا ارادہ ہو، اس کو ابھی دے دیا جائے اور وہ خود اس کو جمع کر کے اپنی ضرورت میں بعد میں خرچ کر لے۔

☐ زکات سے دنیوی اغراض کا حصول

ایک کوتاہی بعض لوگ یہ کرتے ہیں اور خاص طور پر دکان دار اور تاجر پیشہ لوگ جن کے یہاں نوکر لوگ دکانوں یا مکانوں میں کام کے لیے رکھے جاتے ہیں کہ وہ ان کو زکات دے کر ان سے کچھ اپنے کام بنانے کی یا زیادہ کام لینے کی کوشش کرتے ہیں، گویا زکات دینے کا مقصد ان نوکروں سے اپنے کام نکالنا ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اس طرح کرنا کسی کو زکات دے کر اس سے اپنی دنیوی اغراض نکالنے کے برابر ہے، جو کہ اخلاص کے خلاف ہے۔

حضرت تھانوی۔ؒ۔ فرماتے ہیں کہ

> ”ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض آدمی زکات سے دنیوی اغراض نکالنا چاہتے ہیں، جو کہ خلوص کے خلاف ہے۔ مثلاً اپنے نوکروں کو زکات اس خیال سے دیتے ہیں کہ یہ ہم سے زیادہ دبیں گے اور کام خوب کریں اور اس میں کمی ہونے سے ان کو شکایت ہوتی ہے کہ دیکھو یہ لوگ کیسے ہیں کہ اس کا اثر نہیں مانا؛ بل کہ بعض لوگ زبان سے بھی جتلانے لگتے ہیں

.... گو ضابطے سے یہ زکات ساقط ہوجاتی ، لیکن حدیث کی رو سے یہ زکات مقبول نہیں ہوتی۔ (۱)

لہذا زکات دینے والوں کو چاہیے کہ وہ زکات محض اللہ کی خوش نودی کے لیے دیں اور کسی دنیوی مقصد کو اس میں شامل نہ کریں۔

زکات میں گھٹیا چیز دینا

زکات وصدقات میں اللہ کے نام سے عمدہ چیز کا دینا افضل ہے اور اگر عمدہ نہ دی جائے ، بل کہ معمولی چیز دی جائے ،تو بھی مضائقہ نہیں، جب کہ وہ چیز قابل استعمال ہو،مگر ردی وگھٹیا چیز کا زکات میں دینا جائز نہیں ہے۔اس پر ہم نے اوپر تفصیل سے روشنی ڈال دی ہے۔

مگر اس میں بھی بہت سے لوگ کوتاہی وغفلت برتتے ہیں اور زکات وصدقات میں ایسی چیز دیتے ہیں، جو ردی گھٹیا، بل کہ نا قابل استعمال ہوتی ہے،حتی کہ دیکھنے میں آیا کہ بعض مال دار لوگ فقراء کو کپڑے دیتے ہیں جو کسی کام کے نہیں ہوتے ،بل کہ ایک دفعہ ان کو پانی میں ڈال دیا جائے ،تو پھر دوبارہ پہننے کے لائق نہیں رہتے ،ایسی چیزیں زکات میں دینا نہایت مذموم ومکروہ حرکت ہے،ایک تو اللہ کے نام پر ایسی چیز کا دینا حق اللہ میں کوتاہی ہے تو دوسری جانب فقراء وغرباء کی حق تلفی بھی ہے؛ کیوں کہ جب وہ اس کو استعمال ہی نہیں کر سکتے ،تو دینے سے ان کو کیا نفع ہوا؟ اور جو مال ان کو زکات کا ضرورت کے لیے جانا تھا، وہ گویا ان کو ملا ہی نہیں،تو یہ ایک درجے میں ان کی حق تلفی میں داخل ہے، جب کہ حکم حق داروں تک ان کا حق پہنچانے کا دیا گیا ہے۔

لہذا اللہ کے نام سے دی جانے والی چیز عمدہ نہیں،تو کم از کم ایسی ہونی چاہیے جو گھٹیا نہ ہو اور قابل استعمال ولائق استفادہ ہو۔

---

(۱) اصلاح انقلاب امت:۱/۱۵۱

مستحق نہ ہونے کے باوجود زکات وصول کرنا

اس سلسلے میں ایک کوتاہی بعض ان لوگوں سے سرزد ہوتی ہے، جو زکات کی رقم وصول کرتے ہیں، وہ یہ کہ مستحق نہ ہونے کے باوجود اور خود صاحب نصاب ہوتے ہوئے زکات کی رقم خود کو مستحق بتا کر وصول کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ حدیث میں ایسے لوگوں کے لیے وعید وارد ہوئی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود –رضی اللہ عنہ– سے مروی ہے کہ رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے فرمایا کہ:

> ''جو شخص لوگوں سے سوال کرتا ہے، جب کہ اس کے پاس اتنا مال موجود ہے، جو اس کو مستغنی کر دیتا ہے، تو اس کا یہ مانگنا قیامت کے دن اس کے چہرے پر خراش کی شکل میں ہوگا''۔ (۱)

اور حضرت حبشی بن جنادہ –رضی اللہ عنہ– سے مروی ہے کہ رسول اللہ –صلی اللہ علیہ وسلم– نے فرمایا کہ:

> ''بے شک مانگنا جائز نہیں مال دار کے لیے اور نہ طاقت ور و تندرست کے لیے، مگر ایسی ضرورت کی وجہ سے جو خاک نشین بنا دے اور گھبراہٹ میں ڈال دے اور جس نے لوگوں سے سوال کیا؛ تا کہ اس سے اپنا مال بڑھائے، تو وہ مانگنا قیامت کے دن اس کے چہرے پر خراشیں بن کر آئے گا یا جہنم کا گرم پتھر بن جائے گا جسے وہ کھائے گا، پس جو چاہے، وہ اس میں کمی کرے اور جو چاہے، اس میں زیادتی کرے۔ (۲)

الغرض محض مال بڑھانے کے لیے خود کے پاس مال ہوتے ہوئے مانگنا جائز نہیں

(۱) الترمذي:۶۵۰، أبو داود:۱۶۲۶، الدارمي:۱۶۸۰، أبو داود الطيالسي :۳۲۰

(۲) الترمذي:۶۵۳، شرح السنة:۱۶۲۳

اور یہ سخت وعید کا باعث ہے، جیسا کہ احادیث میں مصرح ہے۔

اس کے علاوہ یہ طرز عمل اپنے اندر متعدد برائیاں اور مفاسد رکھتا ہے، جس سے اس کی برائی وقباحت میں اور شدت آجاتی ہے:

(۱) ایک قباحت و برائی اس میں یہ ہے کہ خود کو لوگوں کے سامنے فقیر ظاہر کر کے اللہ تعالی کی ایک عظیم نعمت (مال داری) کو چھپانا لازم آتا ہے جو غلط و ممنوع ہے:

ایک صحیح حدیث میں آیا ہے، حضرت ابورجاء -رضی اللہ عنہ- کہتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم -صلی اللہ علیہ وسلم- نے فرمایا کہ:

"جس کو اللہ تعالی نعمت سے نوازتے ہیں، تو یہ چاہتے ہیں کہ اس بندے پر اس نعمت کا اثر ظاہر ہو۔" (۱)

ایک اور حدیث صحیح میں ہے کہ حضرت ابوالاحوص کے والد مالک -رضی اللہ عنہ- نے کہا کہ:

"میں ایک بار حضرت رسول کریم -صلی اللہ علیہ وسلم- کی خدمت میں معمولی سے کپڑوں میں حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس مال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں ہے۔ آپ -صلی اللہ علیہ وسلم- نے پوچھا کہ کس قسم کا مال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہمہ قسم کا مال ہے، اونٹ، گائے، گھوڑے، غلام، سب اللہ تعالی نے مجھے عطا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالی تمہیں مال دیں تو اس کی نعمت کا اثر بھی تم پر ظاہر و نمایاں ہونا چاہیے۔ (۲)

معلوم ہوا کہ اگر اللہ نے کسی کو مال دار بنایا ہے تو اس کو ظاہر کرنا چاہیے، نہ یہ کہ خود کو فقیر ظاہر کر کے اللہ کی نعمت کو چھپائے۔

---

(۱) أحمد : ۱۹۹۳۴، المعجم الكبير : ۲۸۱،

(۲) أحمد : ۱۷۲۳۱، أبو داؤد: ۴۰۶۳، المعجم الكبير: ۶۱۷

(۲) دوسری قباحت یہ ہے کہ اس منحوس عمل کے ذریعے سے حرام مال وصول کرنا اور اس کو کھانا لازم آیا، جس کی حرمت وقباحت میں کیا کلام ہے؟ کسب حرام بھی حرام ہے اور پھر حرام کا کھانا اور استعمال کرنا بھی حرام ہے۔

(۳) تیسری قباحت یہ ہے کہ اس منحوس عمل کی وجہ سے زکات کے اصل مستحق لوگوں کا حصہ مارا جاتا ہے، اور ان کا حصہ ہڑپ کرنے کا گناہ لازم آتا ہے۔

اس لیے اس قسم کی حرکات سے ہر مسلمان کو احتراز واحتیاط کرنا چاہیے، تاکہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ کی رسوائیوں سے بچ سکے۔

□ اپنا سید ہونا چھپا کر زکات وصول کرنا

یہ مسئلہ پہلے گزر چکا ہے کہ سیدوں کے لیے زکات کا مال حرام ہے اور یہ بھی کہ ان لوگوں کے لیے زکات کا حرام ہونا دراصل ان کی فضیلت وعظمت کی بنا پر ہے، جو انھیں قرابت رسول –صلی اللہ علیہ وسلم– کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔

مگر اس کے باوجود بھی بعض سیدوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنا سید ہونا چھپا کر زکات وصول کرتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ یہ حضرات اپنی محتاجی وفقر کی وجہ سے مجبوراً ایسا کرتے ہیں؛ مگر خود کی شناخت کو چھپانا اور زکات کا وصول کرنا درست نہیں ہے؛ اس میں ایک تو اتنی بڑی فضیلت کو چھپانے کی برائی ہے، جب کہ یہ تو ظاہر کرنے کی چیز تھی، دوسرے جو چیز ان کے لیے حرام ہے، اس کو وصول کرنا اور اپنے استعمال میں لانا بھی ایک بری بات ہے جو مخفی نہیں۔

لہذا یہ بات درست نہیں کہ اپنے سید ہونے کو چھپا کر زکات وصول کی جائے اور اسے اپنے خرچ میں لایا جائے، اس سے احتراز واحتیاط کرنا چاہیے۔



المصادر والمراجع

١	الجامع الصحيح للبخاري،ت: أبو صهيب الكرمي. بيت الأفكار الدولية
٢	الجامع الصحيح لمسلم ، ت: أبو صهيب الكرمي. بيت الأفكار الدولية
٣	سنن الإمام الترمذي، ت:شعيب الأرناؤط . دار الرسالة العالمية
٤	سنن أبي داود، ت: شعيب الأرناؤط . دار الرسالة العالمية
٥	سنن ابن ماجة، ت:شعيب الأرناؤط.دار الرسالة العالمية
٦	شرح معاني الآثار للإمام الطحاوي، ت:محمد النجار،محمد جاد الحق . عالم الكتب
٧	سنن الدارقطني،ت:شعيب الأرناؤط وزملاؤه . مؤسسة الرسالة
٨	سنن الدارمي ت:حسين سليم أسد الداراني. دارالمغني للنشر والتوزيع
٩	مسند الحميدي، ت: حبيب الرحمن الأعظمي.عالم الكتب ، بيروت
١٠	مسند الإمام أحمد : ت: شعيب الأرناؤط ، مؤسسة الرسالة
١١	المصنف لابن أبي شيبة ، ت: محمد عوامة .شركة دار القبلة
١٢	مسند أبي داود الطيالسي،ت:محمد بن عبد المحسن التركي . دار هجر للطباعة والنشر
١٣	ا لأصل للإما م محمد الشيباني ،ت:د،محمود بوينو كالن .وزارة الأوقاف ، قطر
١٤	التلخيص الحبير لابن حجر،ت: محمد الثاني.أضواء السلف

١٥	الرسالة للإمام الشافعي، ت: أحمد محمد شاكر .دار الكتب العلمية
١٦	الاستذكار لابن عبد البر،ت: عبد المعطي أمين قلعجي . دار الوعي، حلب
١٧	البحر الرائق للنسفي،ت : زكريا عميرات. دار الكتب العلمية
١٨	بدائع الصنائع للكاساني،ت:علي محمد معوض،عادل أحمد عبد الموجود.دار الكتب العلمية
١٩	الهداية للمرغيناني،ت: نعيم أشرف نورأحمد. إدارة القرآن كراتشي
٢٠	رد المحتار على الدر المختار للشامي، ت:عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض.دار عالم الكتب
٢١	الفتاوى الهندية ،ت:عبد اللطيف حسن عبد الرحمن . دار الكتب العلمية
٢٢	الفتاوى التاتارخانية ،ت:شبير أحمد القاسمي. مكتبة زكريا،ديوبند
٢٣	المبسوط للسرخسي،ت: جمع من أفاضل العلماء. دار المعرفة بيروت
٢٤	النهر الفائق لابن نجيم ، ت:أحمد عزو عناية . دار الكتب العلمية
٢٥	درر الحكام في شرح غرر الأحكام. مطبعة أحمد كامل
٢٦	حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ،ت: محمد عبد العزيز الخالدي. دار الكتب العلمية
٢٧	الاختيار لتعليل المختارللموصلي،ت:محمود أبودقيقة . دار الكتب العلمية
٢٨	مختصر القدوري،ت:كامل محمد محمد عويضة. دار الكتب العلمية
٢٩	الجوهرة النيرة لابن الحداد الزبيدى، ت: إلياس قبلان. دار الكتب العلمية
٣٠	المحيط البرهاني،ت:عبد الكريم سامي الجندي. دار الكتب العلمية
٣١	تحفة الفقهاء للسمرقندي. دار الكتب العلمية
٣٢	الكافي في فقه أهل المدينة لابن عبد البر.دا رالكتب العلمية

٣٣	الكافي لابن قدامة ، ت:عبد الله بن عبد المحسن التركي.دار هجر
٣٤	كتاب الأم للشافعي ، ت: رِفعت فوزي.دار الوفاء
٣٥	مجمع الأنهر،ت:خليل عمران المنصور. دار الكتب العلمية
٣٦	بداية المبتدي للمرغيناني. مطبعة الفتوح
٣٧	فتح القدير لابن الهمام ، ت: عبد الرزاق غالب المهديِ. دار الكتب العلمية
٣٨	حاشية الطحطاوي على الدر المختار،ت:أحمد فريد المزيدي.دار الكتب العلمية
٣٩	البناية في شرح الهداية للعيني،ت:محمد عمر الرامفوري. دار الفكر للطباعةوالنشر
٤٠	بلغة السالك لأقرب المسالك لأحمد الصاوي،ت:محمد عبد السلام شاهين. دار الكتب العلمية
٤١	المجموع شرح المهذب للنووي،ت:محمد نجيب المطيعي.مكتبة الإرشاد ،جدة
٤٢	المهذب للشيرازي، ت :محمد الزحيلي. دار القلم
٤٣	شرح الخرشي على مختصر الخليل.المطبعة الكبرى الأميرية ببولاق،مصر
٤٤	حاشية الدسوقي على الشرح الكبير.دارإحياء الكتب العربية
٤٥	المبدع شرح المقنع ،ت:محمد حسن.دار الكتب العلمية
٤٦	المغني لابن قدامة ،ت:عبدالله بن عبد المحسن ،عبد الفتاح محمد حلو.دار عالم الكتب

٤٧	كشاف القناع عن متن الإقناع،ت:محمدأمين الضناوي.عالم الكتب
٤٨	الإشراف على مذاهب العلماء لابن المنذر،ت:أبو حماد الأنصاري. دار المدينة للطباعة والنشر
٤٩	الإجماع لابن المنذر، ت: أبوحماد صغير أحمد.مكتبة الفرقان عجمان
٥٠	أسباب نزول القرآن للواحدي،ت:كمال بسيوني زغلول .دار الكتب العلمية
٥١	موسوعة الفقه الإسلامي والقضايا المعاصرة للدكتور وهبة الزحيلي. دار الفكر دمشق
٥٢	فقه الزكا ة، ليوسف القرضاوي.مؤسسة الرسالة
٥٣	الأسهم والسندات وأحكامهافي الفقه الإسلامي،لأحمد بن محمد الخليل .دار ابن الجوزي
٥٤	المعاملات المالية المعاصرة في الفقه الإسلامي،محمد عثمان بشير.دار النفائس
٥٥	حكم ودائع البنوك وشهادات الاستثمار،د : علي أحمد السالوس. مكتبة دار القرآن
٥٦	مجلة الفقه الإسلامي.
٥٧	القوانين الفقهية لابن جُزي.
٥٨	الفقه على المذاهب الأربعة لعبد الرحمن الجزري . دار الكتب العلمية
٥٩	التنبيه على مبادئ التوجيه، ت: محمد بلحسان.دار ابن حزم
٦٠	التنبيه على مبادئ التوجيه، ت: محمد بلحسان.دار ابن حزم
٦١	التوضيح في شرح مختصر ابن الحاجب،ت: أبو الفضل الدمياطي.دار ابن حزم

٦٢	التبصرة للإمام اللخمي ،ت:أحمد عبد الكريم نجيب .وزارة الأوقاف ، قطر
٦٣	عقود الجواهر الثمينة في مذهب عالم المدينة ،ت: محمد أبو الأجفان ، عبد الحفيظ منصور.دار الغرب الإسلامي
٦٤	احياء العلوم ، للإمام محمد الغزالي ،
٦٥	منهاج القاصدين ، للإمام ابن الجوزى ، طبع دمشق
٦٦	بیان القرآن:ازحکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
٦٧	معارف القرآن،ازمولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ،مکتبہ معارف القرآن،کراچی ۔
٦٨	امدادالفتاوی:ازحکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ،طبع پاکستان
٦٩	اصلاح انقلاب امت،ازحضرت مولانا اشرف علی تھانوی،ادارۃ المعارف،کراچی
٧٠	کفایۃ المفتی :ازمفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ،دارالاشاعت،کراچی
٧١	فتاوی دارالعلوم دیوبند:مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحبؒ،طبع دیوبند
٧٢	فتاوی محمودیہ:ازمولانا مفتی محمودحسن گنگوہی ،ت:مولانا سلیم اللہ خان صاحب، طبع پاکستان
٧٣	امدادالاحکام:ازمولانا ظفراحمد عثمانی،زکریا بک ڈپو،دیوبند
٧٤	احسن الفتاوی:مفتی رشیداحمد صاحبؒ،ایچ،یم،سعید کمپنی،کراچی
٧٥	فتاوی حقانیہ:ازمولانا عبدالحق صاحب وغیرہ،دارالعلوم حقانیہ،اکوڑہ،خٹک
٧٦	فتاوی قاسمیہ:ازمولانا مفتی شبیراحمد القاسمی،مکتبہ اشرفیہ،دیوبند۔
٧٧	تحفۃ الالمعی :ازمولانا مفتی سعیداحمد پالن پوریؒ،زمزم پبلشرز،اردوبازار،کراچی
٧٨	کتاب الفتاوی:ازمولانا خالدسیف اللہ رحمانی،کتب خانہ نعیمیہ،دیوبند
٧٩	فقہی مقالات:ازمولانا مفتی تقی عثمانی،زمزم بک ڈپو،دیوبند